’’چہارسُو‘‘

...... خواب دیکھانہ کرو ......

اس شعری مجموعے میں غزلوں کے ساتھ آزاد نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں،غزل سے میری وابستگی پہلی محبت ہے،غزل کے بارے میں میری یہی رائے ہے کہ اس کا ہر شعر تہہ در تہہ معانی کا خزینہ اور شاعر کے باطن میں چھپی دنیا کا عکسِ جمیل ہے،غزل میں رسیلا پن اور معنوی اعتبار سے انسان کے ذوقِ جمال کا لطیف ترین اظہار کسی دوسری صنف شاعری میں ممکن نہیں،اردو غزل زندگی کے تمام پہلوؤں،تمام رنگوں اور امنگوں کی ترجمانی کرنے کا مکمل ادراک رکھتی ہے اور اسے ہر نوع کے معاملات،مشاہدات اور تجربات کے اظہار نے فکری بلوغت سے ہمکنار کیا ہے۔وہ نظریات،عقائد اور افکار کی ترسیل میں کامیاب ہونے والی صنفِ سخن ہے۔اسے ہر جگہ پذیرائی حاصل ہے،وہ خانقاہ ہو،مسجد ہو،امام بارگاہ ہو اس کے داخلے پر کوئی پابندی نہیں۔وہ حقائق اور شعری صداقت کے حسین امتزاج کی آئینہ گر ہے،اس کی رومانوی فضا اور نرم لہجہ اس کی پہچان ہے۔''خواب دیکھانہ کرو'' میں زندگی آمیز تجربوں سے کشید کی گئی فکر کو منفرد پیرایۂ اظہار سے معتبر بنانے کی مقدور بھر کوشش کی گئی ہے۔

...... حسن عسکری کاظمی

قیمت:۳۰۰ روپے،دستیابی:اظہار سنز،اردو بازار،لاہور۔

...... بےقراری سی بےقراری ہے ......

عزیز جبران انصاری کے افسانے پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے افسانوں میں یہ دونوں خصوصیات موجود ہیں یعنی یہ Readerly بھی ہیں اور Writerly بھی۔ان کے افسانے طرزِ تحریر اور اسلوب کی بنا پر قبولیتِ عام کی صلاحیت رکھتے ہیں اور موضوعات کے انتخاب اور افسانے کے تکنیکی برتاؤ کے حوالے سے زندگی سے جڑے ہوئے اور بصیرت افروز بھی ہیں۔

قبولیت عام کی صلاحیت یوں ہے کہ ان افسانوں میں دلچسپی کے عناصر بھرپور ہیں۔ایک تجسس سا ہوتا ہے جس میں قاری محور ہتا ہے لیکن یہ افسانے سرسری طور پر پڑھے جانے والی تحریریں بھی نہیں ہیں کیوں کہ ان میں تفکر بھی ہے اور بصیرت کے اجزا بھی موجود ہیں۔ٹائٹل کہانی ''بے قراری سی بےقراری ہے'' کو ہی لے لیجیے اور مکالمے کہ یہ جملے ملاحظہ کیجیے:

> ''اگر تم واقعی ادب سے سنجیدہ ہو اور کچھ کرنا چاہتے ہو تو اپنے ماضی سے تعلق ہرگز نہ توڑنا۔بےشک اپنے ہم عصروں کو نہ پڑھیں لیکن اپنے کلاسیکل شعر و ادب کا مطالعہ ضرور کریں۔''

......اے خیام

اشاعت:۲۰۱۷ء،قیمت:۴۰۰ روپے،دستیابی:جبران اشاعت گھر،اردو بازار،کراچی۔

...... یادوں کے بھنور ......

ریاض ندیم نیازی ایک متحرک اور ہمہ جہت تخلیق کار ہے۔اُس کی تخلیقی قلم رو میں غزل،نظم،نعت اور قطعہ نگاری شامل ہے لیکن بہ طورِ خاص نعت اور غزل میں ریاض ندیم نیازی نے ایک مقام پیدا کیا ہے۔جہاں تک اس کی نعت نگاری کا تعلق ہے اس کی نعت عشقِ رسولؐ سے لب ریز ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ نعت بڑی احتیاط کا کام ہے اس احتیاط کو ندیم نیازی نے ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور نعت نگاری کی دنیا میں ایک الگ پہچان بنائی ہے۔جہاں تک ریاض ندیم نیازی کی غزل کا تعلق ہے،غزل روایت سے جڑی ہوئی ہے لیکن اُس طرح نہیں جڑی ہوئی جیسے روایت پرست غزل گوؤں کی غزل جڑی ہوتی ہے بلکہ اس نے غزل سے رابطہ قائم رکھتے ہوئے نئے زمانے سے اپنی غزل کو ہم آہنگ کیا ہے اور ایک تازہ کاری کا ثبوت دیا ہے۔ریاض ندیم نیازی کا سفر جاری ہے میں سمجھتا ہوں جس تن دہی سے وہ اپنا تخلیقی کام کر رہے ہیں وہ دن دور نہیں جب وہ پاکستان کے صفِ اوّل کے شعرا میں نظر آئیں گے۔

......عباس تابش

اشاعت:۲۰۱۷ء،قیمت:۴۰۰ روپے،دستیابی:رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،کمیٹی چوک،راولپنڈی۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۶،شمارہ:جولائی،اگست ۲۰۱۷ء

رابطہ:537/D-1 ،گلی نمبر18،ویسٹریج-III ،راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:(+92)-51-8730633-8730433

موبائل:(+92)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازارراولپنڈی

متاعِ چہارسو

☆

قرطاس اعزاز

بعض ایسے بھی خانوادے ہیں
جو بہت ہی حرام زادے ہیں

جب ملو گے تو عید کر لیں گے
چاند کب بام پر نہیں آتا

شوؔق معیارِ زندگی مت پوچھ
جانور آدمی سے بہتر ہے

جیب کی حالت سے ڈر جاتا ہوں
بچے سوتے ہیں تو گھر جاتا ہوں

شرافت کے نقابوں کو ہٹا دو!
کہ مجرم کا پتا چلتا نہیں ہے

اجرت بڑھا صدقہ نہ دے
حق دے مجھے کاسہ نہ دے

باعثِ زیبِ خامشی ہیں شوؔق
زیرِ لب باوقار شکوے ہیں

جرأت اظہار سے سرشار ہونے تک
ظلم قائم ہے فقط بیدار ہونے تک

اس نگر کے اہلِ ثروت
بے ضمیروں کے خدا ہیں

لازم نہیں تعبیر ہو
ہر خواب کو درجہ نہ دے

اس گھٹن میں فرد کیسے جی رہا ہے
یہ کرشمہ تو خدا ہی جانتا ہے

تُو وقت کا فرعون ہے
تجھ کو زمیں پردہ نہ دے

جب ملا شوؔق کھا لیا
خاک وقتِ طعام ہے

پی کے لہو پلنے کا عادی کون ہے
تجھ سے بڑا آتنک وادی کون ہے

رنج کے طاق میں شبِ ہجراں
ہم مثالِ چراغ جلتے ہیں

غلامی سے نکل کر ان غلاموں نے
غلاموں کی نئی منڈی بنا لی ہے

شوق انصاری کے نام

''صبر کی انتہا''

شوق انصاری

اس عاجز جسے احباب شوق انصاری کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں کا اصل نام شوکت علی ہے۔شوقؔ تخلص جو میرے استاد حضرت عبد الستار مفتی کی دین ہے۔ میں خاندانِ انصاری میں مورخہ ۱۱۔اگست ۱۹۵۸ء کو بمقام سمندری تحصیل وضلع فیصل آباد میں پیدا ہوا۔

میں جب تیسری کلاس میں پڑھتا تھا تو اردو کی کتاب میں اسماعیل میرٹھی کی نظمیں دیکھ کر مجھے اشعار کہنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔شعر کہنے کی کوشش کے باوجود جب میں شعر نہ کہہ پاتا تو خود پر افسوس ہوتا۔ساتویں جماعت تک اسی تذبذب میں مبتلا رہا اسی دوران میری والدہ کا انتقال ہو گیا جو میرے لیے ناقابلِ تلافی صدمہ تھا چونکہ میں اپنی ماں کا انتہائی لاڈلا تھا جو میری چھوٹی سے چھوٹی خواہش کا بھی خیال کرتی تھیں ماں کے بعد بے شمار محرومیاں دامن گیر ہوتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔

تقریباً دوسال بعد والدِ محترم نے دوسری شادی کر لی جس سے میرا تعلیمی دورانیہ مشکلات کا شکار ہونا شروع ہوا آخر کار فرسٹ ائیر میں ہی کالج کو خیر آباد کہنا پڑا۔

میں جب آٹھویں کلاس میں تھا تو میرے ایک دوست حامد نثار چشتی نے میری ملاقات میری ہی تحصیل میں رہائش پذیر استاد شاعر حضرتِ عبد الستار مفتی سے کروائی جو کہ حضرتِ ساغر صدیقی کے شاگردِ خاص تھے۔انہوں نے شاعری میں میرا اشتیاق دیکھ کر مجھے شاگردی کے شرف سے نوازا اور میری مشق کی بنیاد عروض پر رکھی۔ مجھے فنِ شاعری میں کمال تک پہنچایا اور شاعری میں میری انتہائی دلچسپی کو دیکھ کر مجھے ''شوق'' کا تخلص دیا اس بنا پر میں ''شوق انصاری'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔

اپنی والدہ کی طرف سے ہم سات بہن بھائی ہیں۔دو بہنیں مجھ سے بڑی ہیں اور ایک بہن ہم سب سے چھوٹی ہے۔ بڑی بہن کا انتقال ہو چکا ہے۔ دوسری والدہ کی طرف سے چار بھائی ہیں جن میں سب سے بڑا افیاض ہے اور وہ پنجابی کا شاعر ہے۔گاہے گاہے مجھ سے اصلاح بھی لیتا رہتا ہے اور عاجز تخلص کرتا ہے مگر میں صرف اردو کا شاعر ہوں۔

فرسٹ ائیر میں جب میں نے کالج چھوڑا تو ایک دوست (ٹیلر ماسٹر) کی مدد سے صرف ہفتوں میں ٹیلرنگ کا کام سیکھا اور پانچ سال تک ٹیلرنگ کا کام کیا۔دادا نے جب مجھے برسرِ روزگار دیکھا تو میری شادی کر دی۔قدرت نے مجھے دو بیٹے عطاء فرمائے۔بڑا بیٹا ''رضوان عاقب'' اور چھوٹا بیٹا ''محمد آصف'' رضوان عاقب تو اب صاحبِ اولاد ہے مگر محمد آصف دو ماہ کی عمر میں ہی خالقِ حقیقی سے جاملا۔تنگیٔ حالات کی بنا پر میں سر چھپانے کے لیے مکان نہ بنا سکا۔۲۰۱۰ء میں بیوی کو اپنے باپ کی طرف سے نقدی میں کچھ حصہ ملا جس سے سمن آباد،فیصل آباد میں ڈیڑھ مرلے کا مکان لیا جو میرے بیٹے کے نام ہے۔

والد کی مجبوریاں اپنی جگہ مگر تمام عمر میرے لیے دعا گو رہے۔والد بھی چونکہ شاعر تھے اس لیے انہوں نے شاعری میں میری بہت حوصلہ افزائی کی آج میں جو کچھ ہوں اُن کی دعاؤں سے ہوں۔

میں ابھی ساٹھ سال کا ہونے کو ہوں آج تک مجھے کسی ریڈیو کسی ٹی وی،آرٹ کونسل یا کسی سرکاری ادارے سے کسی بھی طرح کی کوئی پذیرائی نہیں ملی مگر ''چہارسو'' میں میرے لیے پہلا دروازہ اب آ کے کھلا ہے۔مجھے قوی امید ہے کہ محبت کا یہ دروازہ میرے لیے کامیابیوں اور کامرانیوں کے نئے دَر وا کرے گا وگرنہ اب تک تو یہ صورتِ حال تھی کہ:

ہر خوشی نابود ہو جیسے
زندگی بے سُود ہو جیسے
یوں نکلتے ہیں مرے ارماں
شمعِ گل کا دود ہو جیسے
خوف کو یوں پوجتے ہیں لوگ
ظلم ہی معبود ہو جیسے

میرا شمار خدائے ذوالجلال کی ذات پر کامل یقین رکھنے والوں میں ہوتا ہے۔میرا یقین ہے کہ جب جب جس کے نصیب میں جو لکھا ہوتا ہے وہ اُسے ضرور ملتا ہے۔میں اپنے رب کے آگے صمیمِ قلب سے صابر و شاکر ہوں اور میرے رب نے مجھے استقامت بخشی تو میں آئندہ بھی اسی راہ پر گامزن رہنا پسند کروں گا۔ مجھے کسی سے کوئی گلہ،شکوہ،شکایت یا شکر رنجی ہر گز نہ ہے بس خواہش ہے تو فقط اتنی کہ میں اور میرا قلم ہمیشہ حق وصداقت کا پرچم بلند کرتے رہیں اور ظلم و ناانصافی کے خلاف حق کی آواز بن کر ظالموں کو للکارتا رہوں۔شاید میرے یہ اشعار حق کی آواز بن کر مظلوموں کا حوصلہ بڑھاتے رہیں:

حق رسی تب ہی کارگر ہوگی
ہم اگر خودسری سے نکلیں گے
چمن کی خستہ حالی کہہ رہی ہے
چمن کا باغباں اچھا نہیں ہے
وقت کی تلخیاں بجا لیکن
آپ ہی اجتناب کرلیتے
مدتوں میں خیال پلتا ہے
شعر یکدم کبھی نہیں ہوتا

براہِ راست

ہمارے عصر میں اردو ادب سے وابستہ قریب ہر شخص مرزا اسد اللہ خاں غالب کے عشق میں کسی نہ کسی طور گرفتار دکھائی دیتا ہے۔ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ہمارا عمل مرزا محمد ابراہیم ذوق کے حواریوں سے مماثل نظر آتا ہے۔ حق اور سچ کہنے والوں کو آج بھی اُسی طرح تنگ دستی و تنگ دامنی اور تنگ سامانی کا سامنا آج بھی ہے۔ غور کیجیے اور ایمانداری سے بتلایئے کہ ہمارے اس عمل نے کتنے حقیقی تخلیق کاروں کو جیتے جی زندہ درگور کیا ہے!

شوق انصاری کی مشقِ سخن اور شعری لگن کو آپ نے کبھی لائق توجہ گردانا گر نہیں تو کیوں؟ اس لیے کہ وہ ہماری دکھتی رگ کی صحیح صحیح نباضی کر رہے ہیں، معاشرے کو آئینہ دکھا کر اُس کی بدصورتی کو نشان زد کر رہے ہیں، غریبوں کا حق مارنے والوں کو علی الاعلان للکار رہے ہیں، انعامات و اعزازات کی بندر بانٹ کا پردہ چاک کر رہے ہیں، جعلی اسناد اور جعلی عہدوں کو نشان زد کر کے مستقبل کی تاریکی کا رونا رو رہے ہیں!!

مگر یاد رکھیے روزِ حشر زیادہ دُور نہیں، آنے والا کل شوق انصاری اور اُن کی قبیل کے لوگوں کا ہوگا جس میں آج کے خودساختہ کارپردازِ ادب سوکھے پتوں کی مانند ہوا کا رزق کا بن کر نام و نشان کھو بیٹھے گے۔ شوق انصاری اور اُن کے ہم نوا ادب کی نئی تاریخ لکھیں گے جو آئینہ کی طرح صاف اور شفاف ہوگی اور کھوٹے کھرے کے درمیان واضح لکیر بھی کھینچ کر ایک نیا باب رقم کرے گی!!

گلزار جاوید

☆ اسمٰعیل میرٹھی اتنے سہل نہیں کہ کمسن بچے کی دسترس میں آجائیں۔ آپ ہمیں اس سے پہلے کی روداد سنایئے؟

☆☆ میرے کہنے کا مقصد وہ نظمیں ہیں جو اسماعیل میرٹھی سمیت مختلف شعراء نے بچوں کے لیے لکھیں اور وہ پرائمری سکول کی اردو کی کتابوں میں موجود تھیں۔

☆ کچھ تفصیل اُن اسباق کی بتلایئے جو اُستادِ محترم نے عروض کی مشق کے دوران کرائی؟

☆☆ اُستاد محترم نے لفظ یا جزِ لفظ کو تقطیع کی بنیاد رکھ کر مشق کروائی جن سے سبب اور وتد بنتے ہیں پھر ہجائے بلند اور ہجائے کوتاہ اور ساتھ ساتھ فن شاعری بھی کیونکہ فن شاعری کے بغیر انسان اچھا عروضی تو ہوسکتا ہے اچھا شاعر نہیں ہوسکتا مگر یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہے اگر انسان پیدائشی لحاظ سے باطنی شاعر ہو۔

☆ شاعری کے آغاز پر آپ کو جن مشکلات کا سامنا رہا اُن کا بیان بھی ضروری ہے؟

☆☆ شاعری کے ابتدائی دور میں خیال، بحر اور الفاظ کو ہم آہنگ کرنے میں دقت تو ہوتی ہے مگر مشق اور تجربے کے بعد یہ دقت بہت حد تک کم ہو جاتی ہے۔ میرے مطابق اگر یہ تینوں ہم آہنگ نہ ہوں تو اچھا شعر نہیں ہوسکتا بحر میں روانی اور الفاظ میں تخیل کی ترجمانی اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ بدن کے لیے مناسب لباس کا ہونا ضروری ہے۔

☆ اس رائے سے کیا نتیجہ اخذ کیا جائے کہ شوق انصاری کی شاعری کی ابتدا عجب انداز سے ہوئی؟

☆☆ اس کو عجب انداز تو نہیں کہا جاسکتا بلکہ یوں کہیے کہ جب مجھے شاعری کی تعریف کا بھی علم نہیں تھا تو شاعری کی تحریک میرے ذہن میں موجزن تھی۔

☆ عملی زندگی میں قناعت پسند حالات نے بنا دیا یا آپ مزاجاً کم خرچ بالانشین ہیں؟

☆☆ قناعت پسندی تو خیر اچھی بات ہے چاہے وہ حالات کی وجہ سے ہو یا مزاجاً ہو لیکن ہمارے ملک میں تو انسان ضروریات کو ترس جاتا ہے قناعت پسندی تو ضروریات کے بعد کی بات ہے۔

☆ سخن سازی میں کنجوسی الزام ہے یا حقیقت؟

☆☆ یہ سب احباب کی طرف سے پذیرائی ہے کہ کوئی مجھے چھوٹی بحر کا شاعر کہتا ہے تو کوئی الفاظ میں کنجوسی کا شاعر کہتا ہے بعض احباب مجھے ''تیسری دنیا کا شاعر'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور کچھ دانشور مجھے ''دلوں کو جوڑنے والا'' شاعر پکارتے ہیں جو بھی مجھے جس نظریے سے دیکھتا ہے شائد میں اُسے اُس میں پورا نظر آتا ہوں۔

☆ آپ کی سخنی زمینوں کو تنگ اور پتھریلی کیوں کہا جاتا ہے؟

☆☆ احباب میرے اشعار کی زمینوں کو اس لیے تنگ اور پتھریلی کہتے ہیں کہ ان میں سخن گوئی ذرا مشکل کام ہے مگر میرے لیے کثرتِ مشقِ سخن کے باعث ان میں اشعار کہنا اس قدر مشکل نہیں جس قدر دوست سمجھتے ہیں۔

☆ آپ کے ہاں چھوٹی بحر کا کثرت سے استعمال ارادی ہے یا اتفاقی؟

☆☆ دراصل ہمارے سلسلے میں چھوٹی سے چھوٹی بحر پر مشق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مثال کے طور پر میں اپنے دادا استاد حضرت ساغر صدیقی کا ایک قطعہ پیش کرتا ہوں جو انہوں نے ہوس پرستوں پر کہا تھا:

پیسے ملیں
کیسے ملیں
حاصل کرو
جیسے ملیں

☆ سہل ممتنع بھی آپ کا مرغوب شغل ہے؟

☆☆ سہل ممتنع کو مشغلہ تو نہیں کہا جا سکتا یہ چیز مجھے اساتذہ کی طرف سے ورثے میں ملی ہے بلکہ میری تربیت کی بنیاد میں شامل ہے۔

☆ یہ دلبرداشتہ ہو کر قلم برداشتہ شاعری کا مطلب کیا ہے؟

☆☆ ظاہر ہے حالات پر نظر رکھنے والا ایک حساس شاعر جب اپنے گردو نواح میں ظلم وستم ہوتے ہوئے دیکھے گا تو دل برداشتہ تو ہوگا اور پھر ان واقعات کو نظم کرنے کے لیے قلم برداشتہ بھی ہونا پڑے گا۔ ہوٹلوں پر جب میں نے نابالغ بچوں کو کام کرتے دیکھا تو بے ساختہ یہ خیال پیدا ہوا۔

کمسنی میں ہوٹلوں پر ہیں ملازم
جانے کِس مجبور کے نورِ نظر ہیں

☆ روایتوں کا امین ہونا تعریف ہے یا قنوطیت کی نشان دہی؟

☆☆ جو دوست مجھے روائت کی نظر سے دیکھتے ہیں وہ صریحاً غلطی پر ہیں۔ میں نیچر پر یقین رکھتا ہوں اور نیچر ہی بیان کرتا ہوں اگر کہیں کہیں نیچر اور روائت ہم آہنگ ہو تو اسے کلی طور پر روائت نہیں کہا جاسکتا۔

☆ وہ کون سے خیال ہیں جن سے آپ عبادت کی حد تک محبت کرتے ہیں؟

☆☆ ہر وہ خیال جو حقوقِ انسانی سے متعلق یا سچائی پر مبنی ہو میرے لیے وہ میری عبادت کا حصّہ ہے۔

☆ آپ کے ہاں تصوف کا سلسلہ دریافت کرنے والے کس امر کی نشاندہی کر رہے ہیں؟

☆☆ میرے ہاں تصوف کا سلسلہ تلاش کرنے والے دراصل حقیقت اور سچائی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ میں مقامِ تشکر کو اہمیت دیتا ہوں اور تکبر کو فخر کی حد تک بھی گناہ سمجھتا ہوں اس بارے میں ایک شعر عرض کیے دیتا ہوں۔

یہ ترا مذہبی غرور
تجھ کو کافر بنا نہ دے

☆ آتشِ پرکالہ کا آپ کی زندگی اور فن میں کس طرح کا کردار ہے؟

☆☆ میری زندگی اور فن میں آتشِ پرکالہ کا کردار جہدِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اپنا اپنا مقام تھا
وہ رکا میں گزر گیا

☆ نظم میں کسک غزل میں سوز کی تفریق کس سبب کی جاتی ہے؟

☆☆ نظم میں محرومی یا کسی بھی ایک مضمون کو انتہائی اثر کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جبکہ غزل محرومیوں اور حسرتوں کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

دَم گھٹا ہے تو نظم کہہ ڈالی
دِل جلا تو غزل سرائی کی

☆ موضوعاتی شاعر کا لقب الزام ہے یا اعترافِ فن؟

☆☆ موضوعاتی شاعر ہونا بہت بڑے اعزاز کی بات ہے اور یہ اعترافِ فن ہے خواہ کسی میں بھی ہو۔

☆ جب لوگ آپ کے بارے ''اکیلا چنا باجے گھنا'' کی مثال دیتے ہیں تو آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں؟

☆☆ اس سوال کے جواب میں ایک شعر ہی کافی ہے آگے ماشاءاللہ آپ ذی شعور ہیں۔

ہم اصولوں پر لڑے ہیں
اس لیے تنہا کھڑے ہیں

☆ ''شوق انصاری کا مزاج اور فکر خاص رنگ میں ڈھل گئے ہیں' یہاں خاص رنگ کی نشاندہی یا وضاحت بھی ضروری ہے؟

☆☆ جب زندگی میں نشیب وفراز آتے ہیں تو زندگی کے ساتھ ساتھ فکر کا بھی زاویہ بدل جاتا ہے۔ میری زندگی میں بہت نشیب وفراز آئے آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جمہوریت کے نام پر جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام ہی انسانی امنگوں کے قاتل ہیں۔ ایک سرمایہ دار تھوڑے ہی عرصے میں ایک سے دو کارخانے بنالیتا ہے اور مزدور کا لباس پھٹے کا پھٹا ہی رہتا ہے۔

بغض کیسا مفلسوں کی ذات سے
اُجرتیں کم ہیں گزر اوقات سے

اہلِ اقتدار کا یہ عالم ہے کہ مزدور کی تنخواہ بارہ ہزار مقرر ہے جس سے اس کے بچوں کا دودھ اور تعلیمی اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے اور خود قومی خزانے کے پیسوں سے عیاشی کر رہے ہیں آخر یہ غلامی کیوں اور کب تک۔

غلامی سے نکل کر ان غلاموں نے
غلاموں کی نئی منڈی بنالی ہے

☆ شوق انصاری کے اندر جس قدر تخلیقی آہنگ ہے یہ سب یوں ہی نہیں ملتا، دل جگر خون کرنا پڑتا ہے۔ آپ ہی بتلایئے کہ آپ نے دل، جگر کو کب کب، کہاں کہاں اور کیونکر خون کیا؟

☆☆ جس شاعر میں جس قدر تخلیقی آہنگ ہوتا ہے وہ اس کی جہد کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ فن میں پختگی انتہائی محنت کی نشاندہی کرتی ہے اور یہ محنت مشاہدات و تجربات پر مبنی ایک لمبی ریاضت کا نام ہے۔ اس ریاضت میں ہر لمحہ ہر قدم پر دل جگر خون کرنا پڑتا ہے۔

جب تلک خونِ جگر جلتا نہیں ہے

شعر بھی معیار میں ڈھلتا نہیں ہے

☆ عوام کے دُکھ درد نے کب اور کس طور آپ کو قلمی طور پر متحرک کیا؟

☆☆ یہ بات آئینے کی طرح شفاف اور واضح ہے کہ شاعر انسانیت کے جذبات کا نمائندہ ہوتا ہے اور وہ خلقِ خدا کی زبان میں ہی بات کرتا ہے۔ وہ دوسروں کی ہر تکلیف کو حقیقتاً اپنی تکلیف محسوس کرتا ہے۔ جو شخص اپنے گردونوح پہ نظر نہیں رکھتا اسے دانشور کہنا صریحاً ناجائز ہے۔ اس بنا پر میں ابتدا سے ہی دوسروں کے رنج وغم کو اپنا سمجھ کر پیش کرتا ہوں۔

☆ دھنوانوں کے خلاف آپ کب صف آرا ہوئے اور اس کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ زر اور املاک قدرت کی طرف سے دی ہوئی عظیم نعمتیں ہیں میں صرف اور صرف جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہوں جس میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو قانونی تحفظ دے کر مفلسوں کے سر پر سوار کر دیا جاتا ہے جس سے استحصال کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔

اپنے اپنے ظرف کی خو ہے
زر کسے مغرور کرتا ہے

قانون بااثر افراد کے گھر کی لونڈی بن کر رہ جاتا ہے۔ عدل انتہائی متاثر ہوتا ہے جیسا کہ ہو رہا ہے سر اٹھانے والوں کو سینہ زوری سے دبا دیا جاتا ہے۔

بااثر شر پسند ہے
عدل کی آنکھ بند ہے

☆ ہتھیار اُٹھانے، بغاوت کرنے کی تحریک کس کے خلاف اور کیوں؟

☆☆ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے باعث قائم شدہ اجارہ داریوں کا حصار اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ لوگ فریاد کرنے کی صلاحیت بھی کھو بیٹھتے ہیں۔

''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے''

ایسی صورت میں قوم کے پاس ہتھیار اٹھانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

☆ سورج کی شکل میں اُمید کا استعارا، چوروں، لٹیروں اور رسہ گیروں کے سامنے کارگر ہونے کے کتنے امکانات ہیں؟

☆☆

رات کتنی طویل ہو جائے
شوق سورج تو مَر نہیں جاتا

رعایا کو سبز عینک لگوا کر کب تک سب کے آگے سوکھی گھاس ڈالی جا سکے گی ایک نہ ایک دن قوم سوچنے پر مجبور تو ہو ہی جائے گی کہ کتنے پیار کے ساتھ کس قدر بدسلوکی کی جا رہی ہے۔

☆ ہماری بے بسی کو شعور کب آئے گا، کب مخلص رہنما ملیں گے اور کس طرح ملیں گے؟

☆☆ جب کسی قوم پر بے بسی کی انتہا ہو جاتی ہے تو قوم اپنی بے بسی کے اسباب و وجوہات پر ضرور سوچتی ہے اسی کو اجتماعی فلاحی شعور کہا جا سکتا ہے۔

بے بسی کی انتہا ہونے کو ہے اور میں
انقلاب کے لیے پر امید ہوں

☆ جس جرأت، بے باکی اور نڈر طریق پر آپ صاحبِ اختیار لوگوں کو ہدفِ تنقید بنا رہے ہیں اُس کے ردِ عمل میں کبھی کسی طرح کی مشکل کا سامنا یقیناً رہا ہوگا؟

☆☆ اس سے بڑی مشکلات کا اور کیا سامنا ہو سکتا ہے کہ مجھے ریڈیو، ٹی وی، آرٹ کونسل یا کسی سرکاری ادبی تقریبات کی دعوت سے ہمیشہ محروم رکھا گیا۔ یہی سلوک میرے دادا استاد (ساغر صدیقی) سے کیا گیا تھا۔ یہ لوگ تو اتنے ظالم ہیں کہ تعصب کی بنا پر مخالفین کے حقوق بھی غصب کرنے سے باز نہیں آتے۔ حالانکہ یہ ادارے ان کے باپ کی ملکیت نہیں ہمارا بھی برابر کا حق بنتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ پاکستانی نہیں یا پھر ہمیں پاکستانی تسلیم نہیں کیا جا رہا۔ کیا ان کی کج روی کو جمہوریت کا نام دیا جا سکتا ہے۔

منصبوں کے خمار پر لعنت
صاحبِ اختیار پر لعنت
میرے گھر کی فضا سلگتی ہے
تیرے گھر کی بہار پر لعنت
شر کے ڈر سے سلام ہے تجھ کو
تیرے جھوٹے وقار پر لعنت
بیش قیمت ضمیر ہے تیرا
قیمتِ شاندار پر لعنت

☆ اگر کوئی آپ کی ذات پر زود گوئی کا الزام لگائے تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

☆☆ ارے بھائی زود گوئی اور حق گوئی تو قابلِ فخر باتیں ہیں۔ ایسے الزامات ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتے ہیں۔

☆ تمام عمر اردو شاعری کی نذر کرنے کے بعد کسی قسم کا صلہ یا اعتراف نہ ہونے کے باعث آپ کے دل میں افسوس، ملال یا پچھتاوا تو نہیں؟

☆☆ جو کام اللہ کے لیے کیا جائے اُس کام کا صلہ صرف اور صرف اللہ ہی دے سکتا ہے۔ رہی بات پچھتاوے کی تو بےلوث کاموں کا پچھتاوا کیسا۔

☆ آپ کے اہلِ خانہ، عزیز و اقارب شوق انصاری کی قلمی ریاضت کے بارے کیا احساسات رکھتے ہیں؟

☆☆ میرے والد مرحوم بھی شاعر تھے ان کے احساسات ہمیشہ میرے لیے حوصلہ افزا اور مثبت رہے۔ میری غیر موجودگی میں میرے دوستوں کو کہا کرتے تھے کہ میرا بیٹا بہت اچھا شاعر ہے۔ رات کو میں اکثر گھر لیٹ آتا میرے والد خود

باقی صفحہ۲۳ پر ملاحظہ کیجیے

''صاحبِ تاثیرزباں''

(محترم شوق انصاری کے غزلیہ کلام سے انتخاب)

عطیہ سکندرعلی (سکھر)

ظلمتِ شب کو ضیا کہتے ہیں
عقل کے اندھے بجا کہتے ہیں
ہے ہوس بھی کفر ہی کی بنیاد
لوگ دولت کو خدا کہتے ہیں
سُن کبھی احساس کے کانوں سے
یہ لبِ خاموش کیا کہتے ہیں
دل جلوں کی بربادی مت پوچھ
انتہا کو ابتدا کہتے ہیں
وقت ہی درپن دکھاتا ہے شوقؔ
ہم کسی کو کب بُرا کہتے ہیں

○

☆

ستم کی نئی تدبیر ہے
چھری پر وفا تحریر ہے
فقط سانس تک آزاد ہیں
مگر سوچ پر تعزیر ہے
ترے دیس کے سقراط ہیں
ہماری کہاں توقیر ہے
حقیقت یہاں گم نام ہے
گماں کی بہت تشہیر ہے
بہت خوبصورت خواب تھا
بہت بدنما تعبیر ہے
جدا ہے اگر اندازِ شوقؔ
زباں صاحبِ تاثیر ہے

○

☆

انہیں کیا عار ننگے ہیں
ہوس کے خوار ننگے ہیں
گلہ بے آبرو پر کیا
یہاں خود دار ننگے ہیں
ترے حالات کہتے ہیں
ترے غمخوار ننگے ہیں
شرافت کے پسِ پردہ
کئی کردار ننگے ہیں
سجی ہے چادروں سے قبر
مگر حقدار ننگے ہیں
وفا کے شوقؔ دعویدار
پسِ اقرار ننگے ہیں

○

''چہارسُو''

○

شرافت دیکھ کر لوٹا
سبھی نے بے خطر لوٹا
گھٹا کر اجرتیں تم نے
غریبوں کا ہنر لوٹا
عقیدے کے منافق نے
خدا کے نام پر لوٹا
فریب دشت نے آخر
مسافر کا سفر لوٹا
شجر کے وارثوں کو شوقؔ
شجر سے باندھ کر لوٹا

☆

☆

حق پرستی کی حمایت ہو گی
تیرے گھر سے ہی بغاوت ہو گی
میں بدل جاؤں تجھے اپنا کر
یہ محبت میں خیانت ہو گی
اپنا حق مَیں چھین بھی سکتا ہوں
خود ہی دو گے تو عنایت ہو گی
بے سبب اس نے مجھے چھوڑا ہے
کچھ تو اس کو بھی ندامت ہو گی
فیصلہ دو ٹوک بہتر ہو گا
بدگمانی میں قباحت ہو گی
ہم اگر ہیں شوقؔ تو دنیا ہے
ہم نہ ہوں گے تو قیامت ہو گی

○

☆

بے حِسی کے دور میں غم خوار لُٹ جاتے ہیں
اہلِ دل اکثر سرِ بازار لُٹ جاتے ہیں
اوڑھ لیتی ہے غلامی کا لبادہ خود پر
دہر میں جس قوم کے افکار لُٹ جاتے ہیں
انتخابی سوچ تک محدود ہیں سب جذبے
پھر حلف کے بعد ہی کردار لُٹ جاتے ہیں
اپنے حق پر جس جگہ خاموش رہتے ہیں لوگ
زندگانی کے وہاں آثار لُٹ جاتے ہیں
نارسائی کی بِنا پر اَمن ہو جاتا ہے
سائلوں کے ہونٹ سے اصرار لُٹ جاتے ہیں
شوقؔ صاحب حیف ہے اُن بے نوا لوگوں پر
جو خموشی سے پسِ دیوار لُٹ جاتے ہیں

○

○

مصلحت کے سوا سرِ مقتل
ہم نے کی ہے وفا سرِ مقتل
بو چلا کون خون مقتل میں
اُگ رہی ہے حنا سرِ مقتل
زندگی ہست کا تکلف ہے
ہے فنا میں بقا سرِ مقتل
ہم نہیں التفات کے قائل
پاسِ حق ہے تو آ سرِ مقتل
لب سلیں گے تو خون بولے گا
لاکھ دامن بچا سرِ مقتل
انقلابات کا تقاضا ہے
اہلِ دل کو بُلا سرِ مقتل
شوقؔ مت پوچھ ضبط کا عالم
ہم کو جینا پڑا سرِ مقتل

☆

☆

تجھ سے پہلے اس قدر ترسے نہیں تھے
ہم اکیلے تھے مگر اتنے نہیں تھے
کچھ تری سوچوں کا محور بھی الگ تھا
کچھ مرے حالات بھی اچھے نہیں تھے
جالیا محرومیوں نے جستجو کو
زندگی کی فکر تھی جذبے نہیں تھے
ہم تو اپنوں کی رسائی سے مَرے ہیں
ہاتھ دشمن کے مگر لمبے نہیں تھے
ہم چلے آئے مثالِ آب ہٹ کر
اِن پہاڑوں میں کہیں رستے نہیں تھے
بخت کا ہے کھیل سارا شوقؔ صاحب
وہ نہ تھا ہشیار ہم بچے نہیں تھے

○

☆

سچ کا بیڑا اٹھا لیا
سب کو دشمن بنا لیا
مجھ کو الفت سے کیا ملا
تو نے نفرت سے کیا لِیا
لوگ مجھ کو نہ پا سکے
میں نے لوگوں کو پا لیا
سَر کی عظمت عزیز تھی
سَر دیا سَر بچا لِیا
کم نگاہی کے خوف سے
خود کو خود میں چھپا لیا
شوقؔ تضحیک پر مری
سب نے مجمع لگا لیا

○

○

غم کی دلدل میں اُتر جاؤ گے
اب نہ سنبھلو گے تو مر جاؤ گے
میں تو ہر پَل مُرتکب ہوں سچ کا
میرے ،کِس ،کِس جرم پر جاؤ گے
وقت چوراہے پہ لے آیا ہے
فیصلہ کر لو! کِدھر جاؤ گے
مصلحت کے دور کے انساں ہو
ایک دن تم بھی مُکر جاؤ گے
شوقؔ پر الزام دَھرنے والو!
آ پڑے گی تو سُدھر جاؤ گے

☆

☆

وصل میں یک جان یوں باہم ہوا
اک اجالے میں اجالا ضم ہوا
طاق میں رکھا گیا پڑھ کر مجھے
آدمی اخبار کا کالم ہوا
برہمی تو حسن کا دستور ہے
جو ہوا محرم وہی مجرم ہوا
پھر بجھی اس فرد سے، جس سے لگی
پھر وہی شعلہ بدن شبنم ہوا
ہو گئی غارت گری کی انتہا
شہر گویا خون کا قلزم ہوا
شوقؔ وہ کس بات کا شکوہ کرے
شخص جو حالات سے برہم ہوا

○

☆

خود سروں کو سکھا نہیں سکتے
جاگتے کو جگا نہیں سکتے
ان شراروں سے کھیلنے والے
اپنا دامن بچا نہیں سکتے
وہ مرا ہاتھ کیا بٹائیں گے
بوجھ اپنا اٹھا نہیں سکتے
ساحلوں پر یقین سہی لیکن
ریت کے گھر بنا نہیں سکتے
سر کی رفعت کو جاننے والے
اپنے سر کو جھکا نہیں سکتے
ہے خداداد شوقؔ فن اپنا
لوگ ہم کو دبا نہیں سکتے

○

○

ترے رخ کے نقوش کہتے ہیں
دل پہ کیا کیا عذاب ٹوٹے ہیں
رنج کے طاق میں شبِ ہجراں
ہم مثالِ چراغ جلتے ہیں
ہم سے مت کر خلوص کے دعوے
ہم نے سب کے ضمیر دیکھے ہیں
دشمنوں کی تلاش میں اکثر
دوستوں کے سراغ ملتے ہیں
حسرتیں باعثِ صعوبت ہیں
اور ارماں لہو کے پیاسے ہیں
مصلحت کے چراغ گل کر دو
ظلمتوں کو فروغ دیتے ہیں
سنگ نفرت کے بے سہاروں پر
کس قدر بے دریغ برسے ہیں
شوقؔ ہیں التزام کے شاعر
لفظ میں ڈوب کر نکلتے ہیں

☆

☆

پیار کے ابہام سے ڈر لگتا ہے
اب وفا کے نام سے ڈر لگتا ہے
کھو نہ جائیں بھیڑ کی زد میں آ کر
دہر کے ہنگام سے ڈر لگتا ہے
بات کو تہمت بنا لیتے ہیں لوگ
بے وجہ الزام سے ڈر لگتا ہے
بے کلی سی بے کلی ہائے ہائے
دل ترے انجام سے ڈر لگتا ہے
ڈوب جاتا ہے جوانی کی مانند
شمس کی ہر شام سے ڈر لگتا ہے
سر چڑھی ہے شوقؔ اس حد تک وحشت
آج اپنے بام سے ڈر لگتا ہے

○

☆

دل نہیں دل رُبا نہیں
شوق شعلہ نُما نہیں
جب سلامت نہیں زُباں
کوئی بھی اِلتجا نہیں
اپنی تقسیم ہے غلط
رِزق میں اِلتوا نہیں
عزّتِ مستعار میں
جراتوں کو بقا نہیں
معتبر ہیں ضرورتیں
کوئی رشتہ روا نہیں
بے نیازوں سے کیا گلہ
شوقؔ سے آشنا نہیں

○

”چہارسُو“

○

آئینہ مَن چلا ہے
سچ منہ پہ بولتا ہے
انسان کی نظر میں
انسان گِر چکا ہے
موقع پرست ہے حُسن
شب خون مارتا ہے
خاموشیوں کی تہہ میں
اِک شور سا بپا ہے
حد ہے گماں کی شوقؔ
ہر آدمی خدا ہے

☆

☆

توقع پر بہل جاؤں گا ذرا ٹھہرو
تذبذب سے نکل جاؤں ذرا ٹھہرو
رُکے ہیں مثلِ دریا اشک آنکھوں میں
کناروں سے اچھل جاؤں ذرا ٹھہرو
بہت جلدی سہی تجھ کو بدلنے کی
مگر میں بھی بدل جاؤں ذرا ٹھہرو
شبِ غم کے مسافر کو بُلا لاؤ
بلا مقصد نہ جل جاؤں ذرا ٹھہرو
پرکھنا ہے فریبِ آرزو کو، شوقؔ
کہیں پھر نہ مچل جاؤں ذرا ٹھہرو

○

☆

تُو صفا حسنِ بیکراں
تُجھ کو دیکھوں کہاں کہاں
کس کو ہے وقت پر گماں
وقت ہے وقتِ ناگہاں
تُو کہاں اور میں کہاں
رِہ گئی یادِ رفتگاں
کب تلک زندگی جواں
کب تلک لطفِ دوستاں
پھول سے سنگ کا گماں
کون ہے شوقؔ گلفشاں

○

○

رنج زیبِ لب نہیں ہے
ورنہ شکوہ کب نہیں ہے
اس کا مذہب کونسا ہے
جس میں کوئی ڈھب نہیں ہے
زندگی کا طول مت پوچھ
دو گھڑی کی چھب نہیں ہے
ریش ہے مذہب میں لیکن
ریش میں مذہب نہیں ہے
ہے نمو ماحول سے شوق
ذات کا کرتب نہیں ہے

☆

☆

جو خوشامد سے ٹل نہیں سکتے
وہ کبھی بھی بدل نہیں سکتے
ان اجاروں کا طوق بوجھل ہے
سَر ہمارے نکل نہیں سکتے
ایک گیلے درخت کی مانند
ہم سلگ کر بھی جل نہیں سکتے
ہم طرف دارِ حق پرستی ہیں
جبر کے ساتھ چَل نہیں سکتے
لوگ اندر سے مَر چکے ہیں شوقؔ
ان کے جذبے مچل نہیں سکتے

○

☆

ہر وسیلہ جام کر دیا جاتا ہے
مفلسی کو عام کر دیا جاتا ہے
بے کسوں کے ہونٹ سی دیے جاتے ہیں
آہ کو ابہام کر دیا جاتا ہے
سر اٹھانے پر حقوق چھن جاتے ہیں
بھوک کو انجام کر دیا جاتا ہے
ہر مخالف کو ہجوم میں مروا کر
قتل کو گمنام کر دیا جاتا ہے
ڈال کر دو روٹیوں کے چکّر میں شوقؔ
سوچ کو ناکام کر دیا جاتا ہے

○

مصلحت کے چراغ

دامن انصاری

(بھکر)

اگر شوق خواہش، آرزو، اِچھا، تمنا یا اشتیاق کے پیرایہ میں نظر آئے تو وہ قربانی کی علامت کو ظاہر کرتا ہے۔

اگر شوق رغبت، میلانِ طبع یا کسی شغل کی آرائش بنے تو وہ محبت کی جاذبیت میں نمودار ہوتا ہے۔ اگر شوق کا عشق، محبت، جوش یا کسی سرگرمی میں ظہور ہو تو وہ جنون کے پیکر کو مس کرتا نظر آتا ہے۔ اگر شوق کسی دھن، ترنگ، لہر، موج کی پوشاک پہن لے تو وہ کسی بے پایاں سمندر کی زد میں آجاتا ہے۔ اگر شوق کسی چاٹ، مزہ، چسکا یا کسی امنگ کی روش اختیار کرلے تو وہ بے راہ روی کو اپنا مسلک گردان لیتا ہے۔ اگر شوق بے راہ روی کے ڈھنگ میں نمودار ہو تو وہ جنگ کا اعلانیہ ہے۔ اور اگر شوق جنگ وجدل کی زیبائش بن جائے تو وہ انقلاب کو جنم دیتا ہے۔ اور انقلاب شوق سے ماورا بھی ہے اور شوق کے عین قریب بھی۔ انقلاب جبر واستبداد کے لیے موت ہے اور اسی انقلاب کو ہم ''ردالفسادؔ'' کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ بہرصورت! شوق ہر رنگ میں اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے اور ایک شوقؔ فیصل آباد کے صدر میں رنگ برساتا نظر آتا ہے۔ جو فیصل آباد کے لیے فخر بھی ہے اور اعزاز بھی۔ اور اس شوقؔ کو ہم شوقؔ انصاری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ شوقؔ انصاری غزل سے نظم تک کا سفر کچھ ایسے طے کرتے ہیں کہ راہ میں چلنے والا ہر مسافر شوقؔ کے ہمراہ ہو لیتا ہے۔ اگر شوقؔ شبنم کے دھاروں میں غسل فرماتا نظر آتا ہے تو دوسری طرف آتش کے پرکالہ سے چھیڑ چھاڑ کرتا بھی نظر آتا ہے۔ شوقؔ کے الفاظ میں گہرائی اور تخیل میں گیرائی ہے۔ شوقؔ کی تشبیہوں میں حسن کی جلوہ نمائی اور استعاروں میں قوت گویائی کی ہمہ یکتائی ہے۔ شوقؔ کی نظم میں کسک کا ہن ہے اور غزل میں سوز کا تلون۔ شوقؔ کا تسلسل ایک طرف رنگ گل لئے ہے تو دوسری طرف اس کا تخیل ایک عالم کا تخیل ہے۔ شوقؔ کی بے چینی اور تڑپ اس کی کاریگری نہیں بلکہ احساس کا وہ لاوا ہے جس سے دوسرے تو محفوظ ہوتے ہیں لیکن خود اندر ہی اندر سوختہ سامانی کا منظر سمیٹے آہیں بھرتا نظر آتا ہے۔ شوقؔ کی شاعری محض شاعری نہیں بلکہ دھنوانوں کے خلاف تلوار کے مانند ہے۔ زرداروں اور آمروں کے لیے ایک میٹھی نیند کے مثل ہے۔ شوقؔ کی شاعری ایک شعشعہ ہے جو دنیائے فن کو روشن کیے ہوئے ہے۔ شوقؔ کی شاعری ایک مرقاۃ ہے جس پہ قدم رکھتے ہی چشم زدن میں بامِ شعور وآگہی پائے ادراک کے نیچے دکھائی دیتا ہے۔ شوقؔ کہیں اجارہ داری اور بربریت کے خلاف قلم اٹھاتے نظر آتے ہیں تو کہیں وسائل کے بارے میں نالہ وشیون کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں۔ کہیں لوگوں کی ہٹ دھرمی اور جہالت کی فراوانی کو آئینہ دکھاتے ہیں تو کہیں ستم پرور کو کمینہ کہنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور معاشرہ میں بسنے والے ہر فرد کو یہ بتانے پر مصر ہیں کہ چہروں کو مت دیکھو بلکہ لوگوں کی خصلتوں میں ان کے ہنر تلاش کرو۔ شوقؔ کی اس غزل پر نظر فرمائیے اور انصاف کیجیے!

اجارے ہیں وسائل پر
اٹھا ہتھیار حائل پر
سبھی مدہوش تھے زد میں
گیا ہے کون سائل پر
بہت ہی ہٹ دھرم ہیں لوگ
نہیں جاتے دلائل پر
ستم پرور کمینے ہیں
کریں گے وار گھائل پر
نہ جاؤ شوقؔ چہروں پر
پرکھ ان کو خصائل پر

شوقؔ کا کلام حالات کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ وقت کی تفسیر ہے۔ کہیں بے تابی کا عالم، کہیں دلگیری ہی دلگیری۔ کہیں غربت رسوائی کا پیراہن اوڑھے نظر آتی ہے۔ تو کہیں دولت توقیر کے اطلس وکمخواب میں جلوہ گر ہے۔ شوقؔ کی شاعری میں کہیں غریبوں کے چہرے پہ خفگی ہے تو کہیں کھیت کی ہریالی پائمالی کا شکار ہے۔ شوقؔ اپنی غزل میں کہیں مصلحت کو اپنا شعار بتاتے ہیں تو کہیں مصلحت کے چراغ گل کرنے کو کہتے ہیں۔

مصلحت کے چراغ گل کر دو
ظلمتوں کو فروغ دیتے ہیں

کہیں نظام کی لگام اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں اور براق انقلاب پہ سوار ان تمام حدود کو پار کر جاتے ہیں جو ہمیں غلامیت کی چیرہ دستی سے کہیں اس پار موت کے غار میں اتار آنے کا اذن فراہم کرتا ہے اور کہیں معاف کرنے کو انتقام لینے پر فوقیت دیتے ہیں۔ اور انتقام کو ہمہ تباہی تصور کرتے ہیں۔ کہیں خود کو خستہ دلی کی تصویر کھینچ کر اپنی صدا کو خاموشی کے سرچشمہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کہیں خود کو ہجر کی شب رنج کے طاق میں مثل چراغ جلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کہیں بے التفاتی پہ نالاں ہیں۔ کہیں ضابطوں کو وقار کی سیڑھی بنا کر دیس کی پاسداری کا ثبوت دیتے ہیں اور کہیں انقلاب کو وقت کا تقاضا سمجھ کر اہل دل کو سر مقتل دعوت دیتے ہیں اور وہ دعوت کس انداز سے دیتے ہیں ذرا چشم تفہیم کھولیے اور ان اشعار کے بارے میں کچھ بولیے:

لاکھ دامن بچا سر مقتل
خون کب چھپ سکا سر مقتل
انقلابات کا تقاضا ہے
اہل دل کو بلا سر مقتل

شوؔق انصاری چھوٹی بحر میں لاجواب کلام کہتے ہیں۔یایوں کہہ لیجیے کہ شوؔق انصاری چھوٹی بحر کے شاعر ہیں۔اور سہل اندازی میں وہ میر کے مقلد نظر آتے ہیں۔اورانہی کی طرز کواپناوتیرہ بنایا۔

شوؔق ہیں طرز میر کے شاعر
لفظ میں ڈوب کر نکلتے ہیں

ایک قطعہ شوؔق انصاری کے بارے میں جو دل کی گہرائیوں سے نکل کر بے ساختہ زبان پرآ گیا۔

بر سر قہقہہ،شوؔق را یافتم
مضطرب، بے نوا،شوؔق رایافتم
یافتم شوؔق را، در ہجوم عاشقاں
دل ربا، دل کشا،شوؔق رایافتم

<u>کلام شوق</u>

وقت بدلا، دیس کی حالت نہیں بدلی
قوم کے رہبر تری عادت نہیں بدلی

احوال پر کسی کے طعنہ بجا نہیں ہے
تجھ کو گمان کیسا کس کا خدا نہیں ہے
لوہے کوموم کہہ کر بدلو گے کیسے فطرت
ہو مہربان خنجر ممکن ذرا نہیں ہے

اب جو سارا انتظام بگڑا ہے
چشم پوشی سے کام بگڑا ہے
خود بخود توڑ دو تسلط کو
پھر نہ کہنا غلام بگڑا ہے

اس قدر افلاس کی بہتات ہے
تنگدستی باعث اموات ہے
ان محلات فزوں پر نہ جا
ان کی سوچوں میں فقط ظلمات ہے

اب کہاں ہے تمیز بندوں میں
رل گئے اچھے لوگ گندوں میں
لوٹ کر کھا لیا وطن جس نے
درج کر اس کو شر پسندوں میں

فرق سے دیکھا نہ کر
آنکھ کو میلا نہ کر
فہم سے قاصر نہ رہ
وہم کی پوجا نہ کر
غیر کا لقمہ نہ بن
ذات کو میٹھا نہ کر
بے سبب بھوکا نہ مر
کس کو رسوا نہ کر

مارڈالا ہے تعصب کی فضا نے
ہر بشر بیزار ہے ہم سو رہے ہیں
پیٹ بھرتا ہی نہیں اہل ہوس کا
ہر طرف حق دار ہے ہم سو رہے ہیں
شوؔق صاحب بدنصیبی ہے ہماری
راہزن بیدار ہے ہم سو رہے ہیں

شوق نے فارسی کی ترکیب ''اوکجاومن کجا'' کوجس طرح اردو میں استعمال کیا ہےداد کے قابل ہےاپنی بصارت اس طرف مرکوز کیجیے:

منزلیں ہیں جدا، وہ کجا میں کجا
کون ہے ہم نوا، وہ کجا میں کجا
میں تو بےلوث ہوں اور وہ خودغرض
اس نے امید کیا، وہ کجا میں کجا
وہ ملے نہ ملے میں ملوں نہ ملوں
وقت کا کیا پتا وہ کجا میں کجا

جو ترقی کاغذوں میں
وہ کہاں ہے بستیوں میں
اجڑے گلشن کا مقدر
سو رہا ہے کوٹھیوں میں
خار وحسن کی طرح تھے لوگ
بہہ گئے ہیں بارشوں میں
متفق رہبر نہ تھے لوگ
رل گئے ہم راستوں میں

بام و در سے خطرہ ہے
اپنے گھر سے خطرہ ہے
ساتھ ساتھ چلتا ہے

ہم سفر سے خطرہ ہے
زر کو شر سے نسبت ہے
مال و زر سے خطرہ ہے
وہ نظر جو نیچی ہے
اس نظر سے خطرہ ہے
جن سے دوستی ہے شوقؔ
ان کے شر سے خطرہ ہے

رنج پروانہ وار پڑتے ہیں
دل کہاں ہے چراغ محفل ہے
پھر وہی شوق ہے وہی حسرت
پھر وہی داغ ہے وہی دل ہے

اب وہ غزل ملاحظہ فرمائیے جو خاص اردو زبان کے اوصاف میں کہی گئی ہے:

ہر کسی پر دان ہے اردو
کس قدر آسان ہے اردو
مشترک تفہیم کا لہجہ
پیار کا عرفان ہے اردو
ہر چمن کا پھول ہے اس میں
لفظ کا گلدان ہے اردو
ہر جگہ اعجاز ہے اس کا
ہر گھڑی ہر آن ہے اردو

شوق را کامل یافتم در تخئیل سخن و ماورا شدن
در تخیل لامتناہیٔ عالم بے ثبات وتاب دادن
آئینہ ٔ زبان بیان در شعر وسخن

''مفلس کے بچے''

جس معاشرے میں استحصالی قوتیں قابض ہوں، قانون فقط چھوٹے طبقے پر ہی صادر آتا ہو، سر اٹھانے والوں کو لالچ اور سینہ زوری سے خاموش کر دیا جاتا ہو، میڈیا پر اجارہ داری ہو، عدل وانصاف صرف اپنوں کے لیے ہی فعال ہو، صرف جھکنے والوں کے لیے ہی مراعات ہوں، اختلاف کی بنا پر دوسرے لوگ بنیادی حقوق سے محروم ہوں، تعلیم اور صحت صرف امراء کا ہی حق سمجھا جاتا ہو، لوگ روزی روٹی کو بھی ترس رہے ہوں اور اہلِ اقتدار عیش پرستی میں مصروف ہوں، دانشور اور شعراء خرید لیے گئے ہوں تو ایسے اندھیر میں آوازِ حق بلند کرنا بڑی ہمّت کی بات ہے۔

اس بے باکی پر اس دور کے نہ بکنے والے اور نہ جھکنے والے معروف شاعر جنابِ شوق انصاری کی ہمت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں جو بے یار و مددگار اور انتہائی محدود وسائل کے ساتھ اپنی حق گوئی اور بے باکی پر ثابت قدم ہیں پاکستان جانے پر دومرتبہ ان کے گھر پر ان سے ملاقات کا شرف نصیب ہوا۔ ڈیڑھ مرلے کے مکان میں بیوی، بہو اور بیٹے سمیت انتہائی سادہ زندگی گزارنے والی یہ شخصیت ہمیں پُر امید نظر آئی۔

شوق انصاری صاحب نہایت یقین کے ساتھ برجستہ اشعار کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ان کو سننے اور پڑھنے سے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے سخن ان پر نزول ہوتا ہے۔حقوقِ انسانی کے انتہائی قائل ہیں۔معاشرے کا رنج وغم اور محرومیاں اتنی خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا عش عش کر اُٹھتا ہے مثال کے طور پر ان کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

کم سنی میں ہوٹلوں پر ہیں ملازم
جانے کس مجبور کے نورِ نظر ہیں
خزاں کا روپ ہے مفلس کا چہرہ
کسی موسم میں بھی کھلتا نہیں ہے
بغض کیسا مفلسوں کی ذات سے
اجرتیں کم ہیں گزر اوقات سے
بہت محروم ہیں مفلس کے بچّے
کہ ان کے ہاتھ میں بستہ نہیں ہے

بلاشبہ شوق انصاری محروم طبقے کے نمائندہ شاعر ہیں اور ان کو کبھی بھی خاموش نہیں کیا جائے گا۔

جمیل قمر (کینیڈا)

''رنج کو تقسیم کرلو''

سیدایازمفتی

(امریکہ)

1960 میں ساغر صدیقی کے قابلِ فخر شاگرد سید عبدالستار مفتی نے انجمن تقدیس ادب تشکیل کی۔ اور بعد ازاں سمندری فیصل آباد میں انجمن شعورِ ادب اور بزم فردوس ادب قائم کی۔ اور شہر سمندری میں ساغر کے فکر کو آگے بڑھانے میں اپنے شب وروز لگائے۔ انکے شاگردوں کی تعداد دن بدن بڑھتی گئی۔ آصف جلال، حامد نثار، شوق انصاری، سلیمان برق، اقبال مجروح، اقبال طور، رمضان صدیقی، اسلم شہزاد، شریف آثم، رشید طور، بلال کیفی، اور ناز خیالوی، اسحٰق شاد، سید ایاز مفتی، مذکورہ بالا شاگردوں میں ناز خیالوی، سید ایاز مفتی (مفتی مرحوم کے فرزندِ ارجمند) اور شوق انصاری نے خوب نام کمایا۔ ناز خیالوی تو اللہ کو پیارے ہو چکے۔ مگر شوق انصاری نے اپنی شاعری سے نہ صرف اپنے استاد کا نام روشن کیا۔ بلکہ انکی شہرت سرحد کے دوسری جانب بھی پہنچی۔ اور ہندوستان اور پاکستان میں انکی شہرت یکساں حیثیت رکھتی ہے خاص کر اس نظم نے تو حکومتی ایوانوں کے در و بام ہلا کر رکھ دیے ہیں۔

معیشت کے دشمن یہ قومی لُٹیرے\
اُصولوں سے بالا یہاں کے وڈیرے\
جبلّت میں جن کی سراسر بغاوت\
حکومت کے اندر بھی اپنی حکومت\
یہ دستور سازی کے مُلکی ادارے\
کہاں سو رہے ہیں محافظ ہمارے\
علاوہ ازیں چند ایسے گھرانے\
جو حق و صداقت کے دُشمن پُرانے\
رعونت کے مارے تکبّر کے پیکر\
جہالت میں جن کا تمدّن سراسر\
کہیں سینہ زوری کہیں پر حماقت\
خدائی کے سر پر یہ کیسی قیامت\
یہاں بے کسوں کی حفاظت کہاں ہے\
تحفظ کہاں ہے شرافت کہاں ہے\
گراں نرخ چیزیں تسلسل میں فاقے\
کہیں جان لیوا بموں کے دھماکے\
عیاں ہر قدم پر درندوں کا منظر\
کِیا کِس نے گلشن کو جنگل سے بدتر\
کہیں پر گماں ہے کہیں خود پسندی\
کہیں پر تعصّب کہیں فرقہ بندی\
مِٹائی محبت کی تفہیم کس نے؟\
کِیا ابنِ آدم کو تقسیم کس نے؟

دنیائے ادب میں اپنی اور صرف اپنی انتھک محنت سے سمندری کے علاقے سے ہوتا ہوا آسمان سخن پر چمکتا اور دمکتا ہوا حسین کوکب شوق صاحب کی دنیائے سخن میں سید عبدالستار مفتی کے ذریع علم و ادب کی آبیاری ہوئی، اور انہی سے شاعری کے رموز واسرار سیکھے۔ اور انتہائی کم عمری میں مختلف علوم وفنون پر وہ دسترس حاصل کیئے اور پھر فنِ شاعری کہ وہ شہ پارے تخلیق ہونے لگے کہ دنیائے ادب انگشت بدنداں رہ گئی۔ مفتی مرحوم کے اس ہونہار سپوت نے دولت علم وادب میں روز افزوں اضافہ کیا اور کرتے ہی جا رہے ہیں۔ شوق انصاری کے اندر گونا گوں صفات سے مزین ہیں۔ انکی شاعری میں علائم ورموز کا بخوبی اندازا لگایا جاسکتا ہے۔ درویشی، اور فقیری اوصاف سے لبریز اور فقر و فاقہ کی تصویر۔ مگر خیالات میں اوج ثریا کو چھونے والے۔ لیکن فروغ وحصولِ علم میں کبھی اپنی غربت کو حائل نہ ہونے دیا! شوق کی شاعری میں سنجیدگی اور متانت کا پہلو بے حد نمایاں ہے۔ وہ لچر اور بے ہودہ شاعری سے نفرت کرتے ہیں۔ انکی شاعری میں زندگی کی گہما گہمی اور اسکے اطراف پائی جانیوالی تلخ حقیقتوں کا اظہار جا بجا ملے گا۔ وہ گل و رخسار کی شاعری سے کہیں زیادہ اپنے عہد کے مسائل کو اجاگر کرنے میں اپنی توانائیاں بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ اگر چہ آلام روزگار کا شکار رہے لیکن صبر و رضا کی ردا اوڑھے ہوئے کہ حال کسی پر آشکار نہ ہو جائے سچائی، راستی یہ وہ عناصر ہیں جو انکی فطرت میں رچے بسے ہیں وہ واقعی فطری شاعر ہیں۔ اپنے اطراف کے مسائل کو جس خوبصورتی اور دیانتداری سے وہ پیش کرتے ہیں۔ بہت کم شعراء میں نے دیکھے ہیں جن میں ان جیسی صفات ہیں۔ اپنے خیال سے عبادت کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ اور بے جا مخالفت کرنے والوں کی آئی ڈی بلاک کرنے میں ذرا بھی ہچکچاتے نہیں۔

وہ جو کچھ اپنے اطراف میں دیکھتے ہیں اور جوان پر یا عام آدمی پر بیتتی ہے اسے خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنا کو شعری قالب میں ڈھال دیتے ہیں شوق انصاری کے ہاں تعمیری ادب بھی ملتا ہے اور تخلیقی ادب بھی۔ انکے ہاں تصوف بھی ملتا ہے اور حکمت کا خزانہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ خیال کی بلند پروازیاں ایسی کہ آدمی عش عش کر اٹھے شوق کسی بھی شک اور شبے کے بغیر آمد کے شاعر ہیں۔ انہیں اللہ نے شاعر بنایا ہے اور ان ذمہ داریوں سے نبٹنے کے کے لئے خیال کی دیوی ہر وقت خدمت کو موجود ہوتی ہے۔ انتہائی قانع اور مطمئن المزاج شخصیت کے مالک شوق کی شاعری میں جدید حسیات، حسن کی قدر شناسی، اضطراب بھی انکی شاعری

میں نظر آتے ہیں. شوق صاحب کے چند اشعار دیکھئے:

جو نوید ِ بہار دیتا ہے
باغباں اس کو مار دیتے ہیں
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
درد جو غمگسار دیتے ہیں

یہ شعر تو فوراً ہی سامع کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے

بے بسی کو شعور آنے دو
رہنما پھر اسی سے نکلیں گے

اور کیا ہی عالمگیر نوعیت کا شعر ہے

مصلحت کے چراغ گل کردو
ظلمتوں کو فروغ دیتے ہیں

یہ معیار, یہ بندش, یہ اسلوب, یہ طرز کسی پختہ کار, مشاق قلم کار کی جانب صریح اشارہ کرتے نظر آرہے ہیں. اور رنگ تصوف کا یہ عالم کہ......

قد فراست کا ذرا اونچا کر
میں ترے سر سے گذر جاتا ہوں

کتنے سلیس پیرائے میں اتنی عظیم و گہری بات کہہ دی کہ

زندگی کی بے بسی پر
موت بھی شرما گئی ہے

ایسا کہنے کے لئے ہم کو زمانے لگ جائیں.. اور تب بھی اس نہج پر نہ پہنچ سکیں.

نئی نسلیں بڑوں سے پوچھتی ہیں
تباہی کیوں وراثت میں ملی ہے

شوق کا نام آتے ہی, احساس, خلش, اور حالاتِ حاضرہ کی حسرت و یاس, بے بسی, آلام روزگار, پندار ہستی, کسک, چبھن, گھٹن جیسی بیسیوں حساس اکائیاں ابھر کر نظروں کے سامنے رقص کناں ہو جاتی ہیں. شوق صاحب کے یہ اشعار تو زبان زدِ عام ہو چکے ہیں:

وہاں تک ساتھ دے گا وہ ہمارا
جہاں تک دوسرا رستہ نہیں ہے
ضبط شرمندگی سے بہتر ہے
بے خودی بے بسی سے بہتر ہے
کن کے پلے پڑ گئی ہے
شرم آتی ہے حیا کو
چاہتوں کا لحاظ ہے ورنہ
کب کسی میں انا نہیں ہوتی

شوق کے یہاں بھی زندگی کی ان سنگلاخ سچائیوں کو پوری شد و مد کے ساتھ برتا گیا ہے لیکن کیا مجال کہ کہیں احساس کمتری یا ناامیدی کا شائبہ تک گزرے. شعر دیکھئے:

اولوالعزمی اور اعلیٰ تخیل جیسے عظیم خصائل سے مزین شوق ایک سچے اردو ادب کے متوالے ہیں

جہاں میں نام رہتا ہے سدا بندہ نوازوں کا
کسی بھی دور کے قارون کو عزت نہیں ملتی
چاک دل آنکھ نم جگر ٹکڑے
دیکھ لی اے صنم وفا کیا ہے

شوق صاحب اگر چہ روایتوں کے حمایتی رہے ہیں لیکن ان کے ہاں جدتیں بھی خوب نظر آتی ہیں, متروکات سے گریز کرتے ہیں تاہم جس میں حسن دکھائی دے اسے برتنے میں کچھ مضائقہ نہیں جانتے تھے• اس شعر کی خوبصورتی دیکھیئے آپ مجھ سے اتفاق کریں گے:

حق رسی تب ہی کارگر ہوگی
ہم اگر خودسری سے نکلیں گے
چمن کی خستہ حالی کہہ رہی ہے
چمن کا باغباں اچھا نہیں ہے
وقت کی تلخیاں بجا لیکن
آپ ہی اجتناب کر لیتے
مدتوں میں خیال پلتا ہے
شعر یکدم کبھی نہیں ہوتا

اگر شوق انصاری کی تخلیقات کو کتابی شکل دی جائے تو کئی مجموعۂ کلام منظر عام پر آسکتے ہیں اور باقی کتابیں بھی ان شاء اللہ جلد ہی پایۂ تکمیل کو پہنچیں گی. حقیقی خوابوں کو شرمندِ تعبیر ہوتے دیر نہیں لگتی. مجھے یہ سن کر بے حد مسرت ہو رہی ہے. کہ چہارسو وہ پہلا میگزین بننے کا اعزاز لے رہا ہے جو شوق انصاری پر خاص نمبر نکال رہا ہے موصوف کی شاعری میں بلا کی انکساری, عاجزی, خوش مزاجی, بذلہ سنجی, مہمان نوازی, برجستگی اور سچائی جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں انہوں نے کبھی بھی حقیقتوں سے انحراف نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کذابتوں کی تائید کی. یہی وجہ ہے کہ شعر و ادب میں اساتذہ اور متشاعروں کے مابین ادب کی خرید و فروخت کی شدید مخالفت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں. معاشرے کے چنیدہ نازک موضوعات کو باتوں کے قالب میں ڈھال کر ایک ذمہ دار شاعرہ کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری پوری کی ہے۔ انہیں موقع محل کے حساب سے بات کرنے کا فن آتا ہے۔ اور بہت ہی خوبصورت انداز میں قاری کے سامنے وہ اپنا مافی الضمیر اخلاص کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ شوق کے ہاں تنوع ہے، تشبیہات واستعارات وتلمیحات کا استعمال انکے شعری ذوق کی اپج کا تعین کرتا ہے اور یہی امر انہیں اپنے عصر میں نا صرف ممتاز بلکہ اہم مقام بھی عطا کرتا ہے۔

☆

نظم وضبط کا استعارہ

امین جس پوری
(بھارت)

فیس بک پر میرے دائرہء احباب جناب شوقؔ انصاری بڑے منفرد مزاج کے شاعر ہیں۔ بے حد صاف شفّاف خیالات اور دوٹوک بات کہنے والے قلم کار۔ واقعی وہ شاعر سے زیادہ قلم کار ہی ہیں۔ کیونکہ قلم ان کے ہاتھ میں آتے ہی اے کے-47 کا مزاج اختیار کر لیتا ہے۔ شوق صاحب کے مزاج کو سمجھنا بڑا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ میں نے کوئی شعری کاوش فیس بک پر پوسٹ کی تھی۔ جس میں کچھ ان کے مزاج یا معیار یا اندازِ فکر کی نفی کرتی ہوئی بات موجود تھی جس پر شوقؔ صاحب بڑا چبھتا ہو کمینٹ کیا تھا۔ جس کو پڑھ کر میں بھی قدر بدک گیا تھا۔ اگر کسی قاری کا کوئی منفی کمینٹ بھی مجھے رہنما محسوس ہوتا ہے تو میں اس پر کاؤنٹر اٹیک کرنے بجائے اس کے ندازِ فکر کی تہہ تک جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور اس کے تجربات، علم و ادراک سے استفادہ کرتا ہوں۔ لہٰذا میں اسی تجسس میں جناب شوق انصاری صاحب کی ٹائم لائن کا الف تا بے مشاہدہ کیا۔ مجھے محسوس ہوا وہ بے سبب پھنکارتے پھرنے والے ناگ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی تنبیہات یا لہجے کا طنزیہ اسلوب کسی ایسی بے راہ روی کی نشاندہی کرتا ہے جو انسانیت، سماج، ملک، اور عوام کے لئے مضر ثابت ہو سکے یا عوام کے حقوق کی پائے مالی کرتے ہیں۔ بے اصولی، بے ضابطگی، کسی بھی قسم کی بے راہ روی، فرائض سے چشم پوشی، استحصال، حق العباد کو نظر انداز کرنے کے رویّے، گناہوں کی پرورش، ذخیرہ اندوزی کے خلاف احتجاج، اعلیٰ پیمانے پر تقسیم کا غلط نظام، اور ایسی جملہ سماجی برائیوں کے خلاف آواز کا ترجمان ان کے کلام کا ایک ایک لفظ ہے۔ وہ عملی زندگی میں جیسے قناعت پسند ہیں، ان کی سخنوری میں بھی کم سے کم الفاظ پر قناعت پسندی بعض اوقات کنجوسی کی حد میں داخل ہو جاتی ہے۔ اپنے اسی مزاج کے سبب ان کے جملہ کلام میں اختیار کی گئی زمینیں بڑی تنگ، اور پتھریلی ہیں۔ مگر ادبی ورثے میں ملے زبان و بیان کی گراں قدر وراثت نے انھیں مغرور نہیں کیا بلکہ فرض شناسی، حق گوئی اور ترسیل کے حسن سے جو امارت بخشی ہے وہ ہم جیسوں کے لئے قابل رشک ہے۔ وہ زندگی کی ہر سطح پر نظم وضبط کے پابند ہیں۔ کسی بھی قسم کی بدنظمی بے راہروی ان کے مزاج کو مشتعل کر دیتی ہے۔ شوقؔ انصاری کی شخصیت نظم وضبط کا استعارہ ہے۔ احباب سے تعلق نبھانے میں نظم وضبط، گھر میں نظم وضبط، اہل وعیال کی تعلیم تربیت میں نظم وضبط، تحریروں اور سخنوری میں نظم و ضبط، حتّٰی کہ سان پر تراشے ہوئے الفاظ کی نشست اور ضلع لفظی کا نظم وضبط ان کے کلام کو قابل مطالعہ بنائے ہوئے ہے۔ لہٰذا اسی نظم وضبط کی توقع وہ اپنے گرد و نواح میں، فیس بک کے دائرہ احباب، حکمران، افسران، خواتین، اخباری نمائندوں، اور رہبرانِ قوم سے بھی کرتے ہیں۔ نظم وضبط میں جہاں سنجیدگی کا محل نہ ہو وہ وہاں قدم بھی رکھنا پسند نہیں کرتے۔ مجھے شوقؔ انصاری صاحب کا نہ حقیقی نام معلوم ہے نہ ہی یہ معلوم ان کا ذریعہء معاش کیا ہے۔ لیکن بعض اوقات ان سے گفتگو کے دوران یا فون پر مختصر ہمکلامی کے دوران یہی اندازہ ہوا کہ وہ کوئی بڑے کاروباری یا بزنس میں وغیرہ نہیں ہیں۔ معاشرے کے ایک عام فرد ہیں اور قلیل آمدنی کے باوجود ادب، اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ادبی احباب اور مقامی دوستوں کے ساتھ بڑی خوش اخلاقی، کے ساتھ تعلّقات استوار کئے ہیں اور یہ سب اسی نظم وضبط کو زندگی میں اتارے رکھنے کا نتیجہ ہے جو ان کے مزاج کا خاصّہ بن چکا ہے، اسی سبب بے وجہ لفّاظی، فضول حوالے، خودنمائی ان کے مزاج کے بالکل خلاف باتیں ہیں۔

شوقؔ انصاری کی شاعری ہمارے دور میں زبان و بیان اور فکر کے لحاظ سے بڑی انفرادیت کی حامل ہے۔ ان کی غزلوں میں جس طرح کی گہری معنویت ہے وہ ان کے ہمعصروں میں بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ ان کا کلام ان کی ذات کی طرح سادہ، اور تہہ دار ہے۔ ان کے یہاں موضوعات زندگی سے اتنے قریب اور پیوست ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بذاتِ خود انہی کا محور اور مرکز ہیں لہٰذا جب وہ انھیں نظم کرتے ہیں تو ان کی ترسیل قاری تک بڑے موثّر انداز میں ہوتی ہے اور ذہن میں فکر کا ایک عمل مہمیز ہونے لگتا ہے جو ان کی شاعرانہ چابکدستی کا ثبوت ہے۔ علاوہ ازیں ان کی شاعری صاحب اقتدار، حکمراں یا افسران کے قصائد پڑھنے یا ان کو خوش کرنے کی بجائے ان دبے کچلے اور پسمانہ لوگوں کے ذہنوں کی تربیت کرتی ہے جو نہ ظلم اور جبر اور استحصال کے خلاف آواز اٹھا سکتے ہیں اور دنیا بھر کے مسائل کو اپنا مقدّر جان کر زندگی کی چکّی میں پستے پستے سینوں اور ذہنوں میں ناکامیوں نامرادیوں اور حسرتوں کے قبرستان آباد کئے، بروزِ محشر جزا کا یقین لئے عمریں تمام کر جاتے ہیں۔ یقیناً ایسے ادیب اور شعرا کسی ملک میں بہتر فرد اور صحّت مند معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔ کوری جذباتیت سے فرار، سطحی اظہار سے گریز شوقؔ انصاری کی شناخت کے نمایاں عناصر ہیں۔ تخلیقی صداقتوں سے ان کی وابستگی، ذات کے پھیلاؤ سے اندازہ ہوتا ہے عصری زندگی کے الجھے ہوئے احساسات پر ان کی بہت گہری نظر اور گرفت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے وہ یہ جانتے ہیں لاقانونیت، اور طاقت کے بے جا دباؤ سے زندگی اور سماج میں اگر عدم آہنگی پیدا ہوئی تو اس کے نتیجے میں سماجی بحران اور بکھراؤ کی جو صورت پیدا ہوگی اس کو سنبھالنا نہ حکومت کے بس میں بھی نہیں ہوگا۔ لیکن اس صورت سے فرد کو کے بچاتے ہوئے اس کی ذہنی تربیت کی جاتی رہے تو زندگی کی نچلی سطحوں پر جینے کی بجائے معاشرے میں اونچی اڑان بھرنے کے قابل ہوگا اور اور ابدی بلندیوں کی جانب سفر کرتے ہوئے عدم آہنگی کی جڑوں کا کاٹ ڈالے گا اور مضبوط بنیاد پر ایک تندرست معاشرے کی تشکیل کر سکے گا۔ چھوٹی چھوٹی مختصر بحور میں ان کی

پانچ سات اشعار پر مشتمل غزلیں، وہ اپنے کبھی بھی اپنے لئے سستی شہرت یا نام و نمود کے لئے نہیں کہتے بلکہ انھوں نے شاعری کو ہمیشہ مقصدی طور میں لیا ہے ،جس کے ذریعے وہ مظلوم اور ظالموں کے ذہنوں پر ہمیشہ دستکیں دیتے رہتے ہیں۔شوؔق انصاری نہ خود غلط راہ اختیار کرتے ہیں نہ کسی کی غلط روی برداشت کرتے ہیں۔اس لئے اپنا موقف وہ بے جھجک بے محابہ بیان کر دیتے ہیں۔اپنی بات قاری تک سرعت کے ساتھ پہنچانے کے لئے غیر ضروری اصطلاحوں اور پیچیدہ علامتوں کا سہارا بھی نہیں لیتے بلکہ سہلِ ممتنع کے تحت گہری اور گمبھیر باتوں کو اٹھانا ان کی سب سے بڑی انفرادیت ہے۔

شوؔق انصاری کا مزاج اور فکر کی رو ایک خاص رنگ میں ڈھل گئے ہیں۔لہٰذا رومانی کلام کہنے سے انھوں نے دانشتہ تو گریز نہیں کیا ہے،لیکن ایک طرح سے مجرد شاعری زندگی کی تمام حقیقی اور کھردری اہوں پر چل کر احساس کے جو صادق نقش بناتی ہے اس میں الفاظ کی ریا کاری اور کذب گوئی دروغ بیانی، محبوب کی عشوی طرازیوں کے اظہار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ان کا قاری ایک ایسی فضا سے روشناس ہوتا ہے جس میں حقائق خود رونباتات کی طرح ان کی شعری زمینوں سے اگنے کے سبب مشاطگی سے بے نیاز نظر آتے ہیں۔ان کی فکری صداقت ، زبان اور لب و لہجے کی سادگی ان کو ریاکارانہ شاعری سے جدا پہچان عطا کرتی ہے۔

اپنے کلام میں وہ جو مفاہیم نظم فرماتے ہیں بڑے ٹھوس اور مختصر الفاظ میں گندھے ہوتے ہیں۔وہ الفاظ کی قوت کو پہچانتے ہیں لہٰذا شعر نہیں کہتے الفاظ کے کارتوس تخلیق کرتے ہیں۔جن کی زد میں آنے والے الفاظ تلملائے بغیر نہیں رہتے بلکہ بعض اوقات ان مجروح ضمیروں کا رویّہ جارحانہ بھی ہو جاتا ہے۔شوؔق صاحب مصلحتاً خاموشی اختیار کرنا کفر سمجھتے ہیں،منافقت سمجھتے ہیں۔حق گوئی ان کی زبان سے بھیگے ہوئے صابن کی طرح دبانے پر نطق سے باہر جست لگا دیتی ہے۔اسی سبب ان کے کلام کو سانس روک کر بڑے تحمّل سے پڑھنا پڑتا ہے۔ان کی حق گوئی اور بے باکی نے انھیں بڑا انڈر ربنا دیا ہے کیونکہ جو واقعات ان کی شاعری کا محرّک ہوتے ہیں وہ ان کو بڑا چھان پھٹک کر ان کی تہہ میں جا کر حقیقت کا عرفان حاصل کر کے شاعرانہ آسان اصطلاحات اور زود فہم علامتوں کا جامہ پہنا کر نظم کرتے ہیں۔ان کی شخصیت صاف،ضمیر صاف، دل صاف اور کردار حق گوئی و بے باکی سے مملو ہے۔ہر بات کو یا معاملات کو گہرائی سے سوچنا اور برملا کہہ دینا،کم لفظوں میں کم کہنا،لیکن بڑی بڑی تقاریر پر بھاری اشعار کہنے پر جو قدرت حاصل ہے وہ اس دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

☆

- بقیہ -

براہِ راست

اُٹھ کر میرے لیے دروازہ کھولتے۔دیر سے آنے پر کبھی خفا نہ ہوتے بلکہ خندہ پیشانی سے پیش آتے اور ہمیشہ مجھے دعا دیتے۔ان کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میں آج دوست احباب میں یکساں مقبول ہوں۔بیوی کو اکثر یہی گلہ رہتا ہے کہ میں اس کو گپ شپ کے لیے بہت کم وقت دیتا ہوں مگر اسے میں یہ بات کیسے سمجھاؤں کہ ایک شاعر بیوی کا شوہر ہونے کے علاوہ قوم کی بھی امانت ہے۔

☆ اگر کوئی حکومتی ادارہ آپ کی ادبی خدمات کے پیش نظر آپ کو کسی طرح کے انعام،اکرام یا اعزاز کی پیشکش کرے تو آپ کا ردِعمل کیا ہوگا؟

☆☆ حکومت یا کسی حکومتی ادارے سے اگر کسی کو ادبی خدمات کے پیشِ نظر انعام،اکرام یا اعزاز سے نوازا جاتا ہے تو وہ دراصل قوم کی طرف سے ہوتا ہے ورنہ حکومتیں تو آتی جاتی رہتی ہیں اگر زندگی میں کوئی ایسا موقعہ ملا تو ''خوش آمدید'' کہوں گا۔

☆ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وتندرستی اور طویل عمر عطا فرمائے۔آپ کے بعد آپ کے مشن کا علمبردار کوئی نہ کوئی تو ضرور ہونا چاہیے؟

☆☆ سچائی کے مشن کے لیے کسی کا انتخاب قدرت خود ہی کرتی ہے تنقید کرنے والے ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ میرا پوتا ''ارسلان عاقب'' اس مشن کا حصہ بنے گا جو ابھی تقریباً چار سال کا ہے میری تصنیفات کے جملہ حقوق بھی میرے بعد اُسی کے نام ہوں گے۔

☆

تیسری دنیا کا نمائندہ شاعر

شموئل احمد

(پٹنہ، بھارت)

بریخت پوچھتے ہیں کہ کیا ظلمت کے دور میں بھی نغمے گائے جائینگے؟ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ ہاں نغمے پھر بھی گائے جائینگے اور ظلمت کے دور کے گیت گائے جائینگے۔ تیسری دنیا کے عام آدمی کے درد کی ترجمانی کرتی شوق انصاری کی شاعری ظلمت کے اسی دور کی شاعری ہے۔

شوق اعلانیہ کہتے ہیں:

جرنیلوں ججوں اسمبلی ممبران اور
بیوروکریٹس کی بجائے پاکستان کی
سرزمین پر ان بے گھر محنت کشوں کا
حق ہے جن کی محنت کے ستونوں پر
وطن عزیز کی معشیت قائم ہے

ہر ایمان دار تخلیق اپنے عہد کی سماجی اور سیاسی بدعنوانیوں کے خلاف احتجاج درج کرتی ہے شوق انصاری کی شاعری عام آدمی کے اردگرد گھومتی ہے جو دکھ درد اور صعوبتوں کی داستان ہی قلمبند نہیں کرتی بلکہ نظام کے جبر وتشدد کے خلاف زبردست احتجاج بلند کرتی ہے۔

شوق معیار زندگی مت پوچھ
جانور آدمی سے بہتر ہے

شوق انصاری کی غزلوں میں ان عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو عہد حاضر کی غزلیہ شاعری کے لیئے درکار ہیں۔ عصر حاضر کی معاشرتی بے حسی ٹوٹتی قدروں کے ساتھ بدلتا معاشرے کا مزاج جذبات واحسات کی پژمردگی یہ ایسے علائم ہیں جو شوق کے یہاں صرف خارجی سطح پر نظر نہیں آتے بلکہ داخلیت میں جذب تمام ترفن کارانہ صلاحیتوں کے ساتھ شعری اظہار میں آراستہ وپیراستہ نظر آتے ہیں۔

اسے چہرہ بدلنا آ گیا ہے
جسے درپن دکھایا جا رہا ہے
ہماری تنگ دستی کہہ رہی ہے
ہمارا حق چرایا جا رہا ہے

شوق کی غزلیہ شاعری جدید عہد کی سفّاکیوں اور تلخ حقائق کا دستاویز ہیں جن کی پیکر تراشی میں شوق نے فنّی اور لسانی سطح پر شعری روایات سے انحراف نہیں کیا ہے، بلکہ نو کلاسکیت کا جمال شوق کی فنی ترجیہات میں شامل رہا ہے۔ اختلاف کے برملا اظہار میں بھی ان کی غزلیہ شاعری کلاسکی رچاؤ سے آراستہ ہے۔ ایک مخصوص معنویت کی حامل شعری لفظیات اگر جدید غزل کی شناخت ہے تو شوق کی شعری لفظیات ان کی فکری جہت کے اسرار کھولتی ہے اور ان کے شعری اظہار کو معتبر بناتی ہے۔ ''قومی لٹیرے، معشیت، خنزیر، لعنت، جانور، گل دان، بے حسی کے خمار، خصلت ناگوار قومی ناسور، امیر مردہ، روٹی، موت وغیرہ ایسی لفظیات ہیں جو شوق کی بصیرت اور حسّیت کو جدید غزل کی روایت سے سربستہ کرتی ہیں۔

بھوک اتنی چھا گئی ہے
ہم کو روٹی کھا گئی ہے
زندگی کی بے بسی پر
موت بھی شرما گئی ہے

اور تیور دیکھئے

میری خوشبو ہے چمن کے پار بھی
گل نہیں ہوں میں تیرے گل دان کا

اہل اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھتے ہیں

نور سے مستفید ہوتے ہو
پھر بھی ظلمت کی بات کرتے ہو

لیکن شوق صورت حال سے بہت مایوس بھی نہیں ہیں۔

رات کتنی طویل ہو جائے
شوق سورج تو مر نہیں جاتا

تیسری دنیا کے عام آدمی کے درد کو شوق نے اپنی روح کی گہرائیوں میں جذب کیا ہے تب جا کر کہیں اپنے شعری اظہار کو معتبر بنا سکے ہیں۔

بے حسی کے خمار پر لعنت
خصلت ناگوار پر لعنت
شر کے ڈر سے سلام ہے تجھ پر
ایسے جھوٹے وقار پر لعنت
میرے گھر کی فضا سلگتی ہے
تیرے گھر کی بہار پر لعنت
بیش قیمت ضمیر ہے تیرا
قیمت شاندار پر لعنت
خون مفلس کا چوسنے والے
تیرے منھ کے نکھار پر لعنت

نظم قومی ناسور میں اشارہ کرتے ہیں۔

معشیت کے دشمن یہ قومی لٹیرے
اصولوں سے بالا یہاں کے وڈیرے

شوق کی شاعری نعرے بازی کی شاعری نہیں ہے۔ان کی غزلیں کوئی پرچم لہراتی نظر نہیں آتیں۔ان کے ہر شعر میں عام آدمی کا لہولہان چہرہ ابھرتا ہے۔

کم نہیں ہیں کھیت کی ہریالیاں
پر ہماری فصل میں خنزیر ہے

شوق کو احساس ہے کہ

با اثر شر پسند ہے
عدل کی آنکھ بند ہے

اس لیئے کہتے ہیں

اٹھ بغاوت کر
مفلس بے باک

اور یہ کہ

اجارے ہیں وسائل پر
اٹھا ہتھیار حائل پر

بہت ممکن ہے اردو کا الٹ نقاد شوق کی شاعری سے چشم پوشی کی کوشش کرے لیکن شوق تیسری دنیا کے عام آدمی کے دلوں میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔

''سات سروں کا شاعر''

وہ انسان کتنا خوش قسمت ہے کہ جسے قدرت نے کاغذ قلم کی نسبت عطا کیا ہے۔ جسے کاغذ قلم کی نسبت عطا ہوتی ہے اس کے شعور کو حرفِ محبت سے بھی جوڑ دیا جاتا ہے۔فطری طور پر ایسا انسان بہت زیادہ حساس ہوتا ہے۔وہ اپنے اردگرد پیش آنے والے واقعات کو بہت زیادہ محسوس کرتا ہے۔اور چونکہ اسے قدرت نے کاغذ قلم کی نسبت عطا کی ہوتی ہے تو وہ ان واقعات کو اپنے قلم سے کاغذ پر لاتا ہے۔شوق انصاری بھی بہت حساس دل کے مالک ہیں۔انہیں ساغر صدیقی جیسے شاعر کا شاگرد ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ پاکستان میں کوئی بھی واقعہ ہو جائے اس واقعے کو اپنے لفظوں میں ڈھال کر اپنے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں:

حکام سینہ زور ہیں
سب چور ہیں سب چور ہیں
محفوظ کس کی ذات ہے
بدنام یونہی رات ہے

آج کل ہمارے وطن عزیز کے حالات بہت ہی خراب ہیں۔غریب خوشیوں کو ترس گیا ہے۔مہنگائی، غربت اور کرپشن نے غریب آدمی کو زندہ درگور کر دیا ہے۔ان حالات کو شوق انصاری صاحب نے کیسے بیان کیا ہے۔ان کے یہ اشعار دیکھئے:

ہر خوشی نابود ہو جیسے
زندگی بے سود ہو جیسے
یو نکلتے ہیں مرے ارماں
شمع گل کا دود ہو جیسے
خوف کو یوں پوجتے ہیں لوگ
ظلم ہی معبود ہو جیسے

شوق انصاری ہر موضوع پر برجستہ شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ان کی شاعری میں رومانویت کی مٹھاس موجود ہے وہاں یہ ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کا علم بھی بلند کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

حضرتِ چالاک۔۔۔ تیرے منہ میں خاک
امن کی دشمن۔۔۔ جبر کی املاک
تجھ سے کیا امید۔۔۔ خصلتِ ناپاک
پھیلتا کب ہے۔۔۔ دامنِ صد چاک
آستیں کا سانپ۔۔۔ قربتوں پر تاک
بااثر کی شوق۔۔۔ کون کاٹے ناک

ارشاد العصر جعفری

''شاعرِ انقلاب''

شہزادنیرّ (کراچی)

منفردلب ولہجے کا شاعر انقلاب جس کا ایک ایک لفظ مثل آئینہ ہے!
اس کے اشعار کی گھن گرج کی گونج بے حس معاشرے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔

موجودہ دورانٹرنیٹ کا زمانہ ہے خصوصاً فیس بک نے باہمی اور عالمی رابطوں کا جو سلسلہ استوار کیا ہے اس کی مثال دریا کو کوزے میں بند کر دینے کے مترادف ہے۔ بلاشبہ آج فیس بک نے ایسے ایسے قدآور لوگوں کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے جنہیں ہمارے معاشرے کے جابر سماج دشمن نے بونا بنا کر رکھ دیا تھا لیکن اس کے باوجود شوق انصاری اپنی دنیا میں مگن رہتے ہوئے آج بھی اسی لگن اور تندہی سے سفر سخن پر رواں دواں ہیں جو برسوں پہلے انہوں نے اس راہ دشوار پر عزم وہمت سے کمر باندھی تھی۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے اور وہ ہمہ وقت معاشرے کی تباہ حالی اور ظالم حکمرانوں کی دیدہ دلیری سے لوٹ کھسوٹ کا تماشا ہی نہیں دیکھتے بلکہ اپنے قلم اور لفظوں سے نشتر لگاتے ہیں تا کہ گندہ اور فاسد مادہ کسی صورت تو خارج ہو سکے۔ شوق انصاری صاحب فیس بک کی دنیا کے مقبول ترین منجھے ہوئے شاعر ہی نہیں بلکہ پسندیدہ شخصیت بھی ہیں اور ان کا حلقہ احباب عالمی سطح پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ان کے دوستوں میں شامل ہوں اور شعری رموز کے حوالے سے اکثر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ شوق صاحب کا شمار ان لوگوں میں بھی ہوتا ہے جو بلاخوف وخطر آتش جبر و استبداد میں کودنے کا فن جانتے ہیں۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اس کا اظہار لگی لپٹی اور کسی نے ڈر کے بغیر بے دھڑک ہو کر کر دیتے ہیں ورنہ اس زمانے میں صرف شاعر ہونا کوئی بڑی بات نہیں، فنکار قسم کے اور کورے کاغذ کے شاعر قدم قدم پر مل جاتے ہیں۔ میں نے شوق صاحب کے کلام کا ہی نہیں ان کی شخصیت کا بھی بڑی باریک بینی سے مشاہدہ اور تجزیہ کیا ہے۔ وہ شاعر تو ہیں لیکن ایک بہترین نباض بھی ہیں جو معاشرے کی نبض پر اپنا ہاتھ رکھے رہتے ہیں اور اپنے انقلابی اشعار سے علاج کی تدبیر بھی بدرجہ اتم کرتے ہیں۔ مجھے اگرچہ شعر وسخن اور صحافتی میدان میں اترے طویل عرصہ ہو چکا ہے لیکن شوق صاحب جیسی شخصیت مجھے کوئی اور کہیں بھی نظر نہیں آئی جو لحن طرازی شوق انصاری کر رہے ہیں اس میں پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ وہ حکمرانوں کو یہ جانتے ہوئے بھی للکارتے ہیں کہ ان کے سر پر کوئی سیاسی چھتری نہیں ہے اور نہ کسی ایسی شخصیت کا ہاتھ ہے جو انہیں کسی بھی افتاد سے محفوظ اور اپنی پناہ میں رکھ سکے۔ وہ بس کسی دیوانے اور مجذوب کی مانند'' بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا''بس ایک مؤذن کی مثال اذان دینے میں لگے ہوئے ہیں، اب اگر کوئی غفلت کی نیند سے بیدار نہیں ہوتا تو یہ اس کی بدنصیبی ہوگی تو پھر کیا ہو سکتی ہے۔ شوق انصاری صاحب نے ہزاروں کی تعداد میں اشعار کہے ہیں اور یہ سخن طرازی کی تقریباً سبھی اصناف پر طبع آزمائی کرتے رہے ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ یہ شعر گوئی کی ہر صنف میں جادو جگانے کا فن جانتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ فوری طور پر ان کے ذہن میں جو خیالات آتے ہیں یا جس کیفیت کا ان پر غلبہ ہوتا ہے یہ اس کیفیت کو منظوم کر دیتے ہیں۔ ان کی غزلیں، نظمیں اور جدید طرز فکر کا کلام اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

شوق انصاری صاحب اپنے منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ روٹی تو کسی طور کما کھائے ۔۔۔ان کی منہ بولتی تصویر کا مظہر گھرانہ تھا اور اسی ماحول نے انہیں جس احساس کی دولت سے مالا مال کیا۔ ان کی شاعری کی ابتداء بھی کچھ عجب انداز سے ہوئی ہے۔ انہوں نے اوائل جوانی میں ہی زمانے کے نشیب وفراز دیکھے اور ایک حساس طبع ہونے کے سبب یہ شاعری کے میدان میں گود پڑے۔ تاہم آغاز شاعری پر انہیں بعض ایسی مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑا جو عموماً نوآموز شعراء کا مقدر ہوتا ہے۔ ہمارے شعر وادب پر چونکہ خودساختہ ادیب وشعراء کا غلبہ رہا ہے جو نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے حوصلہ شکنی ہی کو اپنی قابلیت گردانتے ہیں۔ دراصل ایسے لوگوں کا مطمع نظر یہی ہوتا ہے۔ نئے آنے والے ان کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ایڑھیاں رگڑتے رہیں اور کچھ سیکھ نہ پائیں۔ نتیجتاً وہ ہمت ہار کر میناد سے راہ فرار اختیار کریں۔ شوق صاحب بھی ایسے ہی تجربات سے دوچار رہے لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور بالآخر انہوں نے اپنے آپ کو منوایا۔ اب یہ فیس بک کے علاوہ بھی دنیا بھر میں ایک انقلابی شاعر کی پہچان کہلاتے ہیں۔ انہوں نے بڑی صعوبتیں برداشت کی ہیں اور زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہی مشاہدہ ان کی شاعری کی اساس ہے۔ انہیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور یہ جن کیفیات کا شکار ہوئے، انہی کیفیات وجذبات نے انہیں شاعر بنا دیا۔ یہ اپنے غصے، جھنجھلاہٹ اور خدمات اور مشاہدات کو''دل برداشتہ'' ہو کر قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ ان کا یہ سفر جاری ہے اور امید ہے کہ یہ بڑی تندہی اور مہارت کے ساتھ اس سفر پر رواں دواں رہیں گے۔

میرے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ میں ان کی شاعری پر کچھ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اپنے اس مختصر سے مضمون میں ان کے منتخب اشعار کا حوالہ نہیں دوں گا اس لیے کہ ان کا ہر شعر، غزل اور نظم ہی ایسی ہے کہ اسے ہر لکھنے والا اپنے انتخاب کے طور پر شامل کرنا چاہے گا۔ میں نے جو کچھ بھی لکھا وہ ان کے زریں و انقلابی خیالات کا احاطہ کرتا ہے کہ ایک بڑے شاعر نے سخن رنگ کس کمال مہارت سے بکھیرے ہوئے ہیں۔ مجھے یہاں ان کی شاعری کے نمونے درج کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ ہم اور آپ روزانہ فیس بک پر ان کے کمال فن پر داد دیئے بغیر نہیں رہ پاتے۔

دلوں کو جوڑنے والا شاعر

جتندر پرواز

(پٹھان کوٹ، بھارت)

فارسی سے اردو میں آئی غزل نے کئی دور دیکھے ہیں۔ جہاں اِس نے پیرفقیروں کی درگاہوں پر سجدے کر کے دُعائیں حاصل کیں وہیں کوٹھے پر طوائف کے پیروں میں بجتے گھنگھروؤں کے ساتھ جنگل بندی کر کے واہ، واہی بھی لوٹی۔ اپنے ماضی میں راج درباروں کی زینت رہی غزل جب دورِ حاضر تک آئی تو اِس نے عام آدمی کے آنسو پوچھنے میں بھی گریز نہیں کیا۔ غزل کے عاشقوں کی کبھی کوئی کمی نہیں رہی۔ اس نازک صنفِ سخن نے اپنے چاہنے والوں کو ستایا بھی ہے اور رلایا بھی ہے۔ لیکن جن شاعروں نے اس ناگن کو اپنے فن کی بین پر نچایا ہے اُن میں شوق انصاری کا نام بھی شامل ہے۔

شوق انصاری اردو ادب کے ایسے شاعر ہے جن کے قاری جتنے پاکستان میں ہیں اُس سے کہیں زیادہ ہندوستان میں ہیں۔ اِن کی جب بھی کوئی تازہ غزل ہمیں ہندوستان میں پڑھنے کو ملتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سرحد پار سے کوئی ہوا کا ٹھنڈا جھونکا آیا ہو۔ وہ اپنی شاعری میں نا تو فضول کی نعرے بازی کرتے ہیں اور نا ہی دلوں میں درار ڈالنے والی کوئی بات کرتے ہیں اُن کی شاعری تو ایسی ہے جیسے کسی نے دِل کے زخم پر اپنے ہونٹوں کے لمس کا مرہم رکھ دیا ہو۔ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات آئے دن کبھی نرم اور کبھی گرم ہوتے رہتے ہے۔ حکومتوں کی باتیں حکومتیں جانے لیکن شوق انصاری سرحد کے آر پار کی فضا میں اپنی شاعری کی خوشبو ایک عرصے سے گھول رہے ہیں۔ وہ دِلوں کو توڑنے نہیں جوڑنے کا کام کرتے ہیں۔

شوق انصاری دو ڈھائی سو برس کی گھسی پٹی علامتوں، استعاروں، تشبیہات اور تلمیہات کو موڈرن طریقے سے پیش کرنے کے ہنر سے اس قدر واقف ہیں کہ وہ جس بھی کسی مفہوم کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ بابا آدم کے زمانے کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی چیزوں میں سے نکل کر دورِ حاضر کی بھاگتی دوڑتی جدید دنیا کا حصہ بن کر اُبھر آتا ہے۔

جس کو پرکھا نہیں کبھی ہم نے
بس وہی ہر کسی سے بہتر ہے

شوق صاحب ہمارے دور کے ایک ایسے شاعر ہیں جو ادب کی عیاریوں اور مکاریوں سے لگ بھگ ناواقف ہیں۔ شاید اسی لئے اُن کو ابھی تک وہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکا جس کے وہ حقدار ہیں۔ خود ایک جگہ شکایت کے لہجے میں لکھتے ہے کہ کسی سرکاری ادارے سے اُنہیں ابھی تک پذیرائی نہیں ملی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اسکے لیئے چاپلوسی اور خوش آمد کے ہنر سے واقف ہونا پڑتا ہے۔ اچھا لکھنا الگ بات ہے اور اپنی مارکیٹنگ کرنا الگ بات ہے۔ کامیاب ہونے کے لیے سام، دام، ڈندھ، بھید کا سہارا لینا پڑتا ہے کیوں کہ جب تک بچّہ نہیں روتا ماں بھی دودھ نہیں پیلاتی تو پھر حکومتوں سے کیسے توقع کی جاسکتی ہیں کہ وہ گھر بیٹھے بیٹھے ہی نوازنے آ جائیں گی۔ اِس کے لئے لوبینگ کرنی پڑتی ہے، تعلقات بنانے پڑتے ہیں۔ کئی جاہلوں کی بھی جوتیاں بھی سیدھی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ خوددار آدمی ضمیر نہیں بیچ سکتا۔

کون سمجھائے بے ضمیروں کو
آبرو زندگی سے بہتر ہے

یہی وجہ ہے کہ ایسے خودداروں کو کبھی بھی اُنکے دور میں پذیرائی نہیں ملی ہے۔ ہمارے سامنے مرزا غالب کی مثال ہے وہ ساری زندگی اپنی خوڈاری کی چادر اُوڑھے غربت میں 'بلّی ماران' کی ایک گلی قاسم جان میں ہی پڑھ رہے اور کچھ لوگ اپنی مارکیٹینگ اور جوتیاں سیدھی کرنے کے ہنر سے تاعمر شاہی ٹھاٹ باٹھ کا لطف لیتے رہے اور وظیفہ خوری کرتے رہے۔ غالب کو 'دبیرالملک اور نجم الدولہ' کی خیرات (جسے ہم خطاب کہتے ہیں) تب ملی جب ایک ناچنے گانے والی ڈومنی کی بادشاہ تک رسائی ہوئی اور اس نے غالب کی سفارش کی۔ وقت بادشاہوں کا بادشاہ ہوتا ہے اور وہ ہی شاعر کا معیار طے کرتا ہے۔ 'نظیر اکبر آبادی' کی عوامی شاعری کی وجہ سے اُس دور کے اردو طبقہ نے انہیں شاعر ہی نہیں مانا، لیکن جب وقت نے کروٹ بدلی تو نظیر لوگوں کے دلوں پر راج کرنے لگے۔

ہر نئی امّید کے ساتھ
صبح کا آغاز ہوں میں

چونکہ شوق انصاری شاٹ کٹ راستوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے اس لیئے وقتی طور پر تو وہ نظر انداز ہو سکتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وقت بدلیگا اور شوق انصاری صاحب کو وہ مقام حاصل ہوگا جس کے وہ حقدار ہیں۔ اپنے دعوے کی دلیل میں اگر شوق صاحب کی گواہی دی جائے تو یہ اپنے وقت کی سب سے معتبر گواہی گردانی جائے گی:

تُو وقت کا فرعون ہے
تجھ کو زمیں پردہ نہ دے

آگے دیکھئے:

جب ملا شوق کھا لیا
خاک وقتِ طعام ہے

مزید دیکھئے:

اجرت بڑھا صدقہ نہ دے
حق دے مجھے کاسہ نہ دے

شعر یکدم نہیں ہوتا

صفیہ حیات

(فیصل آباد)

علم وادب کا دمکتا ستارہ سمندری میں طلوع ہوکراب پوری دنیا میں آب وتاب سے چمک رہا ہے۔محبت کی آبیاری میں اور تلخ سچائیوں کو بیان کرنے میں شوق انصاری ہمیشہ اول رہے۔میرا ان سے تعارف انکی شاعری کی وجہ سے ہوا۔اگر چہ میرے شہر لائلپور سے ان کا تعلق ہے۔ادبی نشستوں میں کم ملاقات رہی۔مگر فیس بک پر روز انکا تازہ اور منتخب کلام پڑھنے کو ملتا رہا۔یوں غائبانہ تعلق پروان چڑھتا رہا۔شوق انصاری کا کلام جب بھی پڑھا۔منفرد پایا۔

انجمن شعور ادب اور بزم فردوس ادب میں اپنی ادبی خدمات پوری تندہی سے انجام دیتے شوق انصاری نے نہ صرف اپنے استاد کا نام روشن کیا۔بلکہ سرحد پار بھی انکی شہرت جا پہنچی۔آج ان کا نام پاک وھند میں یکساں شہرت کا حامل ہے۔انکی شاعری غیر فطری اور مفروضاتی معاملات انسانی کا حصہ نہیں۔بلکہ حساسیت کی آئینہ دار ہے۔انکے قاری اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ انکے ہاں تخلیقی تجربوں میں کتنی سچائیاں پنہاں ہیں۔انھوں نے جس خوبی سے معاشرے کے جبر کو لکھا ہے۔یہ ان کا ہی خاصہ ہے۔حکمت ودانش کے رنگوں سے مزین اشعار دلوں کو چھو کر روح کو معطر کر دیتے ہیں۔وہ قناعت پسندی کا درس یوں دیتے ہیں۔

سوچ میں ترمیم کر لو
جو ملے تسلیم کر لو

شوق انصاری نے سید عبدالستار مفتی سے فیض حاصل کیا۔اور فیض یاب ہو کر ایسے ایسے شہہ پارے تخلیق کئے کہ دنیائے ادب حیرت زدہ رہ گئی۔درویش صفت شوق انصاری نے کبھی اپنی غربت کو علم وشوق کی راہ میں حائل نہ ہونے دیا۔وہ عامیانہ شاعری سے نفرت کرتے ہیں۔اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کو جس خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔بہت کم شعراء ایسے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔وہ جگ بیتی اور آپ بیتی کو شعری قالب میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔انکے ہاں تعمیری وتخلیقی ادب کے ساتھ متصوفانہ وحکیمانہ رنگ بھی ملتا ہے۔خیال کی بلند پروازیاں اوج ثریا پہ اڑان بھرتی نظر آتی ہیں۔تنقیدی انداز بھر پور دکھائی دیتا ہے۔اضطراب اس قدر کہ بے چینی کی کیفیت قاری کے اندر عود کر آتی ہے۔

مدتوں خیال پلتا ہے
شعر یکدم نہیں ہوتا

شوق انصاری دنیا کو بداخلاقی اور غیر منصفانہ تقسیم سے پاک معاشرہ دیکھنا چاہتے ہیں۔یہ ان کا جنون ہے کہ وہ تلخیوں کو بے باکی سے بیان کرتے ہیں۔اور تا مرگ اپنے حصہ کا کام کرتے ہوئے ادب میں نئے نئے شگوفے کھلاتے ہیں۔شوق کے ہاں ادب برائے زندگی پورے جلوے سے پنپتا ہے۔انکے ہاں اختصار کے ساتھ جامعیت کی خوبی بھی ہے۔یہی انکی انفرادیت ہے۔اور یہ شوق انصاری کی سب سے بڑی خوبی ہے۔انکی شاعری کا جائزہ درحقیقت ایسی شخصیت کا ردعمل ہے۔جو مخصوص تہذیبی اقدار کا پیدا کردہ ہے۔وہ اپنی ہمتی جسارت سے دل کی کیفیت کو قرطاس پر منتقل کر دینے میں کامیاب رہے ہیں۔

مجھے اس خبر سے بے تحاشا فرحت ملی۔کہ "چہارسو" وہ پہلا جریدہ ہے۔جو دنیائے ادب کے نایاب ہیرے کی روشنی کو اپنے صفحات کی زینت بنانے جا رہا ہے۔اور خاص نمبر نکال کر انکو انکے عظیم تر ہونے کے گماں میں رکھ کر حیرت ناک خوشی عطا کر رہے ہیں۔

بے باکی اور حق گوئی انکا خاص وصف ہے۔اس خوبی نے انھیں اتنا نڈر بنا دیا ہے۔کہ سچ بولنے اور لکھنے سے نہیں ڈرتے۔وہ سچ کی تلاش میں رہتے ہیں۔اور چھان پھٹک کر شاعری زبان سے ادا کرتے ہیں۔کہ عام قاری بھی انکے طنز اور کڑوی سچائی کو جانے بغیر نہیں رہتا۔

انکے فکروفن اور خیال آفرینی سے مزین اشعار سے انکے قد وقامت کا اندازہ ہوتا ہے۔کہ غربت سہنے والا شاعر شوق انصاری کوئی عام انسان اور لکھاری نہیں۔ایسے شعراء کا انتظار وقت صدیوں کرتا ہے۔

بعض لمحے وہ مجھے ایسی رسائی دیتا ہے
سوچتا ہے وہ اگر مجھ کو سنائی دیتا ہے
چاہتوں میں باہمی تفریق مٹ جاتی ہے شوق
عشق ہم سب کو محبت میں اکائی دیتا ہے

ایسے لاتعداد اشعار ہیں۔جو قاری کو متوجہ رکھتے ہیں تازہ غزل ملاحظہ کیجیے:

حق پرستی کی حمایت ہو گی
تیرے گھر سے ہی بغاوت ہو گی
میں بدل جاؤں تجھے اپنا کر
یہ محبت میں خیانت ہو گی
اپنا حق میں چھین بھی سکتا ہوں
خود ہی دو گے تو عنایت ہو گی
بے سبب اس نے مجھے چھوڑا ہے
کچھ تو اس کو بھی ندامت ہو گی
فیصلہ دو ٹوک بہتر ہو گا
بدگمانی میں قباحت ہو گی
ہم اگر ہیں شوق تو دنیا ہے
ہم نہ ہوں گے تو قیامت ہو گی

ایک تابناک سیّارہ

سالم شجاع انصاری
(اُتر پردیش، بھارت)

''شاعری'' لفظ کے لغوی معنی ''شعر'' کہنے کا علم کے ہیں اور ''شعر'' موزونی کلام یا مقفّی کلام کو کہا جاتا ہے جس کا بالواسطہ تعلق ''شعور'' سے ہے اور ''شعور'' کے معنی سلیقہ، آگہی اور واقفیت کے ہیں اور شعر موزوں کرنے والے شخص کو ''شاعر'' کے نام سے پکارا جاتا ہے لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ شاعر کا شعور سے گہرا تعلق ہے اور شاعر کا شعور مند ہونا لازم و ملزوم ہے۔

''شعور'' ایک خداداد صلاحیت کا نام ہے لیکن ایک عام شخص بھی تعلیم و تربیت اور اچھی صحبت کے سبب شعور حاصل کر سکتا ہے اس کے گرد و پیش کا ماحول بھی اس کے شعور میں اضافے کا باعث بن سکتا ہے۔ چونکہ شعور ہی شاعری کی بنیاد ہے سو ہر لمحہ اس کا اضافہ ایک شاعر کی بہتری کے لیے بہت ضروری ہے۔ شاعری جملوں کی کاشت کاری کا نہیں بلکہ الفاظ کی باغبانی کا نام ہے جس کے ذریعے ایک شاعر کسی بات کو بے حد جاذب اور مؤثر پیرائے میں کہہ سکتا ہے جو ایک نثر نگار کے لیے بہت مشکل امر ہے، شاعری کا سب سے مضبوط پہلو یہ بھی ہے کہ وہ غنائیت سے لبریز ہوتی ہے اور موسیقی کے آہنگ پر گائی بھی جا سکتی ہے جبکہ نثر کے ساتھ یہ ممکن نہیں ہے، ہر لفظ اپنے ردھم پر موقوف ہے اور ہر مصرع کسی نہ کسی آہنگ پر، اسی سبب شاعری کو اسی کے ابتدائی دور سے ہی مقبولیت کا ضامن مانا جاتا رہا ہے اور یہ ایک حقیقت بھی ہے۔

شعر موزوں کرنے کے لیے شاعری کے قواعد دانست یا غیر دانست طور پر لازم ہیں اور شاعر کا اس سے واقف ہونا بہت اہم بات ہے، یہ بات دیگر ہے بہت سے شعرا صرف ذہنی آہنگ یا کسی نغمے کی دھن پر شعر موزوں کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر یہ ایک عارضی طریقہ ہی سمجھا گیا ہے، باقاعدہ طریقہ قواعد کے بغیر ممکن نہیں، شاعری کی قواعد کو ہم علم عروض کے نام سے جانتے ہیں۔ قواعد کا پہلا ستون شعر کی بحر کا تعین ہے جو پہلے سے طے کی جا چکی ہیں اور ان کی تعداد بھی خاصی ہے جن کا ذکر اس مضمون کے لیے طوالت کا باعث ہو سکتا ہے۔ انہیں بحروں کے ارکان پر الفاظ کی نشست کو سجانا شاعری کہلاتا ہے۔

شاعری کے لیے الفاظ کا برمحل استعمال کرنا اور اس کا مضمون کے ساتھ ملحق کیا جانا بھی ایک فن ہے اور یہ فن بڑی ریاضت اور مشاقی کا طالب ہے اور اس فن کے ماہر کو مشاق یا کہنہ مشق شاعر کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ریاضت کا عمل بھی کسی ماہر فن کی نگہ داشت میں کیا جاتا ہے جسے اردو شاعر میں استاد کہا جاتا ہے۔ استاد ہی اشعار کی ترسیل کے دیگر پہلوؤں پر تلمیذ کی نگاہ مبذول کراتا ہے، شاعری میں استاد کی روایت کوئی نئی نہیں بلکہ یہ ابتدا سے ہی جاری و ساری ہے اور بغیر استاد کے شاعر کا مشکوک نگاہ سے دیکھا جانا غلط بھی نہیں ہے۔

اردو شاعری آغاز سے ہی عوام و خواص کو راس آئی اور تفریحِ طبع اور اظہار خیال کا بہترین ذریعہ تصور کی گئی، بہت سے لوگوں کے نزدیک شاعری ایک فاضل عمل بھی ٹھہرایا گیا مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہی رہی اور بالآخر انہیں بھی گپ چپ ہی سہی شاعری پر ایمان لانا ہی پڑا۔ ابتدائی دور میں شاعری میں نظم کیے جانے والے موضوعات میں حسن و عشق، ہجر و وصال، غم و خوشی، خزاں و بہار، نالہ و فریاد، شکوہ و شکایت، وفا و بے وفائی، ملنا بچھڑنا، افلاس و غربت جیسے مضامین نظم ہوئے مگر آہستہ آہستہ نئے اذہان کی طبع آزمائی نے رخ بدلنا شروع کیا اور شاعری کے موضوعات میں تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ شاعری نے ہر عہد کی عکاسی کی ہے اور آج بھی کر رہی ہے مگر آج کی شاعری میں مختلف موضوعات پورے طمطراق کے ساتھ نظم ہو رہے ہیں۔ روایتوں کے بند ڈھیلے ہوتے جا رہے ہیں اور سہولت کا چلن عام ہوا ہے اس سے دونوں طرح کے اثرات شاعری پر مرتب ہو رہے ہیں حالانکہ اب اس کے لیے آسمان زیادہ کشادہ ہو چکا ہے اور زمیں بہت تنگ ہو چکی ہے۔

ایسے دور میں انٹرنیٹ کا ایک موثر ذریعہ عام ہوا جس نے ہر شعبہ میں بہت تعمیری کام انجام دیے حالانکہ اس کے منفی اثرات بھی اس کے مثبت اثرات سے زیادہ عام ہوئے لیکن یہاں اس کا بیان کرنا فضول ہے۔ انٹرنیٹ پر (Facebook) نام ایک ''ذریعہ'' شاعری کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ اس نے دنیا کے شعر فہم اور شعرا حضرات یکجا کر دیئے ہر طرح کے شعرا فیس بک پر اپنے کلام کی تشہیر کرنے لگے اور اہلِ ہنر حضرات تک اپنا کلام پہنچانے لگے۔ اسی ذریعے نے ان شعرا کے کلام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا جہاں تک ان کی رسائی ناممکن تو نہیں بلکہ اس کی حد تک دشوار ضرور تھی۔

(Facebook) پر ہی میری ملاقات ایک ایسے شاعر سے ہوئی جس کا کلام اس بھیڑ میں سب سے الگ اور چمک دار تھا۔ جس کے ہر پہلو سے کہنہ مشقی کی خوشبو آتی تھی اور جو اپنی ہر پوسٹ یا تشہیر سے لوگوں کے دلوں پر ایک انمٹ چھاپ چھوڑ جاتی تھی۔ وہ شخص کوئی اور نہیں جناب شوق انصاری صاحب ہیں۔ شوقؔ انصاری صاحب کے کلام کا خاصہ ان کی بحروں کا انتخاب ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ زمانے کی روش کو امام بنانے کے قائل نہیں اور اپنا راستہ اختیار کرنا انہیں زیادہ عزیز ہے اور کیوں نہ ہو امارت کے لوازمات سے سجی سنوری شخصیت کا یہ عمل ناگوار بھی نہیں ان کے سخن میں فن عروض کی دھمک، تغزل کی چمک، ندرت خیال کی دھنک اور جدت کی کھنک، سبھی کچھ تو ہے پھر اس طرح کا عمل ان پر زیب کیوں نہ دے، ابتدا میں میری نظر جب ان کے کلام پر پڑی تو میں ان کے کلام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ آہستہ آہستہ ان کے کلام کو پڑھنا میری عادت میں شمار ہو گیا۔ شوقؔ صاحب جب اپنا کوئی کلام (Facebook) پر پوسٹ کرتے تو میں ان

کی ہی تجویز کردہ بحر میں شعر موزوں کر کے ان کی پزیرائی کیا کرتا حالانکہ میرا مقصد خود کو عروضی ثابت کرنا نہیں ہوتا تھا بلکہ میں ان کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا اور ایسا کر کے اپنے دم خم آزمانے کی سعی بھی۔ شاید یہی سبب رہا کہ شوؔق صاحب کی توجہ مجھ پر مبذول ہوئی اور یہ مضمون اسی کا نتیجہ ٹھہرا۔ جو تصویر شوؔق صاحب نے اپنی Wall پر چسپاں کی ہے اس کی مناسبت سے یہ یقین ہو گیا کہ یہ انسان مزاجاً متین اور سنجیدہ شخصیت کا مالک ہے اور ان کی آنکھیں اس بات کی چغلی بھی کرتی ہیں۔کم گوئی ان کا وصف ہوگا حالانکہ میری ان سے کبھی روبرو ملاقات نہیں ہوئی ہے اور آئندہ بھی اس کے امکان نہیں ہیں پھر بھی چہرہ شناسی کی بنیاد پر میں نے ان کے مزاج اور شخصیت کو بہت تک سمجھنے کی کوشش کی ہے۔علم عروض کی یہ خاصیت ہے کہ اس کا حصول انسان (شاعر) کو خشک تر بنا دیتا ہے۔ ہندوستان میں درجنوں عروضیوں سے میرے مراسم ہیں اور ان سب میں جو چیز مجھے مشترک محسوس ہوئی وہ یہی خشک پن اب اس کا واضح سبب ہی ہے کہ یہ علم نہایت محنت طلب اور روکھا ہے اور مسلسل توجہ کا طالب بھی۔ لہٰذا شخصیت پر اس کا اثر غالب ہونا فطری بات ہے۔لیکن کچھ ایک خوش نصیب شاعروں نے اس علم کی حد بندی کر لی ہے جس کی بنا پر ان کی یہ خشکی ان کے کلام تک پاؤں نہیں پسار پاتی اور کلام کی غنایت اور چاشنی کو متاثر کیے بغیر اپنا فریضہ پورا کرتی ہے۔ شوؔق صاحب ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں۔

ہندوستان میں جہاں اردو نے اپنی آنکھیں کھولیں اور چلنا پھرنا سیکھا وہاں اب اردو کا معیار پہلے جیسا نہیں۔اس کا سب سے اہم سبب اس کا روزگار سے منسلک نہ ہونا ہی رہا۔ دیگر حکومتوں کے اپنے رویے الگ، بحر کیف جہاں اسے ہونا چاہیے تھا وہاں بھی یہ صحت مندی کے ساتھ نہیں ہے لیکن شاعری کا فن اس کے تحفظ کے لیے آج بھی اسے پناہ دیے ہوئے ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کی زندگی کے لیے یہ خوش آئند بات ہے۔

شوؔق انصاری صاحب جیسے شعرا اب خال خال ہی ہیں ہمیں ان کی پزیرائی کے ساتھ ساتھ ان کی اہمیت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے تا کہ ان کا یہ نایاب ادبی یہ سرمایہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر سکیں اور اپنی زبان اور علوم کو مستقبل کی آنکھوں سے ہمکنار کرا سکیں۔

☆

''شاہ کے مصاحب''

''گلوبلائزیشن'' نے جہاں زندگی کے ہر شعبے پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں وہیں شعر و ادب کی ترسیل میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ دو دہائی پہلے تک ادبی منظرنامے پر کراچی اور لاہور کے بسنے والے شعراء کی حکمرانی تھی اور مضافاتی شعراء کی پہچان بہت مشکل سے بنتی۔ اقبال ساجد، شکیب جلالی، بیدل حیدری، رام ریاض اور مجید امجد کی مثال سامنے کی ہے۔ ایسی بے کمال شاعری کو منظرنامے تک آتے آتے عمریں بیت گئیں اور جانے کتنے اہم نام وقت کی ستم ظریفی اور ناموافق حالات کی بدولت ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئے۔ موبائل پیغامات اور انٹرنیٹ کا یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ بہت سے گوشہ نشین اور اہم شاعر منظرنامے میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ انہیں گوشہ نشینوں میں ایک درویش صفت شاعر شوق انصاری سے میرا پہلا تعارف موبائل فون کے ذریعے ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک منجھے ہوئے اور پختہ کار شاعر ہیں اور شاعری سے متعلقہ علوم پر دسترس رکھتے ہیں۔ شوق انصاری نے معاشرتی ناہمواریوں اور حق تلفیوں پر بہ بانگ دہل احتجاج کرتے ہیں وہ گل و بلبل کے فسانے سنانے کے بجائے عصرِ حاضر کے مسائل کو شعری قالب میں ڈھالتے ہیں۔ وہ دھیمے لہجے میں مصلحت کوشی سے کام لینے کے بجائے ظالم کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اُسے للکارتے ہوئے کہتے ہیں ''شعر شاعر اپنے معاشرے کا آئینہ ہوا کرتا ہے، شوق انصاری اگر یہ کہتے ہیں تو غلط کیا ہے؟ (معاشرتی بے حسی ایک شعر) شوق انصاری کے ہاں مصلحت کوشی منافقت کے زمرے میں آتی ہے۔ اُن کے کھرے، بے لاگ اور دل کو چھو لینے والے اشعار قاری کو بہت جلد جلد گرویدہ بنا لیتے ہیں کیونکہ جن مسائل پر شوق انصاری نے قلم اٹھایا ہے وہ قاری کے اپنے مسائل ہیں۔ شوق انصاری کے بے لاگ اور دبنگ لہجے کی وجہ سے شاہ کے مصاحب اکثر اُن سے نالاں رہتے ہیں لیکن یہ درویش شاعر مجبور اور لاچار لوگوں کی آواز بن کر ظالموں کے خلاف حق گوئی کا علم بلند کیے ہوئے ہے۔ میری دعا ہے کہ حق گوئی کا درس دینے والا رب شوق انصاری کو استقامت عطا فرمائے۔ آمین

عمران جعفر

(لاہور)

''عدل کی ترسیل''

(محترم شوق انصاری کے نظمیہ کلام سے انتخاب)

محمد انعام الحق (اسلام آباد)

بیادِ فاروقِ اعظمؓ

بانیٔ دستورِ محکم
حضرتِ فاروقِ اعظم
ترجمانِ دین و منبر
عدل کی ترسیل گھر گھر
وہ سکوں سازِ جہاں ہے
حکمراں ایسا کہاں ہے
وہ نبی کی آرزو ہے
اس لیے ہی سرخرو ہے
وہ علاماتِ فتوحات
اُن کی قسمت میں نہیں مات
حُسنِ تائیدِ فلک ہے
اُن میں قدرت کی جھلک ہے

○

اے مرے محبوب

مصلحت پر رابطے قربان کرنے سے
الجھنیں بڑھ جائیں گی آسان کرنے سے

تم بدل جاؤ تو پھر تم سے گلہ کیسا
عشق میں بے لوث چاہت کا صلہ کیسا

کیا تردّد ہے کسی کے چھوڑ جانے میں
کون پابندِ محبت ہے زمانے میں

ذہن سے تیری شناسائی نہیں جاتی
بھول جانے کی قسم کھائی نہیں جاتی

بادلِ نخواستہ دل کو شاد کرنا ہے
بس تجھے اب احتیاطاً یاد کرنا ہے

میں نہ کہتا تھا تجھے اقرار مت کرنا
پیار کی ہمت نہیں تو پیار مت کرنا

راحتوں کے نام پر غم کو اچھالا ہے
اے مرے محبوب تو نے مار ڈالا ہے

○

جرم

ہر طرف رسمِ زرپرستی ہے
زندگی قدر کو ترستی ہے
لوگ زیرِ ضیا بھٹکتے ہیں
مرقدوں پر چراغ جلتے ہیں
نذر ہے تو کہیں پہ رشوت ہے
مال رشوت بطور خدمت ہے
جُرم کی رمزمیں سلیقے ہیں
لُوٹنے کے عجب طریقے ہیں
خود نمائی و خود پسندی ہے
ابنِ آدم میں درجہ بندی ہے
رسمِ تضحیک بے تحاشا ہے
عزتِ نفس بھی تماشا ہے
منصبوں کے خمار نے لُوٹا
صاحبِ اختیار نے لوٹا
خود غرض رہنماؤں نے لوٹا
ساختہ پارساؤں نے لوٹا
لوگ وجہِ وثوق لُٹتے ہیں
بے کسوں کے حقوق لُٹتے ہیں
ہم سے منسوب کسمپُرسی ہے
آپکاانتخاب کرسی ہے
زندگی بے امان کٹتی ہے
کچھ کہیں تو زبان کٹتی ہے
ظلم سے آشنا نگاہیں ہیں
شہر ہیں یا کمین گاہیں ہیں
مفلسی ناگوار ہوتی ہے
جرم ہی میں شمار ہوتی ہے
بھوک پر جب شباب ہوتا ہے
جرم کا ارتکاب ہوتا ہے
اُٹھ کہ اب انقلاب لازم ہے
ظلم کا احتساب لازم ہے

○

سیاسی پھکّی

ہو لِیک یا ہو آف شور
ہر روگ کا توڑے یہ زور
کھا کر لگے معصوم سا
آئے نظر مظلوم سا
لکّڑ ہڑپ پتھّر ہڑپ
سارا وطن یکسر ہڑپ
نسخہ مرا ہے کا م کا
خارج کرے گندی ہوا
پھکّی سیاست کی نِگل
انجام سے بچ کر نکل

○

اجارے

معیشت پر اجارہ تو وسائل پر اجارہ ہے
جفاکش کے لیے ہر دم خسارہ ہی خسارہ ہے

تعین اُجرتوں کا بس برائے نام ہوتا ہے
گزر اوقات میں مفلس بہت ناکام ہوتا ہے

اجاروں کے امر جب قوم پر تکمیل پاتے ہیں
تسلط کے مطابق ضابطے تشکیل پاتے ہیں

حقوقِ آدمی یکسر نظر انداز ہوتے ہیں
ضوابط چند لوگوں کے لیے دم ساز ہوتے ہیں

اجاروں میں اجارہ ایک سجادہ نشینی ہے
سیاست اور فرقوں میں یہ حرکت بھی کمینی ہے

فراست سانس لینے کا تقاضا چھوڑ دیتی ہے
صلاحیت گھٹے ماحول میں دم توڑ دیتی ہے

○

عزمِ تعلیم

سیاہی کیوں غریبوں کے سویروں میں
اجالا منقسم کیوں ہے وڈیروں میں
چراغِ علم کو گھر گھر جلانا ہے
ہمیں مفلس کے بچوں کو پڑھانا ہے

گرا کر بت معیشت کی رعونت کے
وسائل عام کرنے ہیں ضرورت کے
تہی دامن کو اس قابلِ بنانا ہے
ہمیں مفلس کے بچوں کو پڑھانا ہے

پسِ پردہ حقیقت کو پرکھنا ہے
شریفوں کی شرافت کو پرکھنا ہے
تعصب کے نقابوں کو ہٹانا ہے
ہمیں مفلس کے بچوں کو پڑھانا ہے

○

ابنِ آدم کی تقسیم

معیشت کے دشمن یہ قومی لُٹیرے
اُصولوں سے بالا یہاں کے وڈیرے

جبلّت میں جن کی سراسر بغاوت
حکومت کے اندر بھی اپنی حکومت

یہ دستور سازی کے مُلکی ادارے
کہاں سو رہے ہیں محافظ ہمارے

علاوہ ازیں چند ایسے گھرانے
جو حق و صداقت کے دُشمن پُرانے

رعونت کے مارے تکبّر کے پیکر
جہالت میں جن کا تمدّن سراسر

کہیں سینہ زوری کہیں پر حماقت
خدائی کے سر پر یہ کیسی قیامت

یہاں بے کسوں کی حفاظت کہاں ہے
تحفظ کہاں ہے شرافت کہاں ہے

گراں نرخ چیزیں تسلسل میں فاقے
کہیں جان لیوا بموں کے دھماکے

عیاں ہر قدم پر درندوں کا منظر
کِیا کِس نے گلشن کو جنگل سے بدتر

کہیں پر گماں ہے کہیں خود پسندی
کہیں پر تعصّب کہیں فرقہ بندی

مِٹائی محبت کی تفہیم کس نے؟
کِیا ابنِ آدم کو تقسیم کس نے؟

○

پروٹوکول

خزانے میں جو دولت ہے
رعایا کی امانت ہے
تو تُو انمول کیونکر ہے
پروٹوکول کیوں کر ہے
بڑی زرخیز ہے مٹّی
کہ زر آمیز ہے مٹّی
تو پھر کشکول کیونکر
پروٹوکول کیوں کر ہے
اگر آزاد ہے ملّت
الگ آباد ہے ملّت
کسی کا رول کیونکر ہے
پروٹوکول کیوں کر ہے

○

عبدالستارایدھی

اوج پر ہر آن ہے ستّار ایدھی
محسنِ انسانیت ہے ستّار ایدھی

وہ سرا پائے فروغِ زندگی ہے
ظلمتوں کے دور میں ایک روشنی ہے

ہر گھڑی زندہ وہی ہر گام زندہ
دہر میں جس شخص کا ہے کام زندہ

خدمتوں کا پاس ہے ستّار ایدھی
بے نوا کی آس ہے ستّار ایدھی

بے کسوں کی شوق جو ڈھارس بنا ہے
اُس پہ راضی ہے نبی راضی خدا ہے

○

ماڈرن مولوی

نہ یتیموں کی نہ بے کس کی بھلائی
فنڈ میں ذاتی مقدر آزمائی

دین میں بہبود کا پیغام کچھ اور
مولوی کچھ اور ہے اسلام کچھ اور

خود نمائی، خود پسندی، جذب و مستی
کفر کی بنیاد ہے فرقہ پرستی

باہمی تفریق کا انجام کچھ اور
مولوی کچھ اور ہے اسلام کچھ اور

مبتلا ہو کر خوشامد کی خطا میں
غیر کو شامل نہ کر رب کی عطا میں

بس یقیں کچھ اور ہے ابہام کچھ اور
مولوی کچھ اور ہے اسلام کچھ اور

○

''رازِ کائنات''

نعتِ رسول ﷺ

ماسوا اُنؐ کے نہیں ہے کچھ بھی رازِ کائنات
مصطفیؐ کی ذات ہی ہے بس جوازِ کائنات

وقت گزرے گا تو ہو گی یہ حقیقت آشکار
عاشقانِ مصطفیؐ ہیں سرفرازِ کائنات

منکشف تھیں سرورِ عالمؐ پہ ساری وسعتیں
کون کر سکتا ہے ورنہ امتیازِ کائنات

مطمئن ہوں میں کہ ہوں محبوبؐ کا اُس کے غلام
خود بنائے میری بگڑی کارسازِ کائنات

وجہِ تکوینِ دو عالم آپؐ ہی آئے نظر
جب بھی ہم نے کھول کر دیکھی بیاضِ کائنات

یہ نہ ہو زندگی بے کیف ہے، بے کار ہے
آپؐ ہی کے عشق سے ہے سوز و سازِ کائنات

ہیں مرے سرکارؐ ہی بس، ہو نہیں سکتا ندیمؔ
اِس جہاں میں دوسرا کوئی مجازِ کائنات

ریاض ندیم نیازی
(سبی، بلوچستان)

سلامِ منقبت

(بحضور امیر المومنین علی ابن ابی طالب)

علی صداقت کی سرزمیں پر اصول فطرت کا آئینہ ہے
ثبوتِ عظمت یہی بہت ہے نبیؐ کی سیرت کا آئینہ ہے
مجھے یقیں ہے کہ لحہ لحہ میں فردِ عصیاں کو دھو رہا ہوں
مرے خدایا یہ ذکرِ حیدرؑ تری عبادت کا آئینہ ہے
زہے مقدر جو کشتِ جاں میں علیؑ کی الفت کا بیج بوئے
کہ فصلِ گل ہے جنوں کا حاصل وہ ابرِ رحمت کا آئینہ ہے
علیؑ کا حرفِ سخن وہ موتی کہ جوہری بھی پرکھ نہ پائے
علیؑ کا طرزِ حیات جیسے کتابِ حکمت کا آئینہ ہے
طلب ہو روٹی کی جس گدا کو اسے وہ بخشے قطارِ ناقہ
کہاں ملے گا علیؑ سا داتا کہ جو سخاوت کا آئینہ ہے
علیؑ کی چوکھٹ پہ جا کے مرنے کی آرزو میں رہیں گے زندہ
یہی تمنا ہے عاشقوں کی یہی تو چاہت کا آئینہ ہے
مری عبادت کا سلسلہ ہے علیؑ کے رخ پر نگاہ کرنا
گلاب زیرِ نقاب جیسے، جو سب کی حیرت کا آئینہ ہے
کوئی تو ہوتا جو اپنے قاتل کی تشنگی کا لحاظ رکھتا!
کہ نفرتوں کی زمیں پہ اب بھی علیؑ محبت کا آئینہ ہے
نجف کی منزل قریب تر ہے بلندیوں پر نظر ہے میری
خوشا یہ کیسا حسیں سفر ہے کہ دل مودّت کا آئینہ ہے
شعورِ مستی کی بھیک آخر علیؑ کے در سے ملی ہے مجھ کو
حسنؔ یہ دیکھا کہ حرفِ سادہ علیؑ کی عظمت کا آئینہ ہے

حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

کھویا ہوا آدمی

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

کراچی سے آرکیٹیکچر کی ڈگری لینے کے بعد میں ماسٹرز کرنے کینیڈا آئی تھی۔یونیورسٹی آف ٹورانٹو میں داخلہ حاصل کر کے میں بہت خوش تھی۔خوش کیوں نہ ہوتی۔۔میرا خواب جو سچ ہونے جا رہا تھا۔ناصر انکل نے میرا بہت ساتھ دیا۔کبھی کبھی میں سوچتی ہوں یہ سب اس لئے ہوا کہ ناصر انکل نے میری سفارش کی تھی۔ناصر انکل ابو کے بہت اچھے دوستوں میں سے تھے،اپنے پورے خاندان کے ساتھ کافی عرصے سے ٹورانٹو میں مقیم تھے۔

ناصر انکل اوران کی بیگم نشاط آنٹی یہی چاہتی تھیں کہ میں ان کے گھر میں قیام کر کے اپنی پڑھائی کروں۔لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کے گھر سے یونیورسٹی بہت دور تھی۔اس سبب سے ناصر انکل نے ابو کو فون پر راضی کر لیا کہ میں انکی پیاری،لاڈلی،چہیتی لیکن بلا کی ضدی بیٹی حانیہ سید یونیورسٹی آف ٹورانٹو کی نزدیکی بلڈنگ کے ون روم فلیٹ میں رہوں اور ویکنڈ ان کے ہاں گزاروں۔ابو کی رضا مندی ملتے ہی معاملات نہ صرف طے ہوئے بلکہ عملی شکل اختیار کر گئے اور میں اکیلے رہنے کے ایڈونچر کے حصول میں بھی کامیاب ہوگئی۔شروع شروع میں مجھے تھوڑا بہت ڈر بھی لگا لیکن پھر میں آہستہ آہستہ عادی ہوگئی۔میرے فلور پر دو فلیٹ پاکستانی لوگوں کے تھے،وہ بھی بہت خیال رکھتے تھے۔

اگر میرے پڑھنے والوں میں کوئی ضدی اور خودسر لڑکی ہوگی تو وہ یہ خوب جانتی ہوگی کہ جب کسی خودسر اور ضدی لڑکی کی ضد پوری ہو جاتی ہے تو وہ فوری طور پر خود احتسابی کے عمل سے دوچار ہو کر ڈپریشن کی کسی نہ کسی صورت سے دوچار ہوتی ہے۔مجھے ابو،امی،بھائی،بہن،رانی بلی،جانِ عالم طوطا،پیڑ پودے،پھول پتے،لان،لان کی کرسیاں،گلاب خان مالی،شہر،شہر کے لوگ،اپنا ملک پاکستان۔۔۔جس سے لوگ مایوس رہتے ہیں لیکن جیسے ہی اس سے دور ہوئے اس سے پیارا کوئی ملک نظر نہیں آتا۔۔۔زور شور سے یاد آنے لگے۔۔۔۔ایسے ہی کسی ہوم سک موڈ میں کلاسوں کے درمیانی وقفے کے دوران ایک بنچ پر بیٹھی میں اندر ہی اندر رو رہی تھی۔

''میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں'' اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔میں یادوں کی دنیا سے باہر آئی اور نظر اٹھا کر دیکھا،بھورے بال،گرین آنکھوں والی ایک نازک اور پیاری سی لڑکی میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''کیوں نہیں'' میں نے بھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراہٹ پھینکی۔

''کرسٹل'' اس نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''حانیہ'' میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا،'' ہم کلاس فیلوز ہیں۔'' میں نے اسے پہچانتے ہوئے کہا۔

''ہاں! ہم ایک ہی کلاس میں ہیں،میں نے تم سے کئی بار بات کرنے کی کوشش کی مگر موقعہ ہی نہ مل سکا۔

''کیا تم یہیں رہتی ہو'' اس نے پوچھا۔

نہیں،میں ماسٹرز کرنے آئی ہوں،میں پاکستان سے ہوں۔

ہم دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے،یونیورسٹی کی باتیں،پروفیسرز کی باتیں،اور اِدھر اُدھر کی بہت ساری باتیں،اس نے بتایا اس کے والد کار ڈیلر ہیں۔ٹورانٹو میں ان کے دو شوروم ہیں،بڑے بھائی رچرڈ نے ایم بی اے کیا ہے وہ ڈیڈ کے ساتھ ہی ہوتے ہیں،چھوٹا بھائی مارک،میڈ (Medicine) پڑھ رہا ہے،اسکا پہلا سال ہے۔موم اور گرینڈ ما گھر میں ہوتے ہیں۔باتوں کا سلسلہ شاید ابھی اور جاری رہتا اگر اس کی دوست شیرن (Sharon) نہ آجاتی۔

''کرسٹل!چلنا نہیں ہے،کتنی دیر ہوگئی ہے۔''

میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی پانچ بج رہے تھے۔''ارے!وقت کا پتہ ہی نہیں چلا'' یہ کہتے ہوئے میں کھڑی ہوگئی۔

''کرسٹل،یہ میری بہت اچھی دوست ہے،شیرن''۔کرسٹل نے کھڑے کھڑے مجھے شیرن سے ملوایا۔

بہت جلد ہم تینوں میں دوستی ہوگئی۔ہم تینوں زیادہ تر ایک ساتھ رہتے،ایک ساتھ لائبریری جاتے،ایک ساتھ کینٹن جاتے،ساتھ ہی اسٹڈی کرتے۔کبھی کبھی شیرن کا بوائے فرینڈ ولیم ہارمن (William Harmon) ہمارے ساتھ ہوتا۔کرسٹل اور شیرن کی اور لڑکوں سے بھی دوستی تھی لیکن میں ان سے ہائے،ہلو تک محدود رہتی تھی۔وہ سب بھی مجھ سے ایک باعزت فاصلہ رکھتے تھے،

شاید میرے حسن کی وجہ سے۔۔۔۔پروجیکٹ کے سلسلے میں بھی کچھ اور لڑکے اور لڑکیاں ہمارے گروپ میں تھے مگر ان سے تعلق صرف یونیورسٹی کی حد تک تھا۔

میرا فلیٹ یونیورسٹی کے نزدیک ہونے کی وجہ سے یہ لوگ اکثر میرے ساتھ آجاتے،ہم ساتھ اسٹڈی کرتے،موی دیکھتے،خوب گپ شپ کرتے۔لیکن تھا ہمارا گروپ چھوٹا سا۔۔۔یونیورسٹی میں ہم تینوں کے اسکینڈل بھی بنتے رہتے۔لیکن سچی بات یہ ہے کہ کرسٹل اور شیرن نے اس اجنبی ماحول میں مجھے بہت اپنائیت دی۔

کرسٹل کی خواہش تھی کہ میں اس کے ہاں نائٹ اسپینڈ (Night Spend) کروں لیکن میں ناصر انکل کی اجازت کے بغیر جانا نہیں چاہتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ منع کر دیں گے۔میں ایک دن کرسٹل اور شیرن کو لے کر انکل کے گھر گئی۔ان دونوں نے ناصر انکل سے خوب باتیں کی،ان کا دل جیت لیا اور

کرسٹل نے انکل سے مجھے اپنے گھر لے جانے کی اجازت بھی لے لی اور یہ بھی وعدہ لیا کہ وہ بہت جلد اپنی فیملی کے ساتھ اس کے گھر آئیں گے۔

اس دن یونیورسٹی سے جلدی فرصت مل گئی اور کرسٹل مجھے وہاں سے اپنے گھر لے گئی۔شیرن بھی ہمارے ساتھ تھی۔کرسٹل کا گھر بہت خوبصورت تھا۔گھر کی ایک ایک چیز سے وہاں کے رہنے والوں کے اعلیٰ ذوق کا پتہ چلتا تھا۔اس وقت اس کے گھر میں صرف اس کی موم اور گرینڈ ما تھیں۔اس نے مجھے ان سے ملوایا۔وہ دونوں ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ حسن اخلاق سے بھی مالا مال تھیں۔محبت اور شفقت کا پیکر۔مجھے ایسا محسوس ہی نہیں ہوا کہ میں ان سے پہلی مرتبہ ملی ہوں۔کرسٹل سے کہے بغیر میں نہ رہ سکی۔''کرسٹل! تمہارا گھر بہت خوبصورت ہے۔''فرنیچر کی سیٹنگ ، ڈیکوریشن ،کلر اسکیم اور پردے وغیرہ سب اپنی جگہ اتنے Perfect کہ محسوس ہوتا تھا جیسے ہر چیز اپنی جگہ مکمل ہے۔کرسٹل نے اٹھ کر محبت سے اپنی ماں کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا''یہ سب موم کے Ideas،موم کی محنت ہے۔اور پھر بولی''ابھی تم نے ہمارا بیک یارڈ نہیں دیکھا،دیکھو گی تو دل خوش ہو جائیگا،بہت خوبصورت ہے۔موم نے پتہ نہیں کہاں کہاں سے درخت اور پودے منگوا کر لگوائے ہیں۔''

''میرا تو وہاں سے اٹھنے کو دل نہیں چاہتا۔''شیرن نے کہا۔

میں نے دیکھا آنٹی کے چہرے پر خوشی جھلک رہی تھی۔

ڈنر پر کرسٹل نے اپنے ڈیڈ رابرٹ انکل،اپنے بڑے بھائی رچرڈ اور چھوٹے بھائی مارک سے ملوایا۔رابرٹ انکل بھی بہت محبت سے ملے۔رچرڈ سنجیدہ اور خاموش طبیعت کا تھا،البتہ مارک بہت خوش مزاج تھا۔کھانا سب نے بڑے خوش گوار ماحول میں کھایا سب نے خوب باتیں کیں،رابرٹ انکل نے کھانے کے دوران لطیفے بھی سنائے۔ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ان لوگوں کو برسوں سے جانتی ہوں۔کرسٹل اکثر مجھے اپنے گھر لے جاتی،اور مجھے بھی اس کے گھر جا کر بڑی اپنائیت کا احساس ہوتا۔

وقت کچھ زیادہ ہی تیزی سے گزر گیا۔میں ائرپورٹ کی لابی میں کھڑی تھی اپنے گھر،اپنے پیارے ملک پاکستان جانے کے لئے۔میری پڑھائی مکمل ہو گئی تھی۔میں بہت خوش تھی لیکن ساتھ ساتھ اپنے دوستوں سے بچھڑنے کا غم بھی تھا۔سب لوگ مجھے چھوڑنے آئے ہوئے تھے یونیورسٹی کے ساتھی،ناصر انکل ان کی فیملی،کرسٹل اسکے ڈیڈ،موم،اس کا چھوٹا بھائی مارک یہ سب میرے پیارے تھے،مجھ سے محبت کرنے والے تھے اور جہاں میں جا رہی تھی وہاں بھی سب میرے اپنے،میرے پیارے تھے۔میں سوچ رہی تھی،کچھ دیر بعد میں جہاز میں سیٹ پر ہوں گی۔یہ سب کیا ہے۔۔؟ کیسا ملنا ہے۔۔۔کیسا بچھڑنا ہے۔۔۔دونوں آپس میں جڑے ہوئے اور دونوں ہی کے اندر بچھڑنے کا غم اور ملنے کی خوشی۔۔۔

پاکستان آنے کے بعد بھی ہم لوگ فیس بک پر، whatsapp کے ذریعے دیر دیر تک باتیں کرتے رہتے۔پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلے کم ہو گئے۔میں نے جوب شروع کر دی،کرسٹل بھی جوب میں مصروف ہو گئی،شیرن نے ولیم سے شادی کر لی اور یہ لوگ انگلینڈ چلے گئے۔سب اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہو گئے تھے۔

میں یعنی ابو کی بے حد لاڈلی اور ضدی بیٹی۔۔۔۔نے بھی اپنے آپ کو شادی کے بندھن میں جکڑ والیا۔ناصر انکل میرے سسر یعنی بابا ہو گئے اور نشاط آنٹی میری ممی ہو گئیں اور وقت نے ایک مرتبہ پھر'ٹورانٹو'(کینیڈا) پہنچا دیا،اس مرتبہ بغیر کسی ضد کے۔۔۔

ایئرپورٹ پر خاصے لوگ جمع تھے،دولہا دلہن کے استقبال کے لئے۔میری نگاہیں کرسٹل کو تلاش کر رہی تھیں،اسکی فیملی میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا،میری آنکھیں خالی خالی سی رہ گئیں۔اس نے مجھے شادی کی مبارکباد بھی نہیں دی اور یہ تو ناممکن ہے کہ ناصر انکل نے اسے نہ بتایا ہو۔۔۔میں سوچ رہی تھی۔

جیسے ہی مجھے فرصت ملی،میں نے شیرن کو ای میل کیا اور کرسٹل کے خلاف شکوہ کیا کہ اس نے میرے ٹورانٹو آنے کو وقعت نہیں دی۔

شیرن نے میری ای میل کے جواب میں یہ جانکاہ خبر بھجوائی''کرسٹل،اسکے موم،ڈیڈ اور مارک گاڑی میں آ رہے تھے،ہائی وے پر ایکسیڈنٹ ہوا،کرسٹل،اسکی موم اور مارک جائے حادثے پر ہی فوت ہو گئے۔رابرٹ انکل معجزاتی طور پر بچ گئے۔میرا خیال ہے تمہارے لوگوں نے تمہارے صدمے کا سوچ کر اس ٹریجڈی سے تمہیں لاعلم رکھا ہوگا۔''

پڑھنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھ میں جان ہی نہیں ہے،دنیا میرے سامنے اندھیری تھی آنسو تھے کہ میری آنکھوں سے امڈے چلے آ رہے تھے۔کرسٹل کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔۔۔یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔؟

پھر مجھے رابرٹ انکل کا خیال آیا،انہوں نے خوب شراب پی ہوئی ہوگی اور نشے کی حالت میں گاڑی چلا رہے ہوں گے،اسی سبب سے یہ حادثہ پیش آیا ہوگا۔۔۔مجھے رابرٹ انکل پر بہت غصہ آ رہا تھا۔لیکن بعد میں شیرن کی دیگر ای میلز سے پتہ چلا کہ گاڑی مارک چلا رہا تھا۔حادثہ جیسے تقدیر کا لکھا تھا،اس میں کسی کا کوئی قصور نہ تھا۔سامنے والی گاڑی اچانک گول گھومی اور ان کی کار سے ٹکرا گئی۔۔۔اور یہ حادثہ پیش آ گیا اور ایک حیران کن بات یہ ہے کہ رابرٹ انکل حادثے کے بعد سے لاپتہ ہیں۔رچرڈ نے انہیں بہت تلاش کیا،انشورنس والے بھی ان کو ڈھونڈتے رہے لیکن ان کا کچھ پتہ نہ چلا۔

میں نے ناصر انکل سے اس حادثے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا ہم نے ٹی وی پر دیکھا تھا۔اس کے بعد دو تین دفعہ کرسٹل کے گھر پر فون کیا،کوئی فون نہیں ریسیو کرتا ہے۔تم سے بتانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ٹورانٹو میں بابا(ناصر انکل) ریٹائرمینٹ کی زندگی گزار رہے ہیں،

وہ اور ممی (نشاط آنٹی) دونوں ہی مجھ سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ زندگی اس برف ملک میں بھی دائمی بہاررت میں بدل گئی ہے۔ یہاں پر میں ایک غیر ملکی کنسٹرکشن کمپنی میں انجینئر ہوں۔ جوب کے ساتھ ساتھ ایک سماجی ادارے کے ساتھ شامل ہو کر لوگوں کی دعائیں سمیٹتی پھرتی ہوں۔

جنوری کے مہینے میں، ایک دن میں اپنی ٹیم کے ساتھ بے گھر (Homeless) لوگوں میں کمفورٹرز، گرم کپڑے اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں تقسیم کرنے ڈاؤن ٹاؤن گئی۔ سخت سردی کی وجہ سے وہ لوگ چھپے ہوئے تھے یوں بھی یہ لوگ اپنی جگہیں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔

ایک بڑی سی بلڈنگ کے شیڈ کے نیچے کی طرف کچھ لوگ پڑے رہتے تھے۔ اس دن وہاں بھی سوائے چار لوگوں کے کوئی نہ ملا۔ ایک لڑکا جو جینز پہنے تھا جو جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اوپر میلا سا ایک جیکٹ پہنے دیوار سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا، شاید نشے کا۔۔۔ اور اسکے برابر اس سے ٹیک لگائے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ بڑی مشکل سے میں یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوئی کہ وہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ اور جب ہماری ٹیم کی ایک لڑکی نے اس سے پوچھا کہ وہ دونوں یہاں کیوں رہتے ہیں۔ تو لڑکی اٹھ کر چلی گئی اور لڑکا خاموش سگریٹ پیتا رہا۔ ان لوگوں میں سے اکثر کسی کی بات کا جواب نہیں دیتے، کوئی بات پوچھو یا کوئی سوال کرو تو وہاں سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔

ہم لوگ بہت تھک گئے تھے، کچھ لوگ ہم میں سے ریسٹورنٹ چلے گئے۔ میں اور میری دوست ہم دونوں ایک بلڈنگ میں تھوڑی دیر ستانے بیٹھ گئے۔ شیشے سے باہر کا سارا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ میری نظریں ایک عجیب شخص پر مرکوز ہو گئیں سر پر بالوں کا جھپڑ (اتنی سردی کے باوجود سر پر کوئی ٹوپی، کوئی ہیٹ نہ تھا۔) بڑھی ہوئی ڈاڑھی جس کی وجہ سے چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا آنکھوں میں گہری مایوسی، کالی پینٹ جس پر دھول مٹی کے نشان لگے ہوئے، براؤن رنگ کا چمڑے کا جیکٹ اور کالے رنگ کا مفلر گردن میں لپیٹے ہوئے۔ پیروں میں بہت پرانے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ وہ شخص بار بار، فٹ پاتھ پر چل کر کافی دور تک جاتا پھر واپس آتا، اپنے آپ میں مسکراتا رہتا، آنے جانے والے کی آنکھوں میں دیکھتا اگر وہ اس سے آنکھیں ملاتا تو خود مسکراتا اور اس سے ہاتھ ملاتا۔ کوئی ہاتھ ملا کے چلا جاتا، کوئی اس کے ہاتھ پر کچھ پیسے رکھ دیتا، وہ کھڑا ہو کر دیر تک پیسوں کو دیکھتا پھر پیسوں کو جیب میں ڈال لیتا۔ بڑی دیر سے میں اس شخص کی حرکتوں کو دیکھ رہی تھی، تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص کہیں غائب ہو گیا۔ میں بار بار یہی سوچ رہی تھی ''کتنا عجیب آدمی تھا۔''

شام ہونے لگی تھی، سارے لوگ اکھٹے ہوئے اور واپسی کا ارادہ کیا۔ چلتے چلتے ہم نے سوچا کہ ایک بار پھر بلڈنگ کے شیڈ میں نیچے کی طرف چکر لگا لیں، ابھی بھی ہمارے پاس کافی سامان بچا ہوا تھا۔ ہمارا اندازہ صحیح نکلا، وہاں خاصے لوگ موجود تھے، شاید شام ہونے کی وجہ سے اور سرد رات سے بچاؤ کی خاطر وہ اپنے ٹھکانوں میں پہنچ گئے تھے۔ سب نے جلدی جلدی لوگوں میں،، سامان تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ میں، کمفورٹر، کچھ گرم کپڑے اور کھانے پینے کی چیزیں دینے کے لئے اس شخص کی طرف بڑھی، وہ دیوار سے ٹیک لگائے خلاؤں میں گھور رہا تھا، (بے سروساماں) ''یہ آپ کے لئے کچھ گرم کپڑے وغیرہ۔'' اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ''ارے یہ تو وہی شخص ہے جو فٹ پاتھ پر چکر لگا رہا تھا۔ وہی کھوئی کھوئی اداس آنکھیں۔۔۔'' میں نے کمفورٹر کھول کر اس کے پاؤں پر ڈالا اور باقی چیزیں اس کے پاس رکھ کر جانے لگی۔ ''یہ کیا چیزیں ہیں۔؟'' میرے بڑھتے قدم رک گئے۔ ''یہ آواز تو جانی پہچانی ہے۔''

میں مڑی اور نزدیک جا کر اس شخص کو پہلی بار غور سے دیکھا، ''رابرٹ انکل'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

میں ان کے پاس بیٹھ گئی، ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور میں رو رہی تھی، میرے سامنے اور میرے چاروں اور رابرٹ انکل ہی رابرٹ انکل تھے۔۔۔، میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، ڈائننگ ٹیبل پر لطیفے سناتے ہوئے، مجھے بے حد قیمتی گھڑی تحفے میں دیتے ہوئے، کرسٹل کا، میرا اور شیرن کا تینوں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر یہ کہتے ہوئے ''میری ایک نہیں تین بیٹیاں ہیں۔'' شراب زیادہ پینے پر آنٹی سے ڈانٹ سن کر مسکرا کر یہ کہتے ہوئے ''اچھا بھئی معاف کر دو آئندہ خیال رکھونگا''۔ ایئر پورٹ پر میرے سر پر ہاتھ رکھکر یہ کہتے ہوئے ''ہم بہت جلد اپنی بیٹی سے ملنے پاکستان آئیں گے۔۔۔

- بقیہ -

دستک اُس دروازے پر

المیہ ہے کہ روشنی کے صرف ایک زاویے سے متن کو دیکھتے ہیں لہٰذا انہیں صرف ایک معنی دکھائی دیتا ہے۔ دوسری طرف امتزاجی نقاد متن کو متعدد ترچھے زاویوں سے مَس کرنے پر قادر ہوتا ہے لہٰذا معنوی پرتوں کو وجود میں لاتا ہے۔''

انسانی شعور کا عالمی تاریخ اور قبل از تاریخ کے تناظر میں علمی سطح پر اتنا گہرا مطالعہ اور اس کا مکمل ادراک اس سے پہلے اردو زبان میں (میری معلومات کی حد تک) یقیناً کم یاب ہی نہیں بلکہ نایاب بھی ہے جس کے سبب آج بیس سال گزر جانے کے بعد بھی نہ تو اس کی اہمیت کم ہوئی ہے اور نہ ہی اس کے چاہنے والے کم ہوئے ہیں۔ پوری کتاب مونو لاگ کی صورت (من و تو) کے مکالمے سے اس طرح مزین ہے کہ پڑھنے والا اختتام تک اپنی دلچسپی برقرار رکھتا ہے:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

''پیج ندی کا مچھیرا''

صادقہ نواب سحر
(مہاشٹرا، بھارت)

دھوپ چڑھے پیج ندی کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دھوپ سے گہرائے گہرے سانولے رنگ کے مرد بارود کو آگ دِکھا کر ندی میں پھینک رہے تھے۔ پَھٹ پَھٹ کی آوازیں آس پاس کے گاؤں میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ جمعرات کا دن تھا۔ مہادُو آج ذرا دیر سے ندی پر پہنچا تھا۔ وہ اپنے گاؤں کی ایک دوکان سے پانچ انچ لمبے بارود کے رول کے تین ٹکڑے کر کے کپڑے کی چھوٹی سی تھیلی میں لایا تھا۔ یہ چھوٹے بم وہیں آس پاس کے گھروں میں بنائے جاتے تھے اور کوئی سوا سو ڈیڑھ سو روپیوں میں بڑی آسانی سے مل جاتے تھے۔

مہادُو نے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی کپڑے کی تھیلی کو دونوں پیروں کے پنجوں کے درمیان دبایا۔ ہونٹوں میں بیڑی پھنسا کر ماچس کی تیلی سے سلگایا۔ جُھک کر دائیں ہاتھ سے تھیلی میں سے بارود کا ایک ٹکڑا نکالا۔ ہونٹوں کی سُلگتی بیڑی کو بائیں ہاتھ میں لیا۔ دائیں ہاتھ میں پکڑے بارود کے فیتے کو آگ دکھائی اور سُر سُراتے ہوئے بارود کو پُھرتی کے ساتھ ندی میں پھینک دیا۔ پانی کی لہروں میں ''پَھٹ پَھٹ'' کی آواز کے ساتھ ڈھیر ساری مچھلیاں اچھلیں اور پانی کی سطح پر مَری ہوئی مچھلیاں دکھائی دینے لگیں۔ مہادُو نے مچھلیوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا۔ پانچ چھ انچ کی بڑی مچھلیاں اُس نے آسانی سے پانی کی سطح سے سمیٹیں اور کمر میں اُڑسے ہوئے ایک تھیلے کو نکال کر اس میں بھر لیں۔ پھر کمر کمر پانی میں اتر کر ندی کی اُتھلی سطح سے اور مچھلیاں نکال نکال کر کنارے رکھے اپنے سامان کی طرف پھینکنے لگا۔ اب تک کچھ مچھلیاں ندی کے پانی میں تڑپ اور اچھل رہی تھیں۔

ندی کے تین حصوں میں مہادُو نے اسی طرح بارود لگا کر مچھلیاں اکٹھا کیں اور تھیلے میں بھر لیں۔ دوپہر کے تین بج چکے تھے۔ مہادُو نے آسمان کی جانب دیکھ کر اندازہ لگایا۔ صبح پی ہوئی تھوڑی سی دیسی شراب کا نشہ اتر گیا تھا۔ اس نے مچھلیوں سے بھرا ہوا تھیلا اٹھایا اور اپنے بائیں کندھے پر ڈال لیا۔

ممبئی سے تقریباً سو کلومیٹر کی دوری پر سینٹرل لائن پر لوکل ٹرین کا آخری اسٹیشن کرجت ہے۔ کرجت سے پندرہ کلومیٹر دور نسرا پور گاؤں تینوں طرف ندیوں سے گھرا ہوا ہے۔ ایک جانب اُلہاس ندی دھیمی رفتار سے بہتی رہتی ہے اور دوسری جانب پیج ندی کی رفتار کچھ زیادہ ہے۔ پیج ندی میں خوب مچھلیاں ہوتی ہیں۔ نسرا پور کے تیسری جانب یہ دونوں ندیاں ملتی ہیں اور اچھی خاصی رفتار کے ساتھ ایک ہو کر بہتی ہیں۔ اُلہاس ندی سے مِل کر پیج ندی اپنا نام کھو دیتی ہے۔

مہادُو پیج ندی کے کنارے 'واکس' گاؤں سے لگی ہوئی 'واکس واڑی' میں رہتا تھا۔ اِس علاقے میں چار باڑیاں ہیں۔ واکس، کلمبولی، سالوڑ اور ایکسل۔ چاروں قریب قریب ہیں۔ یہ جنگلاتی علاقہ ہے۔ مہادُو اِسی طرح مچھلیاں پکڑ کر شام کو نیرل کے بازار میں بیچنے چلا جاتا تھا۔ 'واکس واڑی' قریب پچیس گھروں سے آباد تھا۔ وہاں کے لوگ لکڑی کی پتلی ڈالیوں سے گھر بناتے ہیں اور اس پر گوبر لیپتے ہیں۔ اِن سیدھے سادے آدی واسی قبائلیوں کو قدرت کی گود میں ہی سکون ملتا ہے۔

صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ مہادو باکس کے رِکشہ اسٹینڈ کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ سیاہ بال دُھول سے اٹے ہوئے۔ تبھی ایک لڑکا کالج کا بیگ کندھوں پر لٹکائے ٹیبل کی طرف بڑھا۔ مہادو نے اسے شوق سے دیکھا۔ لڑکا اس کے پاس نہیں بیٹھا۔ اُسے شراب کی بُو سی محسوس ہوئی تھی۔ پیچھے دو ٹیبل چھوڑ کر بیٹھا۔ ناشتہ ختم کر کے لڑکا کاؤنٹر پر پہنچا۔

''کتنے ہوئے؟''

''وڑا پاؤ اور چائے۔ بیس روپئے۔''

''پرس بھول آیا ہوں بھائی! کل لا کر دے دوں گا۔'' وہ لڑکا کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے ہوٹل والے سے دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا

''کھانے سے پہلے دیکھ لینا منگتا تھا نا!''

''معاف کرو۔ غلطی ہو گئی بھاؤ۔''

''تیرے جیسا بہت دیکھیلا ہے۔'' ہوٹل والے نے کہا، ''سیدھے سیدھے پیسے نکال۔ نہیں تو جانے نہیں دوں گا۔ سمجھتا ہے کیا خود کو!''

''کالج جانے کی جلدی میں نکل گیا بھاؤ! پرس بھول گیا تھا۔ کل پکّا چُکا دوں گا۔''

''ایسا نہیں چلنے والا۔ ایڑا سمجھا ہے کیا؟''

''نہیں نہیں بھاؤ، بہت غلطی ہوئی۔''

''کائے کا بھاؤ!''

''مازے کتی زالے؟'' مہادو لڑکے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکا ذرا دور ہٹ گیا۔

''وڑا پاؤ چائے۔ بیس روپئے۔''

''ہے گھے چالیس روپئے۔ یاچے پَن گھے۔'' (یہ لو چالیس روپئے۔ اس کے بھی لے لو۔) مہادو نے لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا اور پیسے دے کر جلدی سے ہوٹل کے باہر آ گیا۔

''میں تم کو کل پیسے لا کر دے دوں گا۔ کہاں ملو گے؟ کل اِسی وقت اِسی جگہ ملو گے؟'' لڑکا تیزی سے مہادو کے پیچھے باہر آیا تھا۔

مہادو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

''دیکھو بھاؤ!''

مہادو نے پلٹ کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں پہچان کی چمک تھی۔ اُس نے سوچا، ''اِسے تو یاد بھی نہیں کہ گاؤں کی شالا میں ہم دونوں

ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔میں کِدھر رہ گیا...اور یہ..!''

'کوئی بات نہیں' کے انداز میں دایاں ہاتھ اُٹھا کر اپنے کان تک لایا۔انگلیوں کو جھٹکا اور چپ چاپ نکل گیا۔

سالوڑ کے قریب جامن کے گھنے پیڑوں کو لگی ہوئی سڑک کے کنارے زمین پر مہادوُ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔آج بازار میں مچھلیوں کی فروخت اچھی ہوئی تھی۔دونوں نے خوب پی تھی۔مہادو نے ٹین کے خالی ڈبّے کے ٹھوکر سے اڑائے جانے والی آواز سے اپنی سُرخ سُرخ آنکھیں کھول دیں۔کالج جاتے ہوئے لڑکے نے اسے آواز دی، ''او بھاؤ! اُدھر جھاڑ کے نیچے سوؤنا!''

''تُجھیا باپا چا کائے جاتواے رے سالا؟ (سالا تیرے باپ کا کیا جاتا ہے بے...؟)، مہادو نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے اسے گالی دی۔

''ارے! یہ تو وہی ہے۔ وڑا پاؤ چائے کے پیسے دے دوں؟''، لڑکے نے پہچانا۔

''مگر اِس پر تو نشہ سوار ہے۔''لڑکا بُدبُدایا اور جلدی سے سڑک پار کر کے وہاں سے نکل گیا۔

شام کو مہادوُ جب اپنے چھوٹے سے جھونپڑے میں لوٹا تو اُس کے پاس پیسے برائے نام ہی بچے تھے۔اس نے دال چاول کے علاوہ کچھ گھریلو سامان سے بھری ہوئی تھیلی اپنے صاف سُتھرے جھونپڑے میں ایک طرف رکھ دی۔

''ایوڑھیا اُشیر؟'' (اِتنی دیر لگا دی؟)، اس کی بیوی نے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔مہادو کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن اس کی زبان لڑکھڑائی اور وہ سنبھل کر ایک ہاتھ زمین پر رکھ کر پاس پڑی چٹائی پر لیٹ گیا۔

اُس کی دُبلی پتلی، اُسی کی طرح چھوٹے قد اور رنگ روپ والی بیوی پدما نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُسے سہارا دیا اور پوچھا، ''جے اُون گھے چل، بکریا چا مٹّن بنوَلَے'' (کھانا کھالے۔بکرے کا مانس بنایا ہے)

''ہو، جیبھ، ماسے، گھر چا انگنا تلی کومبڑی آنی رانٹی سسایا پیکشا ویگلی مجاما گت ہوتی'' (ہاں، جیبھ مچھلی، گھر کی آنگن والی مرغی اور جنگلی خرگوش سے الگ مزا مانگ رہی تھی) وہ کہنا چاہتا تھا لیکن نیند اور نشے میں زبان نے لفظوں کا ساتھ نہ دیا۔مہادوُ نے کروٹ لے کر بیوی کی جانب دیکھا۔مسکرایا اور پوچھا،

''پورگا کُٹھے ہائے؟'' (بچّہ کہاں ہے؟)

پدما نے اشارہ کیا۔مہادوُ نے مِچمِچاتی ہوئی آنکھوں سے دوسری چٹائی پر سوئے ہوئے بچّے کو دیکھا اور کچھ بڑبڑاتا ہوا نیند کی گود میں چلا گیا۔

پدما نے جھونپڑے میں بنی لکڑی کی پھلی پر رکھے مِٹّی کے ٹِمٹِماتے ہوئے دِئے میں اُس کے پاس رکھی بوتل سے تیل اُنڈیلا۔کمرے میں روشنی بڑھ گئی۔سرکار گھر کُل کی اسکیم کے تحت گھر اور شوچالیہ بنانے کے لئے پیسے دیتی تھی۔پیسے تو انہوں نے لے لئے تھے۔لیکن یہ اپنے پرانے گھروں میں ہی خوش رہتے تھے۔پیسے تو کب کے خرچ ہو چکے تھے۔

پدما نے جھونپڑے کے کنارے چھت سے لٹکتے چھینکے میں دودھ کا برتن رکھ دیا۔وہ بھی آج دیر سے لوٹی تھی۔کمر سے پِنڈلی تک بندھی گول ساڑی پر لپیٹا ہوا تولیہ نکال کر اس نے دیوار سے بندھی رسی پر ٹانگ دیا۔بلاؤز کے اوپر سینے پر ساڑی کے پلّو کے بجائے دوپٹّے کی طرح اوڑھے ہوئے تولئے کو خود سے الگ کر کے بچے پر اڑھا دیا اور مٹی سے پُتی ہوئی زمین پر بیٹھ کر برتن میں کھانا نکال کر اکیلے ہی کھانے لگی۔

پدما ایک کواری میں کام کرتی تھی۔پیسے والے لوگ پہاڑ خرید لیتے اور اُسے بارود سے پھوڑ کر عمارتیں بنانے کے لئے ٹھیکیداروں کو بیچ دیتے۔دھیرے دھیرے اس پتھر کے کان والی زمین استوار ہوتی جاتی۔یہاں فارم ہاؤس بنتے تو ان کی دیکھ بھال کا کام بھی کسی نہ کسی آدی واسی پریوار کو مل جاتا اور ان کی زندگی 'روز کنواں کھودو، روز پانی پیو' والی چاکری سے چھوٹ جاتی۔موسم کے مطابق کچھ قبائلیوں کو پھل بیچنے یا باغبانی کے کام بھی مل جاتے تھے۔ویسے ان کو مہینے کی تنخواہ والے کام پسند نہیں ہوتے۔یہ لوگ گاؤں کے بڑے لوگوں کے پاس کام کرتے ہیں۔ندی کی ریت گھمیلے میں بھر کر اینٹ بنانا، ریت چھلنی میں ڈالنا جس سے ریت سے بڑے پتھر الگ ہو جائیں، ٹریکٹر میں بھرنا..بس اِسی طرح کے کام کرتے۔دن بھر کی کڑی محنت کے بعد شام کو انہیں کھانے پینے کی کچھ چیزیں اور پیسے مل جائیں تو وہ خوش رہتے۔کل کی بھی نہیں سوچتے۔اِن کو روز پیسے چاہئیں۔آج کا کام ختم، آج کا پیسہ ختم..جس دن اچھے پیسے ملیں، اُس دن عید۔

صبح سویرے پدما نے اُٹھ کر کھانا بنایا۔تینوں نے کھانا کھایا۔

''تُو شالیت جا؟'' (تو اسکول جا؟)' اُس نے اپنے چار سال کے بیٹے سے پوچھا۔

''نائے۔ٹیچر آمالا ورگات بند کرتات۔'' (نہیں۔ٹیچر ہم کو کلاس میں بند کر دیتے ہیں۔)

''کا؟'' (کیوں؟)

''کھِڑ کی تُون آمی بگھتو۔تے اِکڑے تِکڑے پھِرتات۔'' (کھڑکی سے ہم دیکھتے ہیں۔وہ اِدھر اُدھر گھومتے ہیں۔)

''کائے کاہی شِکوت نائے کا؟'' (کیا کچھ پڑھاتے نہیں؟'')

''نائے'' (نئیں)

''آنی مُلے کائے کرتات؟'' (اور لڑکے کیا کرتے ہیں؟)

''مُلا مارتات۔'' (لڑکے مارتے ہیں)

سبھی باڑیوں میں اسکول نہیں تھے۔واکس واڑی میں چوتھی تک اسکول تھا۔ایک ہی کمرے میں چاروں کلاسیں پڑھائی جاتی تھیں۔

پدما پاس کے گھر کے آنگن میں بغیر پلوّ والی پیروں کے درمیان سے لپیٹی ہوئی چھوٹی کاشٹا ساڑی اور بلاؤز میں کھڑی ہوئی بُڑھیا ساس کو اپنا چار سال کا بچّہ سونپ کر مہادوُ کے ساتھ کام پر نکل گئی۔پدما پہاڑی کی طرف چلی گئی اور مہادوُ ندی کی جانب۔

باقی صفحہ ۴۹ پر ملاحظہ کیجیے

ماہِ کامل

مسرت کلانچوی

(لاہور)

مشاعرہ اپنے عروج پر تھا۔ شاعر اور شاعرات اپنے خوبصورت کلام سنا رہے تھے۔ ساری محفل جھوم اٹھی تھی۔۔۔ نئی آنے والی شاعرہ ماہ پارہ جیسے موسم بہار میں لفظوں کے پھولوں کی برسات کر رہی ہو۔ اس کی شاعری اور پڑھنے کا انداز دونوں نے مل کر ماحول پر سحر طاری کر دیا تھا۔

میرِ مشاعرہ توصیف جبران نے اُسے آج پہلی بار کسی مشاعرے میں دیکھا اور سنا تھا۔۔۔ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کچھ علم نہ تھا۔۔۔ چالیس پینتالیس کی عمر لگتی تھی۔۔۔ شکل نہ بہت خوبصورت اور نہ معمولی۔۔۔ بس اچھی تھی۔۔۔ لیکن اس کی آنکھوں میں نجانے کیسی کشش تھی کہ جبران جیسا سینئر اور عمر رسیدہ شاعر جو ہمیشہ بے پرواہ لاتعلق اور تنہا دکھائی دیتا تھا، اس کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔ اس بات کو ماہ پارہ بھی محسوس کر رہی تھی۔ اس لیے مشاعرے کے بعد وہ جبران کے پیچھے چلی آئی جو دروازہ عبور کر کے برآمدے میں آ گیا تھا۔

''سر'' پیچھے سے آنے والی آواز پر وہ رک گیا۔ مڑ کے دیکھا۔

''جی۔۔۔؟'' اس نے کچھ حیرت سے ماہ پارہ کو دیکھا۔

سر۔۔۔ آپ سے رائے لینا تھی۔ آپ ہمارے ملک کے نامور اور مایہ ناز شاعر ہیں۔ آپ کی رائے میرے لیے بہت قیمتی اور اہم ہوگی۔ کیسی تھی میری نظم۔۔۔؟

''خیال بہت اچھا تھا۔۔۔ سنانے کا انداز بھی خوب تھا۔۔۔ لیکن وزن کہیں کہیں گر گیا۔۔''

''سر۔۔۔ مجھے اوزان نہیں آتے۔۔۔ اس لیے نظمیں لکھتی ہوں۔ غزل کہنے کو جی چاہتا ہے لیکن اوزان نہ جاننے کی وجہ سے جرأت نہیں کرتی۔ اگر آپ میری نظم کو آزاد نظم۔۔۔ اگر آزاد نہیں تو نثری نظم سمجھ لیں اور۔۔۔'' پھر وہ جھجک کر چپ کر گئی۔

''اب مجھے آزاد اور نثری نظم کی حمایت میں دلائل مت دیجیے گا۔ میں اس کے بالکل حق میں نہیں۔۔۔''

''سر۔۔۔ حق میں تو میں بھی نہیں۔۔۔ لیکن مجھے کوئی گائیڈ کرنے والا نہیں ہے نا۔۔۔ سر آپ۔۔۔؟'' وہ پھر بات مکمل نہ کر پائی۔

''ہاں بولو۔۔۔''

''سر پلیز۔۔۔ اگر آپ مجھے گائیڈ۔۔۔''

''میرے پاس وقت تو نہیں۔۔۔ لیکن خیر میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ضرور کرتا ہوں۔''

''سر۔۔۔ میں کوئی نئی نہیں۔۔۔ بیس سالوں سے شاعری کر رہی ہوں۔۔۔''

''بیس سال سے شاعری۔۔۔؟ جبران کچھ حیران سا ہوا۔۔۔ اور آپ کا کلام اب سامنے آیا۔۔۔ وجہ۔۔۔؟''

''لمبی کہانی ہے سر۔۔۔ آپ کے پاس وقت ہوگا تو سناؤں گی۔۔۔ آپ میری ریکوسٹ۔۔۔''

لگتا تھا اُسے زیادہ تر اپنی بات ادھوری چھوڑ دینے کی عادت تھی۔

''میرا کارڈ رکھ لیں۔۔۔ آنے سے پہلے فون کر لیں۔۔۔ میں بہت مصروف ہوتا ہوں۔'' جبران نے اُسے اپنا کارڈ پکڑا دیا۔

اپنی مصروفیت کا ذکر کرنا جبران کی عادت تھی۔ ورنہ وہ دو سالوں سے سرکاری عہدے سے ریٹائرڈ تھا اور اب بالکل بھی مصروف نہ رہا تھا۔ سارا دن اپنے کمرے میں تنہا بیٹھنا۔۔۔ اپنی لائبریری میں اخبار رسالے پڑھنا۔۔۔ چائے پینا اور پھر گھر کے لان میں چہل قدمی کرنا۔۔۔ یہی مصروفیت رہ گئی تھی زندگی میں۔۔۔ تنہا تو وہ پچھلے تیس (30) سالوں سے تھا۔ جب اس کی بیوی عافیہ اپنے پیچھے پانچ سالہ ارحم۔ تین سالہ ارسل اور ڈیڑھ سالہ نتاشا کو چھوڑ کر دوسرے جہاں سدھار گئی تھی۔ ماؤں کی بچوں کی خاطر قربانیوں کی مثالیں تو ملتی ہیں لیکن اس باپ نے اپنے بچوں کے لیے اپنی زندگی اور جوانی تیاگ دی تھی۔ اُسے یقین تھا کوئی بھی سوتیلی ماں اس کے بچوں کے ساتھ اچھا رویہ نہیں رکھ پائے گی۔ اس نے ان کے لیے آیا اور ملازمہ بھی رکھی، لیکن پھر بھی وہ بچوں کے لیے اپنے ہاتھوں سے کسٹرڈ، چاٹ اور چپس بناتا۔ انہیں کھلاتا اور ان کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھ کر جیئے جاتا۔۔۔ سرکاری نوکری اُسے تھکا دیتی پھر بھی وہ ہر شام بچوں کو پارک لے جاتا۔۔۔ جھولے جھلاتا اور گھر آ کر انہیں ہوم ورک کراتا۔

لوگ حیران تھے ایک رومانوی شاعر اور ادیب کیسے جیون ساتھی کے بغیر تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ وہ اس عمر میں بھی سمارٹ اور شاندار پرسنلیٹی کا مالک تھا لیکن اس کی زندگی میں کوئی افیئر بھی نہ تھا۔ شاید وہ اس حساس ادارے میں اچھی پوسٹ پر تھا اس لیے محتاط رہا۔۔۔ اور یوں زندگی گزر گئی۔

ارحم ڈاکٹر بن گیا۔۔۔ اس نے کلاس فیلو سے شادی کر لی۔۔۔ ارسل کے لیے جبران اپنی بھانجی لے آیا۔۔۔ نتاشا کو اس کے ہمسائیوں نے پسند کر لیا اور وہ دلہن بن کر ان کے گھر جا بسی۔۔۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف اور بس کہانی ختم۔۔۔!

لیکن آج جبران کو ایسا لگا۔۔۔ کہانی تو اب شروع ہوئی ہے۔

فون کی گھنٹی بجی۔۔۔ اس نے فون اٹنڈ کی۔۔۔ ''ہیلو''

''السلام علیکم سر۔۔۔''

''وعلیکم السلام۔۔۔'' وہ ماہ پارہ کی آواز پہچان گیا۔

"سر۔۔۔اگر آپ کے پاس وقت ہو تو میں آج شام آپ کے پاس آ جاؤں۔۔۔شاعری میں اصلاح کے لیے۔۔۔؟"

"وقت ہے تو نہیں۔۔۔لیکن خیر آپ آ جائیں۔۔۔ میں کچھ Manage کرلوں گا۔۔۔"

"تھینک یو۔۔۔ اور پھر وہ شام کو اپنی بیاض لے کر اس کے پاس اس کی لائبریری میں آ بیٹھی"

جبران اس کی شاعری کی اصلاح کرتا رہا۔۔۔اوزان سمجھتا رہا۔۔۔ اور پھر جیسے تھک سا گیا۔ چیک کر لیں اپنی نظمیں۔۔۔ ورنہ بعد میں دقت ہو گی۔۔۔میں ذرا چائے بنالوں۔۔۔"

جبران نے اٹھ کر الیکٹرک کیتلی کا پلگ لگایا۔۔۔ اور ساتھ والی الماری سے کپ، خشک دودھ۔ چینی اور ٹی بیگز نکالنے لگا۔

"سر۔۔۔ آپ کے گھر میں ملازم تو ہوں گے۔۔۔ وہ آپ کو چائے۔۔۔؟"

حسبِ عادت اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ضرور ہیں۔۔۔لیکن مجھے اپنے کام خود کرنے کی عادت ہے۔ خاص طور پر چائے تو مجھے خود بنانا پسند ہے۔۔۔ کئی دوست احباب ملنے آتے ہیں۔۔۔انہیں بھی خود چائے بنا کر دیتا ہوں۔"

"لیکن سر۔۔۔ میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔۔۔"

ماہ پارہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جبران کے ہاتھوں سے کپ پکڑنے لگی۔

اس کا ہاتھ جبران کے ہاتھ سے چھو گیا۔۔۔ جبران کو محسوس ہوا، ماہ پارہ کے چہرے پر گلابی رنگ لہرا گیا ہے۔ اُسے بزرگ جان کر کوئی لڑکی یا خاتون اس طرح نہیں شرمائی تھی۔۔۔ اس نے یونہی سر جھکائے کپ میں چینی ڈالی۔۔۔ دوسرے کپ میں بھی ڈالنے لگی تو جبران بولا۔

"آپ نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ میں چینی پیتا ہوں یا نہیں"

"جی۔۔۔جی۔۔۔ میں بھول گئی تھی۔۔۔ آپ کے کپ میں؟"

اس نے پلکیں اٹھا کر جبران کو دیکھا۔ ان نگاہوں میں ایک نرم سا سایہ لہرا رہا تھا۔۔۔ وہ جبران کے لیے احترام تھا یا کوئی اور تاثر۔۔۔ وہ سمجھ نہ پایا اور جلدی سے بولا۔

"چینی رہنے دیں۔۔۔"

چائے پینے کے دوران ماہ پارہ نے مسلسل نگاہیں جھکائی ہوئی تھیں۔

جبران بولا۔

"آپ مجھے اپنی طویل کہانی کب سنائیں گی۔۔۔؟"

"پھر کبھی سہی۔۔۔ صرف اتنا بتا دیتی ہوں پچھلے بیس سالوں سے تنہا ہوں۔۔۔ صرف ایک بائیس سال کا بیٹا ساتھ ہے۔"

وہ چائے پی کر اپنی بیاض اٹھا کر شکریہ کہتی یونہی جھکی جھکی نظروں سے رخصت ہوگئی۔

اس رات جبران رات گئے اپنی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھا غزلیں لکھتا رہا۔۔۔ ایک دم اتنی ساری غزلوں کی آمد اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ پھر وہ اپنی شاعری کی اصلاح کے لیے وقتاً فوقتاً آنے لگی۔۔۔ خاصی کم گو لگتی تھی۔۔۔ ایسا لگتا تھا وہ جبران کے پاس آ کر احساسات کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتی ہے اور لفظ پھولوں کی طرح سطح آب پر خاموشی سے تیرتے رہتے ہیں۔۔۔ کبھی کبھی وہ ڈار سے بچھڑ جانے والی کونج کی طرح لگتی۔۔۔ جیسے وہ اپنی خوشیوں، امیدوں اور خوابوں کی سہیلیوں سے جدا ہو چکی ہو۔۔۔ جیسے وہ اپنے بچے کو لوریاں دے دے کر سلاتی تھی۔۔۔ ایسے ہی اس نے اپنے جذبات کو بھی تھپک تھپک کر سلا دیا ہو۔ صرف اس کی شاعری ہی اس کا کاسہ تھی جس میں وہ اپنی آرزوؤں کے سنہری سکے ایک ایک کر کے ڈال رہی تھی۔

اور جب کبھی نرم بادلوں کے ساتھ پرواز کرتے لمحات سے نکل کر جبران زندگی کی تلخ دھوپ میں نکل آتا تو سوچتا۔۔۔ یہ عام عورتوں کی طرح پوز تو نہیں کر رہی۔۔۔ بن تو نہیں رہی۔۔۔؟ ساری شاعری کی اصلاح کرانے کے بعد وہ ایک اور ہی روپ میں اس کے سامنے نہ آ جائے۔۔۔ اس کا یہاں آنے کا کوئی اور ہی مقصد نہ ہو۔۔۔ مگر کیا۔۔۔؟ کوئی غرض چھپی ہو۔۔۔ مگر کیسی۔۔۔؟ وہ اس سے کوئی ملکی راز تو نہیں جاننا چاہتی۔۔۔؟ جبران اب بھی اپنے محکمے کے کسی قابل اعتماد ملازم کے ذریعے اس کے بارے میں پوری معلومات منگوا سکتا تھا۔۔۔ مگر اس کا دل نہ مانا۔۔۔

وہ بہت دھیمی دھیمی محبت اور اپنائیت کے جذبے سے سرشار پرخلوص بے غرض سی عورت محسوس ہوتی تھی۔۔۔ ایک دن جبران بولا۔

"آپ کی شاعری بیس سال پہلے منظر عام پر آ جانا چاہیے تھی۔۔۔ ایسا ہوتا تو آج آپ شہرت کے بلند مقام پر نظر آتیں۔"

"شہرت اور مقام تو کبھی میری زندگی کا مقصد ہی نہیں رہے سر۔۔۔ اب اپنی شاعری کے ساتھ سامنے آنا دراصل میری مجبوری تھی۔۔۔ اپنی زندگی بچانا تھی۔۔۔ بیٹے کی خاطر۔۔۔"

"ماہ پارہ۔۔۔ آپ نے کہا تھا کہ کبھی اپنی کہانی سناؤں گی۔۔۔ جبران بولا۔۔۔ وہ کبھی۔۔۔ ابھی تک کیوں نہیں آئی۔۔۔؟"

"سر۔۔۔ پتہ نہیں۔۔۔ اپنے دل کی ہر بات کسی سے کہنے کی عادت جو نہیں۔۔۔ سب کچھ دل کے گہرے غار میں دفن کر دیتی ہوں۔۔۔"

"دیکھو میں رائٹر ہوں۔۔۔ تمہیں اور تمہاری بات کو سمجھ سکتا ہوں۔ تم ہر بات مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔۔۔ اعتماد کرو مجھ پر۔۔۔"

"سر۔۔۔ میں نفسیاتی مریض ہوں۔۔۔ اس نے اپنی جھکی ہوئی نظریں اٹھائیں اور گلابی آنکھیں جبران کی آنکھوں میں ڈال دیں۔۔۔ آپ کے پاس آنا میرے علاج کا حصہ ہے۔۔۔"

''جب تک آپ مجھے اپنی کہانی اور مسئلہ نہیں بتائیں گی۔۔۔میں کیسے سمجھ سکوں کا۔۔۔کیسے علاج ہو سکے گا آپ کا۔۔۔؟''

''سر۔۔۔وہ۔۔۔''

''اچھا دیکھو یہ سر۔۔۔ور کا تکلف چھوڑو۔تم میرا نام لے سکتی ہو۔''

''جی جبران صاحب۔۔۔میری سائیکاٹرسٹ بھی اصرار کررہی ہے کہ میں آپ کو اپنا مسئلہ بتا دوں۔۔۔آپ کے ساتھ ہر بات شیئر کر کے دل کا بوجھ ہلکا کروں۔۔۔کیونکہ میں نے اُسے بتا دیا ہے کہ میں آپ کے لیے اپنے دل۔۔۔''

وہ رک گئی۔

''بات مکمل کرو۔۔۔''برسوں بعد جبران کا دل بھی دھڑکا تھا۔

''یہ بات پھر کبھی سہی۔۔۔میں آپ کو یہ بتا دیتی ہوں کہ بیس سال پہلے میرا شوہر مجھے چھوڑ کر کمانے کے لیے غیر ملک چلا گیا۔اس نے وہاں کی شہریت حاصل کرنے کے لیے غیر ملکی لڑکی سے شادی کر لی اور مجھے طلاق بھجوا دی۔میرے والدین میری دوسری شادی کرنا چاہتے تھے لیکن میرے بچے کو قبول کرنے کے لیے کوئی تیار نہ ہوتا۔۔۔اوا گر کوئی ہو جاتا تو اس کی نظر میرے والد کی دولت اور جائیداد پر ہوتی۔اور پھر سب سے بڑی رکاوٹ میری ممتا تھی۔۔۔میں اپنے بچے کو سوتیلے باپ کے سلگتے سایے تلے نہ لانا چاہتی تھی۔سو میں نے تنہا زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔کئی مردوں نے دوستی اور فلرٹ کی نیت سے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔۔۔لیکن میں نفرت سے ان کے ہاتھ جھٹکتی رہی۔۔۔میں بہت رومانٹک لڑکی تھی۔۔۔میں نے اپنی ایک خوبصورت سی رومانوی دنیا بنا لی۔۔۔اس میں اپنی آرزوؤں،امنگوں اور خوابوں کے رنگ بھرتی رہی۔

شاعری میری سہیلی بن گئی۔میں اپنا ہر دکھ سکھ اس سے بانٹتی رہی۔

میں تصورات کی دنیا میں نکل آئی۔کبھی کانٹے میرے پاؤں میں چبھ جاتے تو کبھی پھول میرا استقبال کرتے۔اور کبھی میں بہتے ندی نالوں میں ڈوب ڈوب جاتی۔

اور یوں میں نے بیس سال اپنے آپ کے ساتھ گزار دیئے'' مجھے اپنی شاعری کے ساتھ والدین کا سہارا اور آسرا تھا۔۔۔وہ دنیا میں نہ رہے تو میں شدید ڈپریشن میں چلی گئی۔یہ کیفیت زیادہ بڑھ گئی تو مجھے سائیکاٹرسٹ سے ملنا پڑا۔اس نے مجھے کہا۔۔۔میں لوگوں سے ملوں جلوں۔۔۔ان سے رابطے بڑھاؤں۔۔۔اپنی شاعری سناؤں اور اس حبس بھری دنیا سے نکل آؤں جہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔

میں لوگوں سے مکس اپ نہیں ہو سکتی صرف آپ سے مل کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں تازہ ہوا میں نکل آئی ہوں۔۔۔نجانے کیسی خوشبو ہے جس کا پیچھا کرتے کرتے میں آپ تک آن پہنچی ہوں۔''

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔جبران نے اُسے دلاسا دینے کے لیے اس کے ہاتھ کو ہلکا سا تھپتھپا دیا۔کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔

جبران کو لگا ماہ پارہ کی کہانی اس کی اپنی کہانی ہے۔دونوں کا دکھ سانجھا تھا۔۔۔وہ تنہائی کے سفر پر آبلہ پا ہو کر اب ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تھے۔۔۔لیکن کون کس کے زخموں پر مرہم رکھے گا۔۔۔اب نہ اس کا وقت تھا اور نہ عمر۔۔۔سارے موسم اپنی تمام تر رنگینوں اور خوشبوؤں کے ساتھ رخصت ہو چکے تھے۔۔۔اب جبکہ وہ اپنے پوتوں اور نواسوں کو شہزادے،شہزادیوں اور پریوں کی کہانی سناتا ہے،کیسے اپنی ایک نئی اور حقیقی زندگی کو افورڈ کر سکتا ہے۔لیکن اُسے محسوس ہوتا ماہ پارہ نے اس کی بند کھڑکی کھول دی ہے۔جہاں سے ماہِ کامل اُسے اپنی پوری آب و تاب سے جگمگاتا نظر آرہا ہے۔اور بادِ نسیم پھولوں کی خوشبو اپنے ہمراہ لیے اندر آگئی ہے۔کہیں دور خوابوں کی پری پائل چھنکاتی پھر رہی ہے اور اس میں ہمت نہیں کہ اُسے پاس بلائے۔

کئی دنوں سے ماہ پارہ اس کے پاس نہ آئی اور نہ ہی اس نے فون کیا۔جبران کئی بار اپنا فون چیک کرتا شاید کسی وقت کال مِس ہو گئی ہو۔۔۔کبھی کھڑکی سے گیٹ کی طرف دیکھتا۔۔۔شاید وہ چلی آرہی ہو۔۔۔لیکن وہ نظر نہ آئی تو جبران کو لگا ڈپریشن کے دیو نے اب اس پر بھی حملہ کر دیا ہے۔۔۔آخر ایک دن اس نے خود ہی ماہ پارہ کو فون کر کے بلا لیا۔وہ آ گئی لیکن جبران سے نظریں نہ ملا پا رہی تھی۔

''تم اتنے دنوں سے آئی کیوں نہیں۔''جبران نے پوچھا۔

''جبران صاحب دراصل میں شرمندہ تھی۔۔۔آپ کو فیس نہیں کر پا رہی تھی۔میری معالج نے تو مجھے اپنے آپ سے بھی شرمندہ کرا دیا ہے۔''

''اچھا۔۔۔کیا کہا اس نے۔۔۔''جبران الجھ سا گیا۔

''میں نہیں بتا سکتی۔۔۔''اس کا چہرہ نوخیز لڑکیوں کی طرح سرخ ہو گیا۔

''تمہیں بتانا پڑے گا''جبران نے اصرار کیا۔

کچھ توقف کے بعد وہ بولی۔۔۔''وہ کہتی ہے کہ جبران صاحب اور آپ ایک۔۔۔''وہ پھر رک گئی۔جبران کا دل دھڑکنے لگا۔۔۔''خدارا۔۔۔آج بات ادھوری نہ چھوڑنا۔۔۔بولو نا۔۔۔''جبران کے لہجے میں پیار سمٹ آیا۔۔۔

''وہ کہتی ہے جبران صاحب اور آپ ایک دوسرے کو چاہنے لگے ہیں۔دونوں کے لیے بہتر ہے کہ آپ شادی کر لیں۔''

اور پھر جیسے وہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔''مجھے آپ سے یہ بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔اور شاید یہاں آنا بھی نہیں چاہیے تھا۔۔۔اب میں چلتی ہوں۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔جبران نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ماہ پارہ نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا تو جبران کی گرفت سخت ہو گئی اور اس نے ہاتھ اپنی طرف کھینچا۔۔۔ماہ پارہ کا دوسرا ہاتھ جبران کے کندھے پر ٹک گیا اور اس کے کھلے ریشمی بال جبران کی پیشانی کو چھونے لگے۔

جبران نے اپنا چہرہ اوپر کیا اور بولا''میں تم سے شادی کروں گا۔''

ماہ پارہ نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔
رات کے کھانے پر جبران اور اس کی فیملی جمع تھی۔ جبران نے بیٹی نتاشا اور داماد کو بھی بلا لیا تھا۔ سب حیران تھے کہ آج جبران بہت سنجیدہ اور کھویا کھویا سا ہے۔ کوئی بات پوچھیں تو چونک جاتا ہے۔ سوال گندم جواب چنا ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد وہ ٹی وی لاؤنج میں آن بیٹھے۔ جبران پوتوں نواسوں سے مخاطب ہوا۔

''بچو۔۔۔اپنے اپنے کمروں میں جاؤ۔۔۔ بچے بڑوں میں نہیں بیٹھتے۔۔۔ مجھے ضروری بات کرنا ہے۔۔۔'' بچے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ بیٹے، بہوئیں، بیٹی اور داماد حیرت سے جبران کا چہرہ دیکھنے لگے۔ جبران بولا۔۔۔

''بچو۔۔۔میں نے آپ کی پرورش اور تعلیم وتربیت میں اپنی زندگی گزار دی۔ تم سب اپنے اپنے گھروں اور گھر والوں کے ساتھ خوش ہو۔ میں خود کو تنہا اور اداس محسوس کرنے لگا ہوں۔ مجھے جیون ساتھی کی کمی محسوس ہونے لگی ہے۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' سب گم صم ہو گئے۔۔۔ نتاشا نے بمشکل آواز نکالی ''کس سے۔۔۔؟''

''وہ شاعرہ جو میرے پاس آتی ہے ماہ پارہ''

کوئی کچھ نہ بولا۔۔۔ ان کی طرف سے جواب نہ پا کر جبران سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ لیکن پھر رک گیا۔ سب نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اب اپنے کمرے میں جا چکا ہوگا تو ارحم بولا۔

''اس عورت کو اکثر ڈیڈی کے پاس آتا دیکھ کر میں تو سمجھ گیا تھا کہ یہ ضرور کوئی گل کھلائے گی۔''

''گل کھلانے کو تو پہلے بھی کچھ عورتیں آئیں۔۔۔ ارحم کی بیوی بولی۔ لیکن ڈیڈی نے کسی کو گھاس نہ ڈالی اور وہ مایوس ہو کر چلی گئیں۔ آخر ڈیڈی کا اپنا انٹرسٹ ہے تو نوبت یہاں تک پہنچی ہے۔''

''توبہ توبہ۔۔۔اب ہم کیا بتائیں لوگوں کو۔۔۔ کہ اس عمر میں ڈیڈی کو کیا سوجھی۔۔۔ کیا ہم سب نے ان کی خدمت میں کوئی کسر چھوڑی ہے کہ اب وہ خود کو اکیلا سمجھنے لگے ہیں۔ ارسل کی بیوی بولی۔

''ڈیڈی کو اس عمر میں یہ بات نہیں کرنا چاہیے۔ ارسل بولا۔ لوگوں کو چھوڑو۔۔۔ ہم تو بچوں کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔۔۔ بچوں کا باپوں پر سے اعتماد ہی اٹھ جائے گا۔''

داماد ہنس کر بولا۔۔۔''بھئی انکل کو اس عمر میں عشق ہو گیا ہے تو کیوں لیلیٰ مجنوں کے درمیاں ظالم سماج بنتے ہو۔''

نتاشا کو شوہر کا مذاق اچھا نہ لگا۔۔۔ وہ غصے سے تپ گئی۔۔۔ ڈیڈی کو کچھ نہیں ہوا۔۔۔ اس چڑیل نے کوئی جادو کر دیا ہے میرے ڈیڈی پر۔۔۔ ورنہ میرے ڈیڈی ایسے نہیں۔۔۔''

''اچھا اتنا اپ سیٹ ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ ڈیڈی کو ہم سمجھا لیں گے۔۔۔ابھی وہ اتنے بھی سیریس نہیں ہوئے ہوں گے۔'' ارحم نے کہا۔

جبران آگے بڑھا۔۔۔ اس نے سیڑھیوں کی ریلنگ پکڑی اور اوپر سے ہی گرج کر بولا۔

''میرا اور ماہ پارہ کا مذاق اڑانے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں سو فیصد سنجیدہ ہوں۔ تم لوگ بھی اس شادی کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

کچھ دن تک جبران کے بیٹے اُسے یقین دلاتے رہے کہ وہ عورت ان کی جائیداد ہتھیانے کے لیے چکر چلا رہی ہے۔''

جبران کہتا ہے''وہ امیر باپ کی بیٹی ہے۔۔۔ خود صاحبِ جائیداد ہے۔۔۔''

کئی دن بحث چلتی رہی۔ کوئی اس شادی کو قبول کرنے کو تیار نہ ہوا۔
اخبار کا ہفت روزہ میگزین آیا۔ ورق گردانی کرتے ہوئے جبران کی نظریں ایک صفحے پر ٹک گئیں۔ اس صفحے پر لوگ اپنی الجھنیں بھیجتے تھے اور روحانی معالج اس کا جواب لکھتا تھا۔ یہ خط نتاشا کی طرف سے تھا۔

''میری والدہ اس وقت فوت ہوئیں جب میرے والد جوان تھے اور ہم چھوٹے بچے۔ ہمارے ڈیڈی نے ساری زندگی ہماری خاطر دوسری شادی نہ کی اور اب جبکہ وہ پوتوں اور نواسوں، والے ہو گئے ہیں تو جوان بیٹے کی متعلقہ ماں نے ڈیڈی کے مال اور جائیداد کے چکر میں انہیں پھانس لیا ہے۔ ہمارے سمجھانے بجھانے کے باوجود وہ اس سے شادی پر بضد ہیں۔ سوچیں ذرا۔۔۔ ایسا ہوگا تو میری سسرال میں ناک کٹ جائے گی۔۔۔ مہربانی فرما کر کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جسے میں پڑھوں اور ڈیڈی شادی سے باز آ جائیں''

روحانی معالج نے جواب میں لکھا تھا۔۔۔ آپ کے ڈیڈی کی محبت نے آپ سب کو خود غرض بنا دیا ہے۔ آپ یہ نہیں سوچتے کہ انہوں نے اپنی جوانی آپ بچوں پر قربان کر دی ہے۔ اب عمر کے اس حصے میں جب وہ تنہائی محسوس کر رہے ہیں اور انہیں جیون ساتھی کی ضرورت ہے تو آپ ان کی زندگی بھر کی محبت شفقت اور قربانیوں کو بھول گئے ہیں۔ بیٹوں کو جائیداد کی اور آپ کو اپنی ناک کی فکر پڑ گئی ہے۔ انہوں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کیے۔۔۔ انہیں اچھے بُرے لالچی یا بے غرض مخلص لوگوں کی خوب پہچان ہوگی۔۔۔ ان کی خوشیوں کے راستے میں رکاوٹ نہ بنیں اور انہیں شادی کرنے دیں۔ یہ ان کا انسانی، قانونی اور شرعی حق ہے۔ کوئی وظیفہ ان کا یہ حق نہیں چھین سکتا۔۔۔

ٹی وی لاؤنج میں سب جمع تھے۔۔۔ جبران نے وہ میگزین اوپر سے ہی ان کے درمیان پھینک دیا۔

''پڑھ لو اپنے مسئلے کا حل۔۔۔ میں اس اتوار کو نکاح کر رہا ہوں۔''

اتوار کو سب ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ عجیب سی بے حسی سب کے چہروں پر چھائی تھی۔ طے یہ پایا تھا کہ یہ لوگ نکاح کرنے ماہ پارہ کے گھر نہیں جائیں گے کیونکہ اس کا بیٹا خاصا ڈسٹرب ہے۔ البتہ

ماہ پارہ نے ان کی طرف آنا تھا۔ جبران انتظار کررہا تھا کہ ماہ پارہ ائے تو وہ فون کر کے نکاح خواں کو بلالے۔اور پھر وہ آ گئی۔۔۔اس کا لباس سادہ تھا اور رنگت زرد سی۔۔۔آنکھیں سوجی ہوئی۔۔۔کوئی اُسے اٹھ کر نہ ملا۔

''آؤ ماہ پارہ۔۔۔بیٹھو۔۔۔'' جبران کھڑا ہو گیا۔

''میں بیٹھنے نہیں آئی۔۔۔وہ سرد لہجے میں بولی۔۔۔میں آپ سب سے معذرت کرنے آئی ہوں۔۔۔میرا بیٹا نہیں مان رہا۔۔۔میں یہ نکاح نہیں کر سکتی۔''

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔۔۔سب کے چہروں پر اطمینان بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔ جبران کا دل کٹ سا گیا وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا اپنے کمرے میں آ گیا۔ کھلی کھڑکیوں سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی اور ایک پرندہ املتاس کے درخت پر بیٹھا مسرت بھرا گیت گا رہا تھا۔ جبران نے کھڑکیاں بند کر دیں۔ پرندے کی سیٹیوں جیسی آواز اب بھی اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

چند دن بعد ماہ پارہ پھر جبران کی لائبریری میں آ گئی۔اس نے آتشی گلابی سوٹ پہنا تھا۔۔۔ہلکا سا میک اپ اور کانوں میں سنہرے آویزے جھلملا رہے تھے۔ہاتھ میں بیگ تھا۔

جبران کے لیے یہ کس قدر خوشی بھرا سرپرائز تھا۔

''میں نے اپنے بیٹے کو منا لیا ہے جبران''

''کیسے۔۔۔؟''

''میں نے اس سے ریکوسٹ کی۔۔۔میں نے کہا۔۔۔بیٹا میں نے دکھوں اور محرومیوں میں زندگی گزاری ہے۔۔تم میرا سب کچھ ہو۔۔۔میرا پیار۔۔۔میری زندگی۔۔۔میری کل کائنات تم ہی ہو۔۔۔میرے بچے۔۔۔میرے بے بی۔۔۔کیا تم مجھے زندگی کی یہ خوشیاں جو خود بخود میری راہ میں آ گئی ہیں۔۔۔انہیں حاصل کرنے دو گے۔۔۔؟ کیا مجھے جینے کا یہ انداز بخش سکو گے۔۔۔؟ پلیز میرا سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے۔میں تمہارے اِذن کی منتظر ہوں۔اور پھر اس نے ہاں میں سر ہلا دیا۔میں نے اُسے کہا کہ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔۔۔بس کبھی کبھی اپنے ان پاپا کے ساتھ مجھے چلے جانے کی اجازت دے دینا۔اس نے پھر ہاں میں سر ہلایا۔۔۔میں نے کہا میں دو دن کے لیے ان کے ساتھ مری جا رہی ہوں۔نکاح کے فوراً بعد۔۔۔لیکن جلد واپس آ جاؤں گی۔ ملازم شرفو تمہارے ساتھ رہے گا۔۔۔اور پھر میں آ گئی۔۔۔وہ مجھے عجیب مسرت سے دیکھ رہا تھا۔۔۔جبران کہیں پھر میرا ارادہ بدل نہ جائے۔۔۔چلو نکاح خواں کے پاس چل کر نکاح کر لیتے ہیں اور پھر مری چلتے ہیں۔''

جبران جلدی سے تیار ہو گیا۔۔۔اس نے اپنی گاڑی نکالی۔۔۔دونوں نکاح خواں کے پاس گئے۔۔۔نکاح کیا اور شام تک مری پہنچ گئے۔

ہوٹل میں کمرہ بک کرا کے وہ ڈائننگ ہال میں آن بیٹھے۔کتنا سکون، کتنا آسودگی اور کتنی طمانیت تھی اس پورے ماحول میں۔۔۔جیسے یہاں آ کر وہ دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہو کر قدرت کے حسن نظاروں میں کھو گئے ہوں۔۔۔محبت نے کائنات کی ہر شے پر رنگ بکھیر دیئے تھے۔

جبران بولا۔

''آسمان پر ماہِ کامل ہے اور زمین پر تم میرے ساتھ۔لیکن آج سے تم ماہ پارہ نہیں۔۔۔ماہِ کامل ہو۔۔۔میری ماہِ کامل۔۔۔''

ماہ پارہ نے جبران کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

اچانک ماہ پارہ کے فون کی گھنٹی بجی۔۔۔ماہ پارہ نے فون کان سے لگایا۔۔۔دوسری طرف شرفو تھا۔

''میڈم جی۔۔۔غضب ہو گیا۔۔۔قیامت ٹوٹ پڑی۔۔۔آپ فوراً گھر پہنچیں۔۔۔ببلو بیٹے نے خودکشی کر لی ہے۔''

''ببلو۔۔۔؟ خودکشی۔۔۔ببلو۔۔۔میرے بچے۔۔۔میرے بے بی۔۔۔میرے بیٹے۔۔۔'' وہ دونوں بازو پھیلائے دیوانوں کی طرح چیختی ہوئی بھاگی اور نیچے گر گئی۔

وہ گہری کھائی میں پھسلتی چلی گئی۔

''امید کی روشن کرن''

سائنس دانوں نے پہلی مرتبہ کینسر کے جسم میں تیزی سے پھیلنے کی وجوہات اور کم کرنے کا طریقہ دریافت کر لیا ہے۔جان ہوپکن یونیورسٹی کے ماہر ڈاکٹروں کی ٹیم نے جسم میں کینسر کے جراثیم پھیلنے اور اسے کم کرنے کے حوالے سے تحقیق کی جس کے بعد ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ کینسر میں مبتلا نوے (۹۰) فیصد لوگوں کی اموات ادویات کی عدم دستیابی کے باعث ہوتی ہیں۔کینسر سے متاثرہ جسم کے حصے میں جب کینسر کے جراثیم تھیلے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو وہ جسم کے دیگر خلیوں کو پیغام دیتے ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ کینسر کے جراثیم کا تھیلہ پھٹ جاتا ہے جس کے بعد وہ دوسرے خلیوں کو تیزی سے اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔یہ ضروری نہیں کہ کینسر کا مجموعی سائز جراثیم کے پھیلے کا سبب بنتا ہے بلکہ وہ جراثیم جو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے جڑے ہوتے ہیں ان کے ٹوٹنے کی صورت میں دیگر خلیات متاثر ہوتے ہیں۔ڈاکٹروں کی ٹیم نے آٹھ ماہ تک ٹوسلیز وماب اور ریپراکسن سے جانوروں پر مختلف تجربات کیے جن کے نتائج بہت مفید ثابت ہوئے۔مزید تحقیق کے بعد مذکورہ دوائی انسانوں پر بھی آزمایا جائے گا۔

گہرے پانیوں سے دوستی

شمع خالد

(راولپنڈی)

میں سمپانی کے ساحل کے قریب بیٹھی موجوں کے زیر و بم کو دیکھ رہی تھی اور ایک موسیقی سمفنی کی طرح ہوا کا تال میل لہروں کے ساتھ مل کر عجب سا اسرار کارچاؤ لے کر میرے کانوں کے اندر سمائے جارہا تھا اور میں ستیہ پال آنند کی نظم ''انتظار'' گنگنا رہی تھی۔

''ریتلے ساحل پر بیٹھے لوگ اپنی کورآنکھوں سے سمندر کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے خالی جسم ہوا اور منتظر بیٹھے ہوں اپنی گمشدہ روحوں کی آمد کے جنہیں آبی جہازوں میں فرشتے لے گئے تھے۔''

یہ نظم گنگناتے ہوئے میرا ذہن کہیں دور بھٹکنے لگا کیا اس سکوت میں روحیں بھٹک رہی ہوں گی ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ مجھے ویٹر کی آواز نے اپنی طرف متوجہ کیا وہ کہہ رہا تھا کھانا آپ یہاں اس بنچ پر کھائیں گی یا ڈائننگ روم میں ۔میں نے کہا نہیں ابھی کھانے کی ضرورت نہیں مجھے صرف چائے کا ایک گرم کپ دو جب وہ مڑا پھر وہی سناٹا وہی سمندر اور ہواؤں کی سنسنی اور پھر میں نے سوچا کہ کیا واقعی روحوں کو لے جانے کے لیے جہاز فرشتے لے کر آتے ہوں گے۔کیونکہ دنیا میں تو صرف لوگ اپنے مطلب کے لیے آپ کو ملتے ہیں لیکن کبھی کبھی زندگی کے موڑ پر ایسے بھی لوگ اچانک سامنے آتے ہیں جو دل میں پنہاں ہو کر اندر اُترتے چلے جاتے ہیں ابد تک ساتھ دینے کے لیے دردسہنے کے لیے وعدے کرتے ہیں لیکن چپ چاپ آبی لہروں کی طرح ریت سے ٹکرا کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتے ہیں ان لوگوں کی باتیں سمجھنے کے لیے ہمیں ایک سچا خواب دیکھنا ہو گا۔جس میں یہ آلودہ زندگی نہ ہو لوگوں کا سچ سمجھنے کے لیے اندازوں کا سہارا نہ لینا پڑے وہاں ایک خواب سچا، سُریلا دیکھنا لازم ہو جاتا ہے یہ سوچتے ہوئے دوبارہ سمندر کو گھورنے لگی۔ویٹر چائے لے کر جانے کب تک آ کر خاموشی کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور سرگوشی میں پوچھنے لگا۔کیا آپ کو سمندر بہت اچھے لگتے ہیں؟ میں نے کہا سمندر کس کو اچھے نہیں لگتے ہر شخص کا دل بھی تو ایک سمندر ہے میری بات سُن کر وہ طنز یہ مسکرایا بغیر کچھ کہے چلا گیا میں چائے کو گھونٹ گھونٹ اپنے اندر اُتارتی چلی گئی اگرچہ بہت گرم تھی لیکن میں شام کے ڈھلتے سورج سے گھبرا کر چائے وہ میرے سامنے ہی کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا کہ آپ کو اپنی بات کا جواب اسی کپ میں مل گیا ہو گا سمندر بھی سب چیزیں اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے کھانا کھانے کے لیے جب مجھے بلایا گیا تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی اندر چلی گئی۔کھانا کھانے کے بعد سب بچوں نے پروگرام بنایا تھا کہ ہم رات بھر جاگ کر سورج کو طلوع ہوتے دیکھیں گے۔

میں خود بھی رات بھر سمندر سے ان کہی، ان سنی، باتیں کرنا چاہتی تھی میں نے کئی بار کراچی کے سمندر پر پہلے بھی آ چکی ہوں تب کلفٹن بہت صاف ستھرا اور خوبصورت ہوا کرتا تھا لیکن اب وہاں ماحول کی آلودگی مجھے واپس لے آئی تھی۔

مائی کولاچی دو دریا پر جب میں پہنچی تو ریسٹورنٹ کی خوبصورت لائٹس جگنو کی طرح جگمگا رہی تھی آس پاس اندھیرے میں یہ رومان پرور ریسٹورنٹ کسی اور ہی دنیا کی جگہ محسوس ہو رہا تھا میں نے اپنی کرسی آگے بڑھائی تو مائی کولاچی Tre Spirit of Karachi لکھا نظر آیا اس کے پاس تصویر بناتے ہوئے میں نے سوچا کہ مائی کولاچی کی روح اس جگہ آتی ہو گی یہ سوچتے ہوئے میں ہوٹل کے اندر داخل ہوئی۔ہوٹل باہر کی طرف لکڑی کے تختوں سے اس طرح بنایا گیا تھا کہ آپ کو بیٹھ کر یوں لگے جیسے آپ بحری جہاز میں سفر کر رہے ہوں۔سفید رنگ کے آبی پرندے یوں اُڑ رہے تھے جیسے اُنہیں کسی حسین پینٹنگ میں ٹانک دیا ہو۔سفید آبی پرندوں کے غول کے غول کبھی اڑتے ہوئے آتے اور کبھی سمندر کی لہروں پر بیٹھ جاتے میرے پیچھے بیٹھی ایک انگریز عورت اپنے بچوں کو کہہ رہی تھی کہ جلدی سے اپنے کیمرے آن کرو دیکھو ایک غول Sea Gul کا آنے والا ہے اُس کی ویڈیو بنا لو یہ سمندر یہ پرندے دیکھ کر لگتا کہ میں ہمیشہ یہیں بیٹھی رہوں اور اس سحر انگیز ماحول کا حصہ بن جاؤں یہ سوچتے ہوئے میں ان پرندوں کو گھور رہی تھی اتنے میں بیروں نے ڈنر سرو کرنا شروع کر دیا میں ہمیشہ کسی انسان کو دیکھتی ہوں تو سب سے پہلے میری آنکھیں سامنے والے کی آنکھوں میں جھانکتی ہیں۔بیرے نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کولڈ ڈرنک میں کیا لیں گی میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں پورا سمندر سمایا ہوا تھا۔سانولے رنگ کا یہ ہری سمندر جیسی آنکھیں دیکھ کر میں حیران رہ گئی اس کے مڑتے ہی سمندر کی لہروں نے ایک بے ہنگم شور مچایا سارے آبی پرندے اُڑ گئے اور ایک مچھیروں کی کشتی پاس سے گزری۔کھٹا کھٹ کیمرے آن کیے اور اس کشتی کی تصویر بنانے لگے مجھے اس کشتی میں ایک گہری آنکھوں والا مچھیرا نظر آیا میری حیرت کی انتہا نہ رہی یہ وہی بیرا تھا شاید میری نظر کا دھوکا ہو یہ سوچ کر میں نے سر کو جھٹک دیا میں نے واپسی پر اپنی بہو کو کہا کہ میں ایک رات سمندر کے پاس گزارنا چاہتی ہوں تو میری بہو حنا نے کہا کیوں نہیں کل رات ہم سمپانی Beach پر ہی گزاریں گے۔دوسرے دن سورج ڈھلنے کے قریب ہم سمپانی بیچ پہنچ چکے تھے وہاں ہم ایک بینچ پر بیٹھ کر سورج کو آہستہ آہستہ سمندر میں ڈوبتے دیکھ رہے تھے سورج کے مکمل ڈوبنے کے بعد سمندر کا رنگ اور گہرا ہو گیا اور لہریں بھی زیادہ شریر لگنے لگیں۔اچھل اچھل کر وہ میرے پاس آنا چاہتی تھیں میں نے سمندر سے پوچھا کیا میں تمہیں اُوڑھ کر ایک رات سورج کی طرح سو سکتی ہوں تو اُس کی منظر کی لہروں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور سمندر کی جھاگ مجھے اپنی طرف کھینچنے لگی بہت پہلے بھی یہ واردات مجھ پر گزر چکی تھی جب میں کلفٹن کے بیچ پر کھڑی تھی لہریں میرے پاؤں سے ٹکرا رہی تھی اور میں آگے اور آگے بڑھتی جارہی تھی خالد نے پیچھے سے آواز دی بس واپس آ جاؤ تو میں نے کہا سمندر مجھے بلا رہا ہے تب بھی میں نے ایک کہانی لکھ کر سمندر کی طرف

اچھال دی تھی لیکن اب تو نہ ٹانگوں میں اتنا دم تھا کہ میں سمندر تک پہنچ سکتی اور نہ ہی جسم میں اتنی ہمت تھی کہ میں چل کر وہاں جا سکتی بس تھا تو پرانی یادوں کا ایک خزانہ جو اس کھنڈر میں دفن تھا اتنے میں بیرے نے آ کر کہا اماں جی آپ کھانا نو بجے ہی کھائیں گی میں نے اُسے دیکھا وہ وہی تھا سمندر آنکھوں والا کیا وہی ہے میں نے اپنے دل سے کہا یہ دماغ نے کہا یہ کوئی پرانی یاد ہے جو ہر چیز پر سج جاتی ہے یہ پوچھ کر وہ چلا گیا تو میں نے پھر سمندر سے پوچھا تو اُس نے ہنستے ہوئے کہا کہ تم سے پہلے بھی ہزاروں لوگ میرے اندر پناہ لینے آئے لیکن میں نے اُن کی روحیں آزاد کرا کے ان کے مردہ تن واپس زمین کے حوالے کر دیے میں زمین کی کوئی چیز اپنے اندر جذب نہیں ہونے دیتا بلکہ مٹی کی چیز واپس اُس کے حوالے کر دیتا ہوں اگر تم چاہو تو چند گھڑیاں میرے پاس گزار سکتی ہو۔ میں نے اُسے بتایا کہ کیا تم اپنی تنہائی سے گھبراتے نہیں تو لہروں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور جھاگ اُڑا کر میرا مذاق اُڑانے لگے۔ اب میں نے پوچھا کہ کیا تم تنہائی سے ڈرتے نہیں تو سمندر نے ایک ہلکی سی آواز دیتے ہوئے کہا میں تنہا کہاں ہوں میری گہرائی اور گہرائی میں ہزاروں طوفان چھپے ہوئے ہیں اور کئی دنیا آباد ہیں ہاں میں پھر بھی تنہا ہوں کیوں کہ میں نے سب کچھ سمیٹ کر اپنے اندر سما لیا ہے بالکل تمہاری طرح میں سردیوں میں کبھی کبھار اپنی حد سے باہر آ جاتا ہوں اور جب غصہ ختم ہوتا ہے تو میں پچھتاوے کے دکھ میں اپنے آپ سے ناراض ہو کر چپ کا سکوت اُوڑھ لیتا ہوں اتنے میں کھانے کا بلاوا آ گیا۔ باربی کیو کی خوشبو پورے ماحول میں چھا چکی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے بیرے سے کہا کہ میری ویل چیئر اُسی جگہ چھوڑ آؤ اور میں سبز قہوہ وہاں ہی پی لوں گی تو سمندر آنکھوں والے بیرے نے کہا آپ کو سمندر بے حد پسند ہے میں تو آپ کو تب بھی ملا تھا جب آپ برائٹ ٹاؤن سمندر پر آئی تھیں۔ میں نے جواب دیا ہاں لیکن دبئی والے سمندر میں تمہارے اندر بے حد اجنبیت تھی بہت پرائے پرائے لگتے تھے تو اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہاں ماں وہاں انسان مجھ سے جیت گئے تھے۔

دوسرے دن میں سمندر کے سینے پر تھی ایک چھوٹے بحری جہاز میں بیٹھی لہروں کو دیکھ رہی تھی کچھ دور تک تو پانی کی آلودگی اور بُو نے ہمارا پیچھا کیا جوں جوں بحری جہاز آگے بڑھتا گیا تو سمندر کی لہریں واضح ہوتی گئیں اور مچھلیاں کبھی اوپر آتیں اور واپس چلی جاتیں میں اس کھیل میں محو تھی تو وہ سمندر آنکھوں والا لڑکا پھر میرے سامنے موجود تھا تو میں نے اُسے دیکھ کر اپنے خوف کو اپنے اندر جذب کر کے پوچھا کہ تم کون ہو اور کیوں میرا پیچھا کر رہے ہو تو اُس نے مسکرا کر کہا میں مائی کولاچی کا بیٹا ہوں تو میں نے غصے سے کہا کہ مائی کولاچی کو مرے دو صدیاں بیت گئیں تو اُس نے سمندر جیسے پرسکون لہجے میں کہا کہ مائی کولاچی مری ہی نہیں وہ تو عبداللہ گوٹھ کے ہر مچھیرے کے اندر زندہ ہیں ہم سب اُسی کے بیٹے ہیں۔ وہ جب بول رہا تھا تو اُس کی آنکھوں کی گہرائی آنکھوں سے چھلک چھلک کر باہر آ رہی تھی۔ میں نے اپنا اعتماد بحال کرنے کے لیے کہا ہاں میں نے Google پر چیک کیا تھا نہ مائی کولاچی وہی تھی جس نے اس جگہ مچھیروں کی بستی بسائی تھی تو اُس نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا بستی بسانے کے لیے تو سکندر اعظم اور جانے کون کون سے بڑے بڑے لوگ آئے تھے اور انہوں نے اس جگہ کے نام رکھے تھے لیکن زندہ تو نام ہماری مائی کا ہی تو رہا کیونکہ وہ دو لفظوں کی محتاج نہیں تھی بلکہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ ایک کہانی تھی۔

مائی کولاچی پیدل چل کر جب سفر کر رہی تھی تو پیاس کی شدت سے اُس کے ہونٹ خشک تھے کوکھ سے جڑا بچہ بھی پیاس سے تڑپ رہا تھا۔ مائی کولاچی نے اُسی صحرا میں اپنے مردہ بچے کو جنم دیا اور اپنے سفر پر چل نکلی۔ دنوں مہینوں ہفتوں چلتے ہوئے وہ آخر یہاں پہنچ گئی یہاں اُس نے سمندر میں سرخ اور سنہری مچھلیوں کو ڈوبتے اُبھرتے دیکھا اُس کے خشک ہونٹوں میں جیسے نئی روح پھونک گئی ہو جیسے وہ اپنی کوکھ کا غم بھول کر پانی کی طرف لپکی اُس کے ہونٹ کا رنگ جامن کی طرح چمکتا تھا وہ سوکھ کر پپڑی کی طرح ہو گئے تھے۔ مائی کولاچی نے سمندر سے گھونٹ پانی بھرا لیکن اُسے حلق سے نہ اُتار سکی۔ کڑوا، کسیلا کھارا پانی اُس کے ہونٹوں کی پیاس نہ بجھا سکا پھٹے ہوئے ہونٹوں کو چھبنے لگا اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا تو مائی نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر چلاتے ہوئے کہا ''اے سمندر کی اور روحوں کی جانوروں اور انسانوں کی حفاظت کرنے والو ایک ماں اپنی کوکھ کو اُجاڑ کر بھی نہیں روئی کیونکہ اسے لگن تھی کہ وہ اپنے کنبے قبیلے اور اپنے چاہنے والوں کو بھوک پیاس سے نجات دلائے گی۔ لیکن خدایا یہاں پانی کے بغیر وہ کیسے جی پائیں گی۔'' اُس کی پکار تھی یا ممتا کی قربانی رنگ لائی۔ آسمان سے جل تھل مینہ برسنے لگا اور ساتھ ہی سمندر کا کھارا پانی بھی میٹھا ہو گیا۔ مائی نے جس وقت خدا کو پکارا ہو گا کہنے لگا مائی کی قربانی مائی کی دعا میں اتنی طاقت تھی کہ مائی نے اپنی بزنس کمپنی بنا لی اور ہم مائی کے بیٹے اُس کے ساتھ تھے۔ مچھلیاں پکڑنا ہمارا کام تھا۔ اُنہیں ٹرکوں میں بھر کر شہر تک پہنچانا مائی کا کام تھا۔ مائی کو ہم نے اپنا سردار مان لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا کام چل پڑا اور عبداللہ گوٹھ کے لوگوں نے پہلی دفعہ اپنی لانچ خریدی اپنے نئے جال بنائے۔ مچھلیاں تھیں کہ اُمڈ اُمڈ کر ہمارے جال میں خود آ جاتیں ہم اپنی لانچ میں بیٹھ کر جامشورو کی طرف نکل جاتے جہاں پلا مچھلی ہوا کرتی تھی۔ پلا مچھلی کے لیے ہر ماہی گیر چاہتا تھا کہ وہ اُس کے جال میں آئے لیکن ہمارے پڑوسی ہندوستان میں جانے کب اپنی طرف ایک ایسا بندھ بنایا کہ پلا مچھلی ادھر آ ہی نہ سکی۔ پلا مچھلی مچھیرے سمندر کے لیے بھی کوئی حد ہوتی ہے لیکن انسان نے ہمیں بھی مان لیا۔

میں ایک مچھیرا ہوں اور میری روح مچھلی کی بُو باس کی اتنی عادی ہے کہ میں کنارے پر کھڑا ہوا بھی جب جال پھینکتا تھا تو میرا جال مچھلیوں سے بھرا ہوا نکل آتا تھا۔ مائی نے یہاں مچھلی سوداگری کے لیے اپنی کمپنی بنا لی اور باقاعدہ گوروں سے اور باہر سے آنے والوں سے سودا کر کے ڈھیروں مچھلیاں بیچنے لگی۔ سارے قبیلے نے مائی کو اپنے قبیلے کا سردار بنا لیا۔ میں مائی کے مرنے کے ڈیڑھ سو سال بعد پیدا ہوا لیکن مائی مجھے ملنے آئی اور اُس نے مجھے کہا کہ تم نے اب سرداری

سنبھالنی ہے۔ مچھیروں کو راہ دکھانی ہے لہٰذا مائی کے بتائے ہوئے اُصولوں پر چل کر میں ایک بہت بڑا ماہی گیر بن گیا۔ میں اُس دن گہرے پانیوں میں کشتی چلا رہا تھا اور مجھے دور سے مچھلیاں پکار رہی تھیں۔ اب مچھیرے غریب لوگ صرف خدا، پانی سے محبت اور دوستی رکھتے ہیں۔ ہمیں نہ کسی حکومت سے غرض ہے نہ امیر لوگوں سے ہم تو صدیوں سے سمندر کے پاس ہیں لیکن صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے دلوں میں کیوں نفرتیں بھر گئیں جو کسی کو بھی نہیں بخشتی تھیں ہم مچھیرے مال وزر کے غلام نہیں۔ ہمیں تو سمندر، ہوا اور مچھلیوں سے پیار ہے۔ ہمیں نہ تو سرحدوں کی فکر ہے نہ ہی کسی حکومت کی لیکن جانے کیوں اور کیسے میں بھٹک گیا۔ بھٹک کر پڑوسی ملک پہنچ گیا وہاں تک بیٹھے سپاہیوں نے میری کشتی کو گھیرے میں لے لیا اور مجھے رسیوں سے باندھ کر جیل بھیج دیا۔ جیل میں میرے جیسے کئی مچھیرے بیٹھے تھے۔ میں نے اپنے قبیلے کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے بڑے افسر سے بات کی اور کہا ہم غریب مچھیرے ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ہمارا بادشاہ کون ہے اور آپ کا کون؟ پھر ہم بے گناہوں کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے ہم تو بس مچھلیوں کے شکاری ہیں۔ میری بات سن کر افسر بولا بہت زبان چلاتے ہو میری زبان کاٹ کر مجھے سمندر میں پھینک دیا۔ تب میں نے رو رو سمندر سے التجا کی کہ مجھے بچالو تو اس نے میری روح کو بچالیا تاکہ میں اپنی کہانی تمہیں سنا سکوں اور جسم کو سمندر نے باہر پھینک دیا۔ تو تب مجھے میری مائی کو لاچی لینے آئی اور مجھے اس نے بتایا کہ مجھے عالمِ برزخ میں جانے سے پہلے اپنی کہانی دنیا کو بتانی ہے کہ سمندر سب کے لیے ہے اس پر کسی کی حکومت نہیں ہم تو یہاں سے مچھلیاں پکڑ کر لوگوں کو لذت دوام دیتے ہیں۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم غریب مچھیروں کو دونوں اتنی آزادی دے دیں کہ ہم اپنی سمندر ماں سے اپنی روزی وصول کر سکیں۔ سمندر کی حدیں ہمارے لیے حائل نہ ہوں بلکہ ہمیں پورے سمندر میں گھومنے کی آزادی ہو۔ کیا ایسا ممکن ہے۔ سمندر تو سب کا سانجھا ہے وہ یہ کہہ کر کب کا جا چکا تھا اور میں سورج کو سمندر میں ڈوبتے ہوئے دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ ہماری حکومتوں کے دل سمندر جیسے گہرے اور وسیع کیوں نہیں۔ یہ صرف غریبوں کو بے وسیلہ کرنے کے لیے ہی طاقت کیوں استعمال کرتے ہیں۔

- بقیہ -

پیج ندی کا مچھیرا

ندی پر پہنچ کر مہادؤ نے اپنے کیچڑ رنگ آدھی آستین کے شرٹ اور پتلون کی جیبوں کو ٹٹولا۔ دائیں ہاتھ میں پکڑے بم کی باتی کو بائیں ہاتھ کی بیڑی سے آنچ دکھائی۔ وہ اسے تیزی کے ساتھ ندی میں پھینکنے لگا کہ اچانک بم پھٹ گیا۔ کہنی سے کوئی چار پانچ انچ نیچے سے دایاں ہاتھ ٹوٹ کر زمین پر آ گرا۔ راستے میں پی ہوئی شراب کا نشہ اچانک اتر گیا۔ زمین پر تڑپتے ہوئے ہاتھ سے نکلنے والے خون پر اس نے ایک نظر ڈالی، گردن میں پڑے ہوئے رومال کو کھینچ کر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کے کٹے ہوئے حصے کو لپیٹا، دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اسے کس کر پکڑا اور تیزی سے دوڑنے لگا۔ اسے پتہ تھا، اسے اسپتال جانا ہے۔ اسپتال دور تھا۔ لگ بھگ پانچ کلومیٹر دور۔ رکشہ کے انتظار میں کچھ دور دوڑنے کے بعد وہ ایک جھونپڑی میں گھُس گیا۔ جھونپڑی کیا تھی دارو کا اڈّا تھی۔ زمین پر بیٹھے ہوئے دو بڑی عمر کے مرد اور گاؤن پہنے ہوئے ایک جوان عورت شراب پی رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی سب ہڑ بڑا کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک آدمی کے ہاتھ سے اس نے بھرا ہوا گلاس لیا اور غٹاغٹ پی گیا۔ اس کے شراب پینے کے دوران وہاں موجود نشے میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو اس کے کٹے ہوئے ہاتھ سے ٹپکتے ہوئے خون کا راز سمجھ میں آنے لگا۔ ہاتھ کا پنجے والا حصہ وہ ندی پر چھوڑ آیا تھا۔ ایک رکشہ والا بھی وہاں پینے آیا ہوا تھا۔ وہ اور دو مرد مہادؤ کو رکشہ میں بیٹھا کر اسپتال کی طرف چلے۔

مہادو پیج ندی کے کنارے کافی دیر سے کھڑا ہوا سورج کو ہلکی ہلکی لہروں پر جگمگاتے دیکھ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں اس کی پلکوں کو بار بار جھپکنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ مچھلیاں بڑے سکون سے پانی کی مختلف سطحوں پر لہراتی، بل کھاتی، ایک دوسرے سے بتیاتی گُنگنا ہوتے ہوئے پانی کا مزا لے رہی تھیں۔ اُس حادثے کے کئی مہینے بعد آج مہادؤ دوبارہ پیج ندی کے کنارے آیا تھا۔ اُس نے زور سے سانس لے کر تازہ ہوا کا مزہ لیا۔ قریب ہی پڑے ہوئے کچھ پتّھروں کے بیچ کچھ سوکھے پتّے اکٹھا کر کے اس نے ان میں لائٹر سے آگ لگائی۔ تھیلی سے دس بارہ انچ کی لکڑی کا ایک سِرا آگ میں تپایا۔ وہ آنچ دینے لگا۔ کٹے ہوئے دائیں ہاتھ کی کہنی کے موڑ پر لکڑی کو اس میں پھنسا دیا۔ اب وہ لکڑی کے سُلگتے ہوئے ٹکڑے سے اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑے بارود کی باتی کو آگ دکھا رہا تھا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ اُس کے ہاتھ کا زخم پوری طرح سے سوکھ گیا تھا۔

''آج ماجھیا گھری بکریا چا مٹن شجیل!'' (آج میرے گھر میں بکرے کا مانس پکے گا!) بارود پھینکتے ہوئے وہ بڑبڑا رہا تھا۔

پانی کی لہروں میں پَھٹ پَھٹ کی آواز کے ساتھ ڈھیر ساری مچھلیاں اچھلیں اور پانی کی سطح پر مَری ہوئی مچھلیاں دکھائی دینے لگیں۔ اس نے جُھک کر کچھ مچھلیوں کو ہاتھ میں پکڑ لیا اور چلاّیا۔ ''ایکلا تُمہی ماشیان نو! آج ماجھیا گھری بکریا چا مٹن شجیل!'' (سنا مچھلیو! آج میرے گھر میں بکرے کا مانس پکے گا!)

''کرارانوٹ''

رومانہ رومی

(کراچی)

اچانک کسی نے مجھے کال کوٹھری میں دھکا دیا اور میں اندھیرے میں دور تک لڑکھڑاتا چلا گیا۔۔۔ جب ذرا حواس ٹھیک ہوئے تو میں نے اپنے چاروں جانب نگاہ گھمائی ہر طرف میلے کچیلے بدبودار نوٹوں کا ڈھیر لگا تھا جن سے عجیب وغریب قسم کی بوآ رہی تھی میں اُن سب کے درمیان بے بس وبے اختیار ایک طرف پڑا ہوا تھا۔۔۔ وہاں پڑے ہوئے میلے کچیلے نوٹ بھی مجھ سے اُٹھنے والی پرفیوم کی بھینی بھینی مہک کو محسوس کر کے میری طرف متوجہ ہو چکے تھے اور اب سب مل کر مجھے حیرت وتجسس سے تکے جا رہے تھے۔۔۔ وہ سب آپس میں چہ مگوئیاں بھی کر رہے تھے اور میں ڈرا سہما سا اُن کی جانب دیکھ رہا تھا۔۔۔ آخرکار ان میں سے ایک نوٹ نے اپنا رخ میری طرف کیا اور سوالیہ نظروں سے مجھے گھورنے لگا ویسے تو مجھے اپنی قدر وقیمت کا بخوبی اندازہ تھا مگر یہاں مجھے اپنی حیثیت دوکوڑی سے بھی کم محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ کہاں میں پانچ ہزار کا نیا کرارا نوٹ۔۔۔ اور کہاں وہ سو روپے کا مڑا تڑا نوٹ۔۔۔ مگر وہ یہاں کا سردار تھا اور مجھے گھور گھور کے بے حال کر چکا تھا۔۔۔ شاید وہ سب یہاں میری آمد پر حیران تھے اور وجہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ جس کے سبب میں اُن کے درمیان آ پھنسا تھا۔۔۔ اپنے جسم پر اُن کی چبھتی ہوئی نظروں نے مجھے پچھلی رات کے پس منظر میں جا کھڑا کیا۔۔۔ جب بڑے صاحب نے اپنے مہنگے نفیس سے کوٹ کی جیب سے نوٹوں کی پوری نئی کراری گڈی نکال کر بیگم صاحبہ کے حوالے کر دی تھی۔۔۔ جیسے کہ آپ سب جانتے ہیں کہ ہر چیز کی اپنی ایک الگ سی مہک ہوتی ہو اسی طرح نئے نوٹ کی بھی ایک مخصوص مہک ہوتی ہے اور ساتھ ہی اُس کا کرارا پن اُس کو ایک الگ ہی شان دیتا ہے۔۔۔ میں بھی جب نیا نیا بینک میں پہنچا تب سب ہی نے مجھے بڑی محبت اور پیار سے سنبھال کر رکھا کیوں کہ میں قیمتی تو تھا ہی مگر گڈی میں بھی سب سے اوپر والا نوٹ تھا اس لیے میری حفاظت میں بہت احتیاط کی گئی کہ کہیں کوئی داغ دھبہ یا نشان میرے رنگ روپ میں گھن نا لگا دے پھر مجھے جب اسے بڑے صاحب کے حوالے کیا گیا تو انہوں نے بھی بڑی احتیاط سے مجھے اپنے کوٹ کی خوشبودار جیب میں رکھا اور جب میں اُن کی ٹھنڈی اے سی کار میں بیٹھا تو مجھے اپنے قسمت پر رشک آنے لگا۔۔۔ مجھے میرے دوستوں نے بھی یہ بات پہلے ہی سمجھا دی تھی کہ بڑے نوٹوں کا نصیب بھی بڑا اور شاندار ہوتا ہے اس لیے مجھے اس بات کی کوئی فکر ہی نہ تھی کہ میں کبھی کسی پرانی، میلی اور گندی جگہ پر پہنچ سکتا ہوں سو میں پورے اطمینان سے صاحب کی جیب میں لیٹا چین کی سانسیں لے رہا تھا۔ جب میں اُن کی بیگم کی گود میں گرا تب جو لطیف سا احساس اُبھرا اُس کو بیان کرنا مشکل ہے مگر ہاں اُن کے نرم نرم ہاتھوں میں جا کر مجھے پہلی بار دنیا کے اتنا حسین ہونے کا اندازہ ہوا۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے اپنے امپورٹڈ چمڑے کے پرس میں رکھتی صاحب نے اُسے اگلے دن پیر بابا کے پاس جانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی وہاں نذر نیاز کے لیے کچھ پیسے بھی دینے کا کہا۔۔۔ جس پر بیگم صاحبہ نے گردن کے اشارے سے اُن کو مطمئن کر دیا۔۔۔ اور آج جب وہ بابا کے مزار پر آئی تو اُنہوں نے پہلے چھوٹے نوٹوں کی گڈی نکالی اور کچھ وہاں بیٹھے فقیروں میں اور باقی مجاوروں میں تقسیم کر دیے اور کچھ رقم نیاز کے لیے الگ سے جمع کر دی تھی۔۔۔ پھر واپسی پر انہوں نے میری جانب ہاتھ بڑھایا چونکہ میں پہلا ہی نوٹ تھا تو شامت بھی پہلے میری ہی آئی اور انہوں نے مجھے بابا کے مزار پر رکھے ہوئے چندے کے ڈبے میں ڈال دیا۔۔۔ اب ساری بات مجھ پر واضح ہو گئی تھی اور اب میں اس بدبودار گھٹن زدہ ماحول میں بے یارومددگار پڑا تھا۔۔۔ جہاں پان۔۔۔ گٹکا۔۔۔ سالن۔۔۔ اور کسی کسی نوٹ میں سے تو سڑی ہوئی مچھلی کی بساند تک آ رہی تھی۔۔۔ ڈبے کی چھت پر بنا واحد معمولی سا سوراخ۔۔۔ ہوا اور روشنی کو ڈبے کے اندر داخل کرنے میں ناکام نظر آ رہا تھا۔۔۔ میری سانسیں اُکھڑنے لگی تھی۔۔۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے نوٹ دل کھول کر میری بے بسی پر ہنس رہے تھے۔۔۔ وہ سب آپس میں دوست تھے اور میں ان سب میں اکیلا اور تنہا۔۔۔ مجھے اس قید سے رہائی کی کوئی اُمید نظر نہیں آ رہی تھی۔۔۔ شدتِ غم سے میں نیم بے ہوش سا ہونے لگا کہ اچانک اس گھٹن زدہ ماحول میں ایک ہلچل سی مچی اور پھر کسی نے ڈبے کا تالا کھول کر سارے نوٹوں کو فرش پر گرا دیا۔۔۔ میں بھی اُن کے ساتھ اُچھلتا لڑکھڑاتا ہوا ایک نہایت بوسیدہ سے قالین پر جا گرا۔۔۔ گو کہ یہ جگہ بھی نہایت تاریک اور سیل زدہ تھی مگر پھر بھی میں اس میں لمبے لمبے سانس لے کر اپنی حالت کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔ چھت پر لگے پنکھے کی شور مچاتی آواز اور زرد سے بلب کی بیمار سی روشنی نے مجھے پھر سے خوف زدہ کر دیا تھا۔۔۔ چھوٹے نوٹ اس ہوا میں اِدھر اُدھر اُڑ رہے تھے مگر میرا کرارا پنا ابھی باقی تھا سو میں اطمینان سے ایک جانب سمٹا سا پڑا تھا۔۔۔ کمرے میں موجود لوگوں کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ کل مزار والے بابا کا عرس تھا اور اب یہ سب چندے کے ڈبے کو کھول کر بابا کے نیاز کی تیاری کرنے والے تھے ابھی تک سب سو سو والے نوٹوں کو ڈھونڈ کر الگ کرنے میں مصروف تھے کہ کسی کو اس ڈبے سے میرے نکلے جانا کا امکان بھی نہ تھا کہ اچانک ایک مرید کی نظر مجھ پر جا پڑی اور اس سے پہلے کے کوئی اور میری طرف متوجہ ہوتا اُس نے ایک ہی جھپٹے میں مجھے اپنے چولے میں اُڑس لیا۔۔۔ میں تو جیسے آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کی مثال پر پورا اترا۔۔۔ گو کے ڈبے میں بھی بدبودار نوٹ تھے مگر یہ چولا تو جیسے عمروعیار کی زنبیل تھا۔۔۔ ایک طرف اخبار میں لپٹے کسیلے ناریل کی کوئی مٹھائی تھی تو دوسری جانب شاید دو دن پرانے گٹکے کی پڑیا۔۔۔ اُس پر مرے پر سو دُرے نسوار کی ڈبی کا ڈھکنا کھل کر پوری

جیب کونسواری کر چکا تھا۔۔۔ابھی تک تو صرف میری تازگی ماند پڑی تھی مگر جیب میں آ کر تو میرا کرارا پن بھی برباد ہو گیا تھا۔۔۔ میں اپنے نصیب کو کوسنے میں مصروف تھا کہ مجھے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جیسے چھوتا ہوا گزرا۔۔۔ مرید کمرے سے باہر آ گیا تھا اور اب وہ خوشی خوشی گنگناتا ہوا کسی انجان سمت روانہ تھا۔۔۔

مرید نے آج سے پہلے کبھی اتنا بڑا نوٹ نہیں دیکھا تھا سو آج وہ بے پناہ خوش تھا۔۔۔ کافی دیر بعد وہ ڈرتے ڈرتے ایک دکان میں داخل ہونے لگا مگر وہاں موجود گارڈ نے اُس کا راستہ روک دیا۔۔۔ وہ مسکرایا اور پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر مجھے باہر نکالا۔۔۔ مجھے دیکھ کر اُس کے تیور کچھ کم ہوئے اور اُس نے اشارے سے مرید کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔۔۔ دکان کے اندر چاروں طرف اندھیرا تھا ایک چھوٹی سی کھڑکی سے اندر بیٹھا شخص دیکھائی دے رہا تھا جو وہاں پہلے سے کھڑے لوگوں کو اُن کی پسند کے مطابق مال دے رہا تھا۔۔۔ یہاں ایک عجیب قسم کی مہک تھی جو دل و دماغ کو مدہوش سا کر رہی تھی اپنی باری پر اُس نے ایک ولایتی شراب کا آڈر دیا اور بوتل پکڑ کر وہاں سے چل دیا۔۔۔ کاونٹر والے شخص نے مجھے بڑے نوٹوں والی دراز میں ڈالا جہاں مجھ جیسے اور بھی نوٹ پڑے تھے مگر اب بھی میری آن بان اُن سب میں نمایاں نظر آ رہی تھی گو کے یہ بھی کوئی خوشبودار ماحول نہ تھا یہاں ہر طرف سے تیز اور سڑی ہوئی شراب کی بدبو کے بھبکے سے اُٹھ رہے تھے۔۔۔ اس سے پہلے کہ میں اس ماحول سے آشنا ہوتا کسی نے دراز کھول کر مجھے اُٹھالیا اور اپنے پرس میں رکھ لیا۔۔۔ دکان سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک بڑی سی ولایتی شراب کی بوتل اُٹھائی اور چل پڑا۔۔۔ اندر گاڑی میں بیٹھ کر اُس نے جیب سے پرس نکالا اور برابر والی سیٹ پر ڈال کر اے سی آن کر دیا۔۔۔ اے سی کی ٹھنڈی ٹھنڈی پرسکون ہوا میں واپس آ کر میں نے ایک لمبی سی سانس لی اور آنکھیں موند لی۔۔۔ مجھے دل سے اطمینان ہو گیا کہ اب میں دوبارہ اپنے پرانے خوبصورت ماحول میں واپس آ گیا ہوں۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے کسی دل نشین بیگم صاحبہ کا سراپا رقص کرنے لگا۔۔۔ پندرہ یا بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد گاڑی کہیں جا رُکی تھی اب صاحب نے سامان سمیٹا اور گاڑی سے اُتر کر گھر کی ڈور بیل بجائی۔۔۔ اندر سے نقرئی قہقہوں کی آواز سنائی دی اور کسی نے دل نشیں انداز میں دروازہ کھول کر صاحب کو اندر کھینچ لیا۔۔۔

اندر کا نظارہ بڑا حسین اور دل رُبا تھا ہر طرف جل پریوں کی طرح دکھائی دینے والی لڑکیاں مختلف لباسوں میں سجی سنوری الگ الگ کمروں کے دروازوں سے لپٹی کھڑی تھیں شاید سب ہی کسی نہ کسی کے انتظار میں تھیں۔۔۔ صاحب بھی اپنی والی جل پری کی طرف بڑھا اس سے پہلے کہ وہ اندر داخل ہوتا ایک خبیث سے چہرے والی بڑھیا نے اُس کا راستہ روک لیا اور اپنے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ سجا کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔۔۔ صاحب کو شاید اُس کی یہ حرکت بُری لگی تھی مگر اس نے پرس نکالا اور پھر مجھے اُس چڑیل کے حوالے کر دیا۔ جیسے ہی اُس کی نظر مجھ پر پڑی اُس نے اپنے کھردرے ہاتھوں سے فوراً ہی مجھے اپنی ساڑھی کے نیچے پہنے ہوئے بلاوز میں اُڑس لیا گرمی کی وجہ سے اس کا بلاوز پسینے سے گیلا تو تھا ہی اب جسم سے بھی چپک گیا تھا اُس پر سونے پر سہاگا اُس نے کوئی نہایت سستی قسم کا عطر بھی دل کھول کر لگایا تھا۔۔۔ میں ایک بار پھر سے آسمان سے گر پڑا تھا۔۔۔ وہ چپڑ چپڑ پان چبائے جا رہی تھی اور منہ ہی منہ میں گندی اور غلیظ گالیاں بھی دئے جا رہی تھی جسے سن سن کر جل پریاں قہقہے لگا رہی تھیں۔۔۔ وہ سامنے بچھے ہوئے تخت پر جا بیٹھی۔۔۔ ابھی اُس نے اپنے چاندی کے پان دان کا ڈھکنا کھولا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی زور و شور سے بج اُٹھی اور ساتھ ہی ساتھ دروازہ پیٹنے کی بھی آوازیں آنے لگیں۔۔۔ یک دم افراتفری پھیل گئی اور جلدی جلدی سب کمروں کے دروازے کھل گئے اور لوگ پیچھے کی طرف بھاگنے لگے۔۔۔ مگر پولیس والوں نے چاروں طرف سے مکان کو گھیر لیا تھا۔۔۔ ایک افسر بڑی شان سے چلتا ہوا اُس عورت کے سامنے آ کھڑا ہوا۔۔۔ عورت نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا اور ایک ادا سے بولی ''صاحب! کیوں دھندے کے وقت ٹائم خراب کرتے ہو۔۔۔ جو چاہیے منہ سے بولو۔۔۔ یہاں آپ کو سب کچھ ملے گا''۔۔۔ اور ساتھ ہی اپنی بائیں آنکھ دبا کر ایک گندا سا اشارہ بھی کر دیا۔۔۔ پولیس والے کے تیور کچھ زیادہ ہی خراب تھے مگر اس موٹی سانڈ کو مردوں کو لبھانے کا فن اچھی طرح آتا تھا۔۔۔ آخر دونوں میں معاملہ طے ہو گیا اور اس نے مجھے اپنے چربی نما سینے سے باہر نکال کر پولیس والے کے ہاتھوں میں دے دیا۔۔۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کی باچھیں کِھل گئیں اور اس نے مجھے اپنی وردی کی اوپری جیب میں ٹھونس لیا۔۔۔ اُف گھٹیا سی کپڑے کی اس وردی میں رشوت کے نوٹوں کی ایک دنیا آباد تھی جس میں ہر سائز اور رنگ کا نوٹ اڑسا ہوا تھا۔۔۔ اُس کی وردی سے بارود اور انسانی خون کی مہک سی محسوس ہو رہی تھی میرا دم اُکھڑنے لگا۔۔۔ وہ حسین خواب جو مجھے دکھائے گئے تھے وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چلے تھے۔۔۔ نرم نرم مخملی ہاتھوں کا لمس۔۔۔ اور خوشبوؤں میں بسی دنیا کی تمنا حسرت بن چکی تھی میری ساری اکڑ، رنگ روپ، کرارا پن اور غرور صرف ایک ہی دن میں ختم ہو گیا تھا۔۔۔ میں اپنے حال پر تڑپ تڑپ کر رو پڑا۔۔۔ فریاد کرنے لگا۔۔۔ مگر میری آہ و بکا سننے والا کوئی نہ تھا۔۔۔ اچانک فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی اور جس کا جہاں منہ اُٹھا وہ بھاگ کھڑا ہوا۔۔۔ بھاگنے کی وجہ سے پولیس والے کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگی اور وہ ٹھوکر کھا کر گرتا چلا گیا۔۔۔ اُس کے سڑک پر گرنے کی وجہ سے میں بھی اُچھلا اور جیب سے باہر جا گرا اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، ہوا کے ایک تیز جھونکے نے مجھے اُڑا کر کنارے پر پڑے ایک پتھر کی اوٹ میں چھپا دیا۔۔۔ اور اب میں دنیا والوں کی نظر سے بچ کر رات کے اس اندھیرے میں دھیرے دھیرے اپنا سانس بحال کرنے لگا۔۔۔ سورج کی پہلی کرن جب میرے چہرے پر پڑی تو میں نے گھبرا کر اپنے چاروں جانب دیکھا مگر کسی انسانی نظر سے مجھے دیکھے جانے کا امکان نہ ہونے پر مجھے تسلی ہوئی اور میں بھی دوسرے کاغذوں کے درمیان اطمینان سے پڑا رہا۔۔۔ پچھلے چوبیس

گھنٹوں کی کہانی میرے دماغ میں گھوم رہی تھی ابھی میں اپنی سوچوں میں گم ہی تھا کہ مجھے سڑک پر ایک خاص آواز جس کے ساتھ دھمک سی بھی محسوس ہونے لگی جواب آہستہ آہستہ میرے قریب آ رہی تھی میں نے پریشان ہو کر آواز کی سمت دیکھا۔۔۔سامنے سے ایک لنگڑا فقیر اپنے ہاتھوں میں بیساکھی لیے جس پر لکڑی کے دو پاٹ لگے تھے جو اُس کے ہاتھوں کو زمین کی رگڑ سے محفوظ رکھنے میں اُس کی مدد کر رہے تھے یہ آواز اُن ہی پاٹوں کی تھی۔۔۔وہ اب مجھ سے قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ہوا بند تھی میں اپنے آپ کو دوسروں کے ساتھ چھپانے کی کوشش کرنے لگا مگر وائے قسمت کے وہ میرے ہی برابر آ کر رُکا۔۔۔

شاید یہ اُس کی روز کی بیٹھنے کی جگہ تھی جب وہ اُس کو صاف کرنے لگا تھا کہ اچانک۔۔۔چپس۔۔۔بسکٹس۔۔۔چھالیہ اور نہ جانے کس کس ریپرز کے بیچ میں بھی وہ مجھے پہچان گیا۔۔۔مجھے دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی اور اُس نے لپک کر مجھے اُٹھالیا۔۔۔اور اپنے ہاتھوں سے مجھ پر لگی گرد صاف کرنے لگا پھر اُس نے پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔۔۔ابھی سڑک سنسان ہی تھی اس سے پہلے کہ کوئی اور مجھے اس کے ہاتھوں میں دیکھتا اُس نے جھٹ سے اپنے چولے سے سوئی دھاگا نکالا اور اپنے اندرونی چولے میں ایک پیوند لگا کر مجھے جلدی جلدی سینے لگا۔۔۔گو کہ اس کے ہاتھ مہارت سے چل رہے تھے مگر سوئی کی چبھن نے مجھے تڑپا دیا تھا میں اب تک بہت سے ہاتھوں میں گیا تھا مگر اس فقیر کا یہ برتاؤ میری سمجھ سے باہر تھا۔۔۔وہ آخری ٹانکا لگا کر دھاگا توڑ ہی رہا تھا کہ ایک کڑک دار سی آواز نے اُسے گھبرا دیا اور سوئی کی نوک اُس کی اُنگلی میں زور سے جا چبھی۔۔۔اور اُس کی چیخ نکل گئی جس پر آگے سے ایک زناٹے دار تھپڑ نے اس کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔۔۔''ابے او۔۔۔یہ تو صبح صبح کمائی کے وقت کس کی ماں کو سی رہا ہے لنگڑے''۔۔۔''وہ۔۔۔وہ استاد قمیض کی سلائی اُدھڑ گئی تھی بس وہ ہی سی رہا تھا۔'' وہ منمنانے لگا۔۔۔میں اُس پیوند کے ایک باریک سوراخ سے جھانک کر صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔۔۔''اچھا اچھا آج شام میں جلدی آ جانا۔۔۔آج سب کا حساب کرنا ہے۔۔۔سمجھا یا نہیں''۔۔۔''جی جی استاد! سمجھ گیا۔۔۔تم فکر ہی مت کرو میں پہنچ جاؤں گا''۔۔۔اور میں اُس کی پیوند لگی بوسیدہ سی قمیض میں سلا ہوا خاموش پڑا تھا۔۔۔پورے دن کی شدید گرمی اور اس گندے فقیر کے پسینے کی بو نے مجھے آدھا پاگل کر دیا تھا مگر اب مجھے اس سے نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا مجھے اپنا مستقبل اب اسی فقیر کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔۔۔جیسے تیسے شام ہوئی اور وہ اپنا سامان سمیٹ کر چل پڑا۔۔۔مجھے کسی سمت کا اب کوئی اندازہ نہ تھا۔۔۔آخر کافی دور آنے کے بعد وہ کسی خاص جگہ داخل ہوا تھا جہاں مجھے عجیب سی بدبو کا بھبکا سا محسوس ہوا۔۔۔''ابے آ گیا تو۔۔۔آ۔۔۔ادھر آ۔۔۔'' وہ چلتا ہوا آواز کی جانب بڑھنے لگا۔۔۔''ابے او لنگڑے۔۔۔آج کل تو کچھ خاص نہیں کما رہا۔۔۔کیوں بے دل نہیں لگ رہا تیرا مانگنے میں''۔۔۔کہیں سے آواز آئی۔۔۔''استاد!۔۔۔آج کل یہ کسی اور ہی چکروں میں ہے''۔۔۔اور پھر اُسی نے استاد کو دیکھ کر کوئی گندا سا اشارہ کیا جس پر وہاں موجود سارے ہی لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔۔۔وہ جھینپ سا گیا اور اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے فوراً ہی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پورے دن کی کمائی استاد کے قدموں میں رکھ دی۔۔۔مگر ابھی بھی استاد کا موڈ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ لنگڑے کو کچھ کہتا ایک ہٹا کٹا۔۔۔چوڑے سینے والا گھبرو جوان استاد کے پاس آیا اور ایک پسٹل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا''استاد۔۔۔ذرا اس کو چیک کرو اس میں گولی پھنس گئی ہے۔۔۔اور اب کسی طرح سے یہ چل بھی نہیں رہا'' استاد نے پسٹل ہاتھ میں لیا اور غور سے اُس کا معائنہ کرنے لگا پھر ہنسا اور بولا''ابے شیدے اس کو جان سے نہیں عقل سے استعمال کیا کر۔۔۔گدھا کہیں کا'' یہ بول کر اُس نے آرام سے پسٹل کا ٹائیگر کھینچا اور پھر نجانے کیا ہوا کہ اچانک گولی چلی اور سیدھے لنگڑے فقیر کے دل پر جا لگی۔۔۔خون کا فوارہ سا اُبل پڑا۔۔۔ایک لمحے کے لیے جیسے وقت رُک چکا تھا۔۔۔اس سے پہلے کہ کسی کو ہوش آتا۔۔۔لنگڑا فقیر اپنی آخری سانس بھی لے چکا تھا۔۔۔جہاں سرخ خون سے اُس کا بے رنگ لباس رنگ چکا تھا وہاں میں بھی اس کے خون میں ڈوب چکا تھا۔۔۔ہر طرف سے خوف میں ڈوبی ہوئی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔۔۔استاد گرجا۔۔۔''خاموش ہو جاؤ سب''۔۔۔کسی نے آواز لگائی''مگر استاد اب اس کا کیا ہوگا؟''۔۔۔کچھ دیر کی خاموشی کے بعد استاد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا کہ اُس کی جیبوں کی اچھی طرح تلاشی لے لو۔۔۔بڑا کمینہ تھا یہ بھیک میں سے بھی چوری کر لیتا تھا۔۔۔پھر اس کی لاش کو پاس والے گندے نالے میں پھینک آنا''۔۔۔میں آنے والے وقت کا سوچ کر ہی لرز کر رہ گیا میرے اندر سے ایک صدا ابھری۔۔۔اُف کوئی مجھے بچا لو میں زور زور سے چیخ رہا تھا مگر یہاں میری آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔۔۔

''نیند رات بھر کیوں نہیں آتی''

موت کب واقع ہوگی سائنس دانوں نے کھوج لگانے کا دعویٰ کر دیا، ایک نئے ٹیکنالوجی نظام کے مطابق انسان اب جان پائے گا کہ اس کی موت کس عمر میں واقع ہوگی۔ سائنسدانوں نے مصنوعی ذہانت کے ذریعے ایک ایسا سسٹم تیار کر لیا ہے جو انسانی جسم کے اعضا کی تصاویر کے ذریعے یہ بتا سکے گا کہ اس کی موت کب ہوسکتی ہے۔ یونیورسٹی آف ایڈیلیڈ کے بنائے گئے اس سسٹم نے 48 مریضوں کے سینے کا معائنہ کیا اور یہ بتا دیا کہ ان میں سے کتنوں کی موت 5 سال کے اندر واقع ہو جائے گی۔ اس سسٹم کی پیش گوئی 69 فیصد درست ثابت ہوئی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ وہ دیگر امراض کے لیے بھی اس جدید ٹیکنالوجی کی مدد حاصل کرنے پر کام کر رہے ہیں تاکہ مستقبل میں دل کا دورہ پڑنے کے عوامل پر پہلے سے قابو پایا جاسکے۔

’’چراغِ عارض ولب‘‘

شاہین

(کینیڈا)

(یہ غزل اطہر رضوی مرحوم کی فرمائش پر اُن کے بیادِ غالب طرحی مشاعرے کے لئے کہی گئی تھی۔ اُن کی شدید خواہش، نیز اُن کی یاددہانی کے باوجود کہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی خودنوشت ’چار جنموں کی کتھا‘ کا ایک نسخہ میری امانت کے طور پر اُن کے پاس موجود ہے جسے میں خود آ کر مشاعرے میں شرکت کے بہانے وصول بھی کرلوں، میں اپنی ذاتی مجبوریوں کے سبب مسی ساگا (ٹورنٹو) جا نہیں پایا۔ احتیاطاً انہوں نے میری غزل منگوالی تھی (جسے بعد کی اطلاع کے مطابق ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے مشاعرے میں پڑھ کر سنایا تھا)۔ غزل میں دونوں متعلقہ حوالے اسی سلسلے کے ہیں۔ شاہین۔)

وحشتِ دل اور ایسی خوش انجام!
خود کو ٹھہراؤں کس طرح ناکام؟

مطربا! بے چراغ ہیں در و بام
اک غزل شامِ دوستاں کے نام

اوڑھ کر دلقِ گردشِ ایام
کر رہا ہوں نئے جہاں کو سلام

میری حیرت ہی زندگی ہے مری
ورنہ یکساں ہیں سارے صبح و شام

نامیوں کی ہے آبرو جن سے
وہی گلیاں ہیں آج بھی بے نام

جھانکتے ہیں نظر نہیں آتے
کچھ جو کعبے میں رہ گئے اصنام

میری یادوں میں وہ سلامت ہیں
جن سے اب ہے کبھی دعا نہ سلام

بڑھ چلا ہے تعلّقِ مہ و سال
بے کلی میں بھی کم نہیں آرام

آنکھ میں اک نشہ اتار گئی
میز پر کی وہ گفتگو سرِ عام

اک اچھوتی نظر کی بارش سے
کھل گیا دُھل کے ایک ایک مسام

عمر کا بڑھ چلا ہے خالی پن
اور بھرے ہیں تمام شیشہ و جام

تیرتے ہیں چراغِ عارض و لب
اور کہاسے میں ڈوبتی ہے شام

چار جنموں کی، ستیہ پال آنند
کر رہے ہیں بیاں، کتھا سرِ شام

نقد و شعر و ادب کا سحرنگار
آشنائے فریبِ دانہ و دام

لفظ و معنیٰ کا تاجدارِ کمال
فکر و دانشوری کا ماہِ تمام

لوٹتے آئے ہیں یہ پنجابی
بات دل کی ہو یا نظر کا مقام

اک جنم میں جو ہم پہ بیت گئی
اس طرح ہے کہ جیسے قیدِ دوام

یوں خجل ہیں کہ منہ اگر کھولیں
کر نہ پائیں کبھی کسی سے کلام

کچھ نہ کہنے کے سینکڑوں دکھ ہیں
گرچہ ہے خامشی بھی اک کہرام

ہے نہاں خود جو ایک وادی میں
حرف کا شہریارِ عرش مقام

یہ غزل آج ہے اسی کی نذر
حاضری کی سبیل ہے یہ کلام

بزم کے ہر شریکِ غالب کو
میرا شاہیںؔ مخلصانہ سلام

○

منظرایوبی

(کراچی)

رابطہ ان سے جب تک معطّل رہا
آنکھیں ہی نم نہیں، دل بھی بے کل رہا

شب زدو! کرلو جی بھر کے کسبِ ضیا
وقت سے پہلے سورج نہیں ڈھل رہا

تو اگر ساتھ ہے، ہاتھ میں ہاتھ ہے
چلنے دے کوئی چالیں اگر چل رہا

آگ اگلتا رہا ہم پہ سورج اِدھر
سایہ افگن اُدھر ان پہ بادل رہا

رُت بھی رنگین ہے سامنے تو بھی ہے
فاصلہ درمیاں کا مگر کھَل رہا

جُز مرے تو کسی کا نہیں ہے تو پھر
آتشِ ہجر میں کوئی کیوں جل رہا

اس کو شاید مرا خون درکا ہے
جو چراغ آندھیوں میں نہیں جل رہا

سب زمانے کسی کی قلمرو میں ہیں
نظمِ ہستی یونہی تو نہیں چل رہا

محوِ حیرت ہے کیوں زندگی پہ مری
میں ترے رزق پہ تو نہیں پل رہا

○

محمودالحسن

(راولپنڈی)

مے میں ہے میکدے میں نہ میخواریوں میں ہے
وہ کیفیت جو عشق کی سرشاریوں میں ہے

گرمی اگرچہ آتشِ دوزخ میں ہے بہت
لیکن کہاں جو عشق کی چنگاریوں میں ہے

تیشہ بکف جو پھرتا رہا ہے تمام عمر
کہتے ہیں اب وہ محوِ شجرکاریوں میں ہے

دار و رسن کی بات نہیں اب تو پیش پیش
زنجیرِ زلف میری گرفتاریوں میں ہے

کل تک میرے یار کو بے رہروی پہ ناز
مصروف اب وہ قافلہ سالاریوں میں ہے

زاہد وہ دلکشی ترے کردار میں نہیں
جو تیری گفتگو کی گہرباریوں میں ہے

زرداریاں بھی اپنی جگہ خُوب ہیں مگر
جو ہے سکونِ قلب وہ ناداریوں میں ہے

ناداں ہُوا ہے شیخ تجھے کیا خبر نہیں
بغض و حسد تو رُوح کی بیماریوں میں ہے

ہر اِک گناہ لائقِ تعزیر ہے مگر
سب سے بڑا عذاب دل آزاریوں میں ہے

لب پر خدا کا نام ہے، تسبیح ہاتھ میں
دل پر خدا کی مار کی زُنّاریوں میں ہے

ہر غم سے بے نیاز ہے محمودؔ اِن دنوں
اب وہ امیرِ شہر کے درباریوں میں ہے

○

پروین کمار اشک

(پٹھان کوٹ، بھارت)

صحرا صحرا مجھکو پینے آتا ہے
مرا سمندر صحرا ہوتا جاتا ہے

اندر مٹّی سونا ہوتی جاتی ہے
باہر سونا مٹّی ہوتا جاتا ہے

رات کی چھت پر اندھی ماں رستہ دیکھے
چاند کو لیکر بالک کب گھر آتا ہے

میرے شہر میں اسّی سال کا اک بوڑھا
بچوں کے گھر میں دیوار اٹھاتا ہے

دل کے زخم پہ مرہم کام نہیں کرتے
دل کے زخم پہ بوسہ رکھا جاتا ہے

سوکھے کھیتوں سے کہہ دو پانی لے لیں
میری آنکھ سے دریا بہتا جاتا ہے

اس کا اک اک آنسو مجھے رلاتا ہے
بھیڑ میں گم اک بچہ مجھے بلاتا ہے

روز شام کو چھپنے سے پہلے اے اشکؔ
سورج مرا چراغ جلا کر جاتا ہے

○

نسیمِ سحر

(راولپنڈی)

(عیدالفطر پر دہشت گردی اور آئل ٹینکر کے حادثوں کے تناظر میں)

ہم سے دِل زدگاں کی عید؟
کیسی عید، کہاں کی عید!

موسمِ گُل کے ماتم میں
گلشن میں ہے خزاں کی عید

مقتل چاروں اَور سجے
خوب ہے شہرِ اماں کی عید

لاشیں اور جنازے تھے
اب کے ہم نے کہاں کی عید

گاؤں جا نہیں پایا مَیں
کیسی ہو گی ماں کی عید!

اُس نے اُداسی ہی دیکھی
جب میرے گھر جھانکی عید

پوچھو مت مُفلِس کا حال
عید پہ اُس نے پھانکی عید

شہر کی عیدیں خوب سہی
لیکن اپنے ''گِراں'' کی عید!

اپنی عید کہاں ویسی
جیسی سارے جہاں کی عید

○

آصف ثاقب

(بوئی،ہزارہ)

نیا غم بھی پرانا سا ہوا تھا
جو دیکھا تھا وہی دیکھا ہوا تھا

وہی ہے آسماں پر جلوہ آرا
زمینوں کا جو ٹھکرایا ہوا تھا

پلٹ آیا ہے شامِ زندگی میں
جو دن کو راستہ بھولا ہوا تھا

بیاباں دیکھتا جاتا ہے مجھ کو
کہ دریا ڈھونڈنے نکلا ہوا تھا

نظر میری ہے نیلی چھت کی جانب
وہاں سرخی سے کچھ لکھا ہوا تھا

میں اپنے دل کو راضی کر رہا ہوں
ہمارے درمیاں جھگڑا ہوا تھا

یہ میری آنکھ کب میلی ہوئی تھی
تری جانب سے دل میلا ہوا تھا

نہیں بھولا تھا میں اوقات اپنی
برابر آئینہ رکھا ہوا تھا

اسی دیوار میں ثاقب کجی تھی
میں جس کے سائے میں سویا ہوا تھا

○

غالب عرفان

(کراچی)

صدیوں کی صداقت ہے ساحل سے سمندر تک
موجوں کی ثقافت ہے ساحل سے سمندر تک
ہر لہر کا اٹھنا پھر گر جانا کنارے پر
پانی کی عبادت ہے ساحل سے سمندر تک
ملاّح کا کشتی میں لہروں کو سبق دینا
آبائی مہارت ہے ساحل سے سمندر تک
ہو شانہ بہ شانہ یا ہو قربتِ جسمانی
جذبوں کی حرارت ہے ساحل سے سمندر تک
ہر دن کا تماشا ہے ہر شام کا میلہ ہے
جیون کی علامت ہے ساحل سے سمندر تک
بارش کی ہوں بوندیں یا گرمی ہو کہ سردی ہو
موسم کی شرارت ہے ساحل سے سمندر تک
پیراکی ہو موجوں میں یا لوگ چٹانوں پر
منظوم عبارت ہے ساحل سے سمندر تک
از وقتِ سحر خیزی تا شامِ شفق تابی
نظروں کی سیاحت سے ساحل سے سمندر تک
موجوں کا مزہ لوٹو یا لطف لو ساحل سے
قدرت کی سخاوت ہے ساحل سے سمندر تک
سمٹے تو سمٹ جائے ساحل میں سمندر بھی
جو پھیلے تو آفت ہے ساحل سے سمندر تک
جو کھینچ کے لائی ہے ہر شہر کے لوگوں کو
وہ کون سی طاقت ہے؟ ساحل سے سمندر تک
ہو رات اماوس کی یا چاندنی پونم کی
لوگوں کی رفاقت ہے ساحل سے سمندر تک
گنتے ہوئے لہروں کو ساحل کا سفر کرنا
عرفانِ مسافت ہے ساحل سے سمندر تک

○

مہندر پرتاپ چاند
(انبالہ، بھارت)

تمام عمر اسیرِ قفس رہا ہوں مَیں
کھُلی ہواؤں کو اب تک ترس رہا ہوں مَیں

سِتم تو یہ ہے کہ تُو بھی مجھے سمجھ نہ سکا
کہ مدتوں سے ترا ہم نفس رہا ہوں مَیں ۔!

یہ ماحصل ہے تمنائے شاد کامی کا
ذرا ذرا سی خوشی کو ترس رہا ہوں مَیں

تری نظر کے اُجالوں کی جستجُو ہے مجھے
جنَم جنَم سے اندھیروں میں بس رہا ہوں مَیں

ہوس کی تُند ہوائیں چلی ہیں جب سے اِدھر
دِل و نظر کی طنابوں کو کَس رہا ہوں مَیں

ہے ناگوار بہت یہ مرے رفیقوں کو
جو اہلِ دل کی نگاہوں میں بَس رہا ہوں مَیں

کبھی جھکا نہ مرا سَر بتوں کے قدموں پَر
کہ بُت کدوں کا ہمیشہ کلَس رہا ہوں مَیں

ملے قرار جو بَرسے ترے کرم کی گھٹا
اَلم کی دھوپ میں کَب سے جھُلس رہا ہوں مَیں

رہا ہے سب پہ کرم پاش چاؔند ! وہ دریا
جو تشنہ کام رہا ہوں تو بَس رہا ہوں مَیں

○

خالد اقبال یاسر
(لاہور)

حفاظت پہ رستہ بدلتا رہوں گا
پہر بعد پہرہ بدلتا رہوں گا

عدو سے مری فوج ہی جا ملی ہے
میں ہر رات خیمہ بدلتا رہوں گا

چھپا کر کہیں تاج و پوشاکِ شاہی
برابر عمامہ بدلتا رہوں گا

مری کھوج میں چار سو لشکری ہیں
میں ہر گام رستہ بدلتا رہوں گا

مقدر میں میرے سفر ہی سفر ہے
ضرورت پہ گھوڑا بدلتا رہوں گا

رعایا کی شورش جو جاری رہی تو
ریاست کا نقشہ بدلتا رہوں گا

جو تاراج ہوتی رہی سلطنت تو
حکومت کا سکّہ بدلتا رہوں گا

زمیں تنگ ہوتی چلی جا رہی ہے
کہاں تک ٹھکانہ بدلتا رہوں گا

وہی تخت ہو گا وہی مہرِ سلطاں
فقط اپنا چہرہ بدلتا رہوں گا

○

دو ادھورے سائے

محمد امین الدین
(کراچی)

نلکے سے ٹپ ٹپ گرتے پانی کو میں نے روکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پانی گرنے کی رفتار بہت زیادہ تو نہ تھی مگر کہتے ہیں کہ قطرہ قطرہ گر کر ٹینک خالی بھی ہوسکتا ہے۔ بات بہت معقول تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر نل باندھنے کے لیے کپڑا تلاش کیا جو کہ بلا آخر مجھے مل گیا۔ میں نے کنار پھاڑی تو کپڑا پھسل گیا۔ غالباً کپڑا چکناہٹ زدہ تھا۔ میری بیوی ایک چھوٹی قینچی دراز میں ہمیشہ رکھتی ہے میں نے دراز کو کھنگالا قینچی نہ ملی۔ میں نے موبائل جیب سے نکالا۔ بیوی کا نمبر تلاش کیا اور کال کرنے کی مخصوص جگہ کو ہلکا سا پُش کیا۔ چند ساعتوں بعد دوسری طرف سے عابدہ کا ایک مقبول گیت ''ارے لوگو تمہارا کیا، میں جانوں میرا خدا جانے'' بجنے لگا۔ میری بیوی کو عابدہ کا یہ گیت بے حد پسند ہے۔ تب ہی اس نے اپنی رنگ ٹیون بنا رکھا ہے۔ اس سے پہلے اس نے ایک مذہبی عالم کی تقریر کا ایک مخصوص ٹکڑا چن رکھا تھا اور اس سے پہلے بھی میرے ساتھ کوئی رات گزاروالا گانا انتخاب کیا تھا۔ اتنی متضاد سوچ کے باوجود کالج میں اسلامیات پڑھاتی ہے۔ میں اس سے اکثر پوچھتا ہوں کہ تم میں سنجیدگی کب آئے گی، وہ جواب دیتی ہے کہ تم ایک ڈھنگ کا افسانہ لکھو میں اپنے اندر ٹھہراؤ اور سنجیدگی لے آؤں گی۔ بھلا بتلایئے یہ کوئی بات ہوئی۔ میں بحث کرسکتا تھا مگر نہیں کی۔ گانے کے بول ختم ہونے سے پہلے اس نے ہمیشہ کی طرح کال ریسیو کرلی۔ بولی:

''میری نیند خراب کر دی آپ نے۔ دوا کھا کر سوئی تھی۔ اب بتائیں کیوں فون کیا؟'' اس کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

''ڈاکٹر نے تمہیں پانچ دن دوا کھانے کو کہا تھا'' میں نے یاد دلایا۔

''آج چوتھا دن ہے۔'' وہ بولی۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔'' میں نے یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے اماں کے گھر آئے ہوئے دو ہی دن ہوئے ہیں اور آنے سے ایک دن پہلے ڈاکٹر سے دوا لی تھی۔'' اس نے تفصیل بتاتے ہوئے پوچھا۔ ''فون کیا کیا تھا، آپ اس وقت کیا کر رہے ہیں؟''

''کچن میں ہوں، چائے بنا رہا ہوں۔ بس تمہاری خیریت پوچھنا تھی۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

نلکے سے گرتے پانی کی آواز نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا تو مجھے یاد آیا کہ میں قینچی تلاش کر رہا تھا اور بیوی کو فون اسی لیے کیا تھا۔ مجھے خود پر غصہ آیا کہ میں نے اس کی نیند بھی خراب کی اور اصل مسئلہ بھی حل نہیں کیا۔ کیا میں اس قدر بھلکڑ ہو گیا ہوں؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ یکا یک مجھے یاد آیا کہ میں نے چولہے پر چائے کا پانی چڑھایا ہوا ہے۔ میں جلدی سے اس کی طرف بڑھا۔ پانی اُبل رہا تھا اور خوب جوشیلے انداز سے دیگچی سے چھلکنے کو بے تاب تھا۔ میں نے فریج میں سے دودھ کا ڈبا نکالا۔ ڈبا ہاتھ میں آتے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اب خالی ہے۔ ڈبا اگر خالی ہو چکا تھا تو مجھے اس کو ڈسٹ بن میں ڈالنا چاہیے تھا۔ فریج میں واپس کیوں رکھا۔ میں نے غور کرنے کی کوشش کی مگر مجھے یاد نہیں آیا۔ میری بیوی یہ سارے کام کسی روبوٹ کی طرح انتہائی ترتیب سے کرتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ صلاحیتیں اس میں پہلے سے تھیں کہ خوف کے تنے ہوئے تار پر لٹکی ہوئی زندگی نے اسے ایسا بنا دیا تھا۔ مگر جو بھی تھا اس نے وہ خوش دلی سے قبول کر رکھا تھا۔ دھیان میں اُبھرنے والی اس کی تصویر پر تعریف کے پھول چڑھاتے ہوئے میں نے الماری سے نیا ڈبا نکالا اور اس کا کونا تراشنے کے لیے قینچی تلاش کرنے لگا۔ تینوں درازوں میں قینچی کا سراغ نہیں ملا۔ تب مجھے یاد آیا کہ تھوڑی دیر پہلے کپڑے کی کنار کاٹنے کے لیے بھی قینچی درکار تھی جو کوشش کے باوجود نہیں ملی تھی۔ شاید بیوی ادھر اُدھر کہیں اور رکھ کر چلی گئی ہے۔ چلو اُس سے ہی پوچھ لیتا ہوں۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے جیب سے موبائل نکالا۔ اسکرین پر سب سے اوپر اسی کا نام جگمگ کر رہا تھا۔ میں نے اس کے نام کو پڑھ کر مسکراتے ہوئے پش کا بٹن دبا دیا۔ میں اُسے جگنو کہا کرتا ہوں۔ برسوں پہلے میں نے اسے جگنو کہنا تب شروع کیا تھا جب ہمارے ہاں اکلوتے بیٹے کی پیدائش ہوئی تھی۔ جگنو جسمانی عارضوں کی وجہ سے کوئی دوسری اولاد پیدا نہ کرسکی تھی مگر ہم دونوں خوش تھے۔ ہماری زندگی میں رونق آ گئی تھی۔ مگر یکا یک وہ حادثہ ہو گیا۔ دس سال کی عمر میں وہ اسکول سے واپسی پر اپارٹمنٹ کی لفٹ میں سوار ہونے کی کوشش میں لفٹ کی غیر موجودگی کو محسوس نہ کرتے ہوئے کھلے دروازے سے گر کر اندھی کھائی میں اُتر گیا تھا۔ جگنو نے ایک دن میرے گلے لگ کر روتے ہوئے کہا کہ ہماری روشنی چلی گئی اب آپ مجھے کبھی جگنو مت کہنا۔ یہ سُن کر میں بھی بلک بلک کر رو پڑا تھا۔ ہم دونوں کو ڈھارس دینے والا گھر میں کوئی تیسرا نہیں تھا ہم خود ہی خاموش ہو گئے۔ مگر میں اپنی بیوی کو اب بھی جگنو ہی کہہ کر پکارتا ہوں۔

میری ساعتوں میں ''ارے لوگوں تمہارا کیا، میں جانوں میرا خدا جانے'' کے بول گونج رہے تھے۔ ابھی مکھڑا ادھورا ہی تھا کہ اس کی آواز اُبھری۔

''آپ خود بھی نہیں سو رہے ہیں اور مجھے بھی نہیں سونے دیں گے۔ بولیں کیا بات ہے؟'' اس کے لہجے میں دھیما سا غصہ تھا مگر وہ میری باتوں پر غصہ کم ہی کرتی ہے۔ خصوصاً بیٹے کے انتقال کی پہلی برسی والے دن سے جب اُس کا فوٹو البم دیکھتے ہوئے اچانک میرے بائیں دھڑ پر لاکھوں چیونٹیاں سرسرانے لگیں۔ چند ہی ساعتوں میں یوں لگا جیسے میرا بایاں بازو اور ٹانگ اپنا وجود کھو بیٹھے ہوں۔ میں آدھا جسم ناکارہ ہونے پر حیران اور جگنو خوف زدہ تھی۔ پھر بھی وہ میرے

بھاری بھرکم اور فالج زدہ وجود کو جیسے تیسے ہسپتال لے کر دوڑی۔ دس دن ہسپتال میں گزار کر لوٹا تو جگنو کی آنکھوں پر خوف اور بے یقینی سیاہ حلقوں کی صورت میں نمایاں تھے۔

''تمہیں یاد ہے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ نوکٹا مڈ نیند نہ آنے کی صورت میں کھائیں ورنہ نہیں۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''میں نے وہ نہیں کھائی تھی، مگر اب کھانا پڑے گی۔ کیا آپ نے مجھے یہ ہی بتانے کے لیے فون کیا ہے؟''

''نہیں نہیں ایسے ہی۔ واپس کب آؤ گی؟'' میں نے پوچھا۔

''بتایا تو تھا کہ اماں کے عمرے سے واپسی تک رکوں گی۔'' وہ بولی۔

''اماں کب آئیں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ ٹکٹ آپ نے خود بنوائے تھے۔ آپ کو ہی یاد نہیں۔'' اس کے لہجے میں دھیمی سی جھنجھلاہٹ تھی جسے وہ ضبط کرنا چاہتی تھی۔

''اچھا تم سوجاؤ۔'' میں نے کہا۔

''اب مجھے نوکٹا مڈ لینا ہی پڑے گی۔''

کال منقطع ہوگئی۔ دودھ کا ڈبا کاٹنے کے لیے قینچی درکار تھی اور میں وہی پوچھنا ایک بار پھر بھول گیا تھا۔ چار دن پہلے ڈاکٹر نے ہمیں بتایا تھا کہ جگنو اعصابی تناؤ کا شکار ہے۔ میں اس کی اُلجھنوں سے آگاہ تھا اور ایسے میں اُس کے ساتھ سائے کی طرح رہنا چاہتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ سائے کی طرح رہنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ مجھ سے زیادہ جانتی ہے کہ زندگی میں کچھ اور رشتے بھی ہوتے ہیں جو ہمارے اپنے رشتوں کو مضبوط بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ میرے ساتھ سائے کی طرح رہنے کی عادت اور خواہش کے باوجود کچھ دنوں کے لیے اماں کے ہاں چلی گئی تھی۔

یکا یک میری نگاہ چائے کی کیتلی پر پڑی جس میں پانی اُبل اُبل کر آدھا رہ گیا تھا۔ پانی کے جوشیلے اُبال کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے خود سے سوال کیا۔ کیا میں نے شکر اور چائے کی پتی ڈالی تھی؟ میری یادداشت کے خانوں سے کوئی جواب برآمد نہیں ہوا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ قینچی تلاش کر کے ڈبے کا کونا تراشنے اور دودھ انڈیلنے سے پہلے یہ جاننا ضروری تھا کہ پانی میں شکر اور چائے ڈالی گئی ہے کہ نہیں۔ مگر یہ سب کیسے جانا جاتا ہے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سنک میں نلکے سے پانی اب بھی ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ کپڑے کی کترن نل کے سوراخ پر باندھ کر پانی روکا جا سکتا ہے۔ کپڑا موجود تھا مگر اسے کاٹنے کے لیے قینچی درکار تھی جو درازوں میں تلاش کرنے کے باوجود مل کر نہیں دے رہی تھی۔ مجھے یاد آیا میں نے بیوی کو اس حوالے سے فون کیا تھا مگر مجھے پھر یہ بھی یاد آیا کہ میں نے اُس سے قینچی کا کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ ماربل کے سلیب پر دھرے دودھ کے ڈبے کا کونا تراشنے کے لیے بھی قینچی کی ضرورت تھی اور میں نے جگنو کو دوسری بار فون کیا تھا۔ مگر قینچی کے ساتھ اس کا سوال بھی کہیں گم ہو گیا تھا۔ اس بار میں نے قینچی کے سوال کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا اور ایک بار پھر جگنو کو کال ملائی۔

''اب کیا ہو گیا؟'' جگنو کی دھیمی مگر پریشان اور نیند میں ڈوبی آواز ابھری۔ ''اب تو میں نے نوکٹا مڈ بھی کھا رکھی ہے۔ ڈاکٹر نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اسے کھا کر فوراً لیٹ جائیں۔''

''یار جگنو چائے کا پانی اُبل رہا ہے اور مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں نے اس میں شکر اور چائے کی پتی ڈالی تھی کہ نہیں۔'' میں ایک بار پھر قینچی کا سوال کرنا بھول گیا۔

''کیا مطلب'' اُس کی حیرت میں ڈوبی آواز اُبھری۔ میں نے اپنی بات دوبارہ دہرائی تو وہ بولی۔

''چائے آپ جب پئیں گے تو شکر کا پتا چل جائے گا۔ لیکن چائے کی پتی تو پانی میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس میں تو کوئی اُلجھن ہی نہیں ہے۔''

''یار واقعی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے خجالت سے کہا۔

''کیا آپ تب سے چائے ہی بنا رہے ہیں۔ لگتا آپ نے چائے کو ایک مسئلہ بنا دیا ہے'' اس نے کہا تو مجھے صحیح مسئلہ یاد آ گیا۔ میں بولا۔

''ارے ہاں یاد آیا! وہ قینچی نہیں مل رہی ہے۔ دودھ کا ڈبا کاٹنا ہے۔''

''کمال کرتے ہیں آپ بھی، قینچی اگر نہیں ہے تو چھری سے کاٹ لیں۔ اس میں کیا پریشانی ہے۔'' اس نے حیران ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''اف توبہ ہے یار، میں بھی کتنا احمق ہوں، اتنی سی بات نہیں سمجھ سکا۔'' میں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ تب وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''جیسے آپ کے افسانے بغیر کہانی کے ویسے ہی آپ کی چائے بغیر پتی کی۔ آپ سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں صبح واپس آ رہی ہوں۔''

اندرونِ لاہور

اندرونِ لاہور کی بعض گلیاں اتنی تنگ و تاریک ہیں کہ اگر ایک طرف سے کوئی خاتون آ رہی ہوں اور دوسری جانب سے مرد، تو درمیان میں صرف نکاح کی گنجائش بچتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی

''بھنور''

نیئر اقبال علوی
(لاہور)

ماروی نے بہتیرے ترلے واسطے کیے، ہاتھ جوڑے، زندگی سے مالا مال سیاہ چمکدار آنکھوں سے بھی اسے قائل کرنے کی سعی کی کہ جانے سے قبل ناشتہ کرلو۔نہ جانے کب واپسی ہو،مگر۔۔۔اس کی ایک ہی ضد کہ سورج کی اولین کرنوں کے ساتھ ہی مچھلی بدک کر کناروں سے کھلے سمندر کی جانب پلٹنے لگتی ہے۔

گذشتہ کئی دنوں سے وہ معقول شکار گھر لانے میں ناکام رہا تھا۔روز روز خالی ہاتھ لوٹنے کی ندامت کے علاوہ بیوی اور تین کم سن بچیوں کی فاقہ زدگی۔۔۔ہر دم آزردہ رہنے کا موجب تھی۔غالباً یہی خجالت اس کی طبیعت کو درشت اور مزاج کو اکھڑ بنانے کی اساس بنی جو نہ چاہتے ہوئے بھی صبح صبح بیوی کو ڈانٹ پلا دی۔وگرنہ ماروی سے اتنا شدید لگاؤ، ایسی الفت کہ اسکے منہ سے نکلنے والی بات کو رد کرے۔بھلا اس کی کیا مجال۔وفادار و جاں نثار بیوی صورتِ حال سے مکمل آگاہ،تبھی تو ہنسی خوشی شوہر کی سرزنش کو ہضم کر گئی۔

پو پھٹنے میں ابھی کافی دیر تھی۔آکاش ہنوز خوابیدہ سمندر پہ جھکے روشن و تابناک ستاروں سے جگمگا رہا تھا۔لیکن۔۔۔ماہی گیروں کی بستی میں دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ساگر کی لہریں تواتر کے ساتھ سنگلاخ کناروں سے جنونی عاشقوں کی مانند سر پٹخ پٹخ کر بڑا سریلا ردھم پیدا کر رہی تھیں۔سینکڑوں کی تعداد میں لنگروں سے بندھی چھوٹی بڑی کشتیوں کے چوبی تختے آبی ریلوں میں چرچراہٹ پیدا کر کے فضا کو کیف آور بنا رہے تھے۔معلوم پڑتا، جیسے فطرت نے ساحلِ سمندر پر اپنے سازوں کے ساتھ ایک سمفنی ترتیب دے رکھی ہو۔بستی کی تاریک راہوں پر اِکا دُکا مچھیرے جال،چپو، ڈوریاں،کھونٹیاں سنبھالے کشتیوں کی جانب لپک رہے تھے۔ ان کی سبک چاپوں سے گلی کے آوارہ کتے خوف زدہ ہو کر بلند آواز میں بھونک بھونک کر سکوتِ شب توڑنے کے ساتھ ساتھ آغاز کار کا ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے۔

بعض جھونپڑوں سے ملحقہ خالی قطعہ اراضی پر بنے مٹی کے چولھوں اور تندروں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔اکثر خواتین نیند سے بیدار ہو کر شکار پر جانے والے مردوں کے ناشتوں کا اہتمام کر رہی تھیں۔سیاہ آسمان کی بے کراں وسعتوں میں اَن گنت جگمگاتے ستارے،دھرتی پہ بسنے والے ان مجبور و بے کس خاک نشینوں کو تماشائی بنے شوق و تعجب سے دیکھ کر ان کی خستہ حالی پہ خندہ زن تھے۔

ماروی نے رات کی دو باسی روٹیاں اور جھینگے کا بچا کھچا سالن پلاسٹک کے ڈبے میں ڈال کر شوہر کے حوالے کیا اور وہ درود شریف کا ورد کرتا، اچھے شکار کی امید دل میں بسائے گھر سے نکل کر گھاٹ کی سمت ہولیا۔

راہ میں ملنے والے ساتھیوں سے علیک سلیک، شکار کی بتدریج کمیابی کا رونا، ماحول کی آلودگی اور فیکٹریوں کے فضلے سے برباد ہوتی ہوئی آبی حیات کا تذکرہ، اور حکومت کی جانب سے آبائی جزیروں کو مالدار عربی شیوخ کے ہاتھوں فروخت کرنے کی افواہوں پر گہری تشویش اور اظہار برہمی۔علی الصبح مفلسی و کم مائیگی کا رونا روتے اپنی اپنی بیڑیوں میں سوار ہو کر مانجھیوں کے صدیوں پرانے سندھی گیت بلند آوازوں میں گاتے ہوئے پھر بپھرے سمندر کے تاریک دامن میں یوں غائب ہوئے جیسے کوئی حقیر سی بے وقعت شے بلیک ہولز میں جا کر آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

جال سمندر میں پھینکے عرصہ بیت گیا۔مشرقی افق سے نمودار ہونے والے آفتاب کی کرنیں سپیدۂ سحر میں سرمئی، بنفشی اور ارغوانی رنگوں کی آمیزش کرنے لگیں۔قوس کی صورت سمندر کا مشرقی کنارہ ہولے ہولے روشن ہونے لگا۔دودھیا سفید بگلوں کے غول، ماہی گیروں کی کشتیوں پر دیوانہ وار منڈلا کر نظارہ حسن کو چار چاند لگانے لگے۔ان کی چہکاریں اور قوی پروں کی پھڑ پھڑاہٹیں، مچھلیوں کو سراسیمہ کیے دیتیں۔ہلکی ہلکی ہوا کے خوشگوار جھونکے موجوں کو سینۂ سمندر پر بڑے سلیقے کے ساتھ جانبِ ساحل دھکیل رہے تھے۔طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہانکے لگانے کے جوش و اضطراب میں اضافہ ہونے لگا۔ماسوا چند چھوٹی مچھلیوں اور کیکڑوں کے کوئی قابلِ ذکر مچھلی جال میں نہ پھنسی۔اپنے اضطراب و ذہنی خلفشار پر قابو پانے کی غرض سے خود کو مصروف کرنے کا فیصلہ کیا۔بھوک نہ ہونے کے باوجود پوٹلی کھولی، بیوی کی دی ہوئی باسی روٹی اور کیکڑے کا بدمزہ سالن زہر مار کرنے لگا۔غالباً چھوٹی سی دنیا میں خود کو مصروف رکھنے کا اس کے پاس کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا۔

ارد گرد اور فاصلوں پر پھیلی ہوئی دیگر کشتیوں اور لانچوں کی تعداد دھیرے دھیرے گھٹتی جا رہی تھی۔غالباً ہوا کی بتدریج بڑھنے والی رفتار کا خوف دامن گیر یا پھر اطمینان بخش شکار کے باعث ہونے والی راحت کا احساس ان کو گھروں کو لوٹنے پر مجبور کر رہا تھا۔لیکن وہ آج خالی ہاتھ لوٹنے پہ قطعاً آمادہ نہ تھا۔ اپنے اوپر طاری ہونے والی یاسیت اور تلملاہٹ اس کی سُدھ بُدھ پر حاوی ہو کر اسے اس ادراک سے محروم کیے جا رہی تھی کہ لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی ہوئی ہوا اس کو کہاں لیے جا رہی ہے۔آفتابی تمازت تیز آری کے مانند بدن کو کاٹنے اور تند نمکین ہوا، مساموں میں تیزاب انڈیلنے لگی۔سر پہ رکھی رنگین دھاگوں کی کڑھائی والی سندھی ٹوپی کے اوپر بڑے سے پگڑ کے ساتھ چہرہ اور آنکھیں ڈھانپے، کشتی کے چوبی کنارے سے ٹیک لگائے، دونوں کان جال سے اٹھنے والی چھوٹی سے چھوٹی سرسراہٹ سننے کے واسطے چوکس و بے تاب، نیلے ساگر کی ہلکی لہریں کشتی کو یوں ہلکورے دے رہی تھیں جیسے ماں پالنے میں لیٹے بچے کو سلانے کی غرض سے اسے تواتر کے ساتھ متحرک رکھتی ہے۔اور پھر ایک۔۔۔عجیب تیز رفتاری سے اُسے اپنی نیا کسی بھنور کی زد پر گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔کبھی گہرائی میں جاتے جاتے اس کا دل

یک لخت بیٹھنے لگتا تو دوسرے پل کوئی انجان طاقت اسے کشتی کے ساتھ زیرِآب دوسری جانب کھینچتی ہوئی لگتی۔ تاریکی کی دبیز تہہ میں وہ کچھ دیکھنے سے سراسر قاصر۔ البتہ تیز رنگوں والی جھلملاتی بڑی سی عجیب وغریب مچھلی اسے تیزی سے اپنے پیچھے کھینچ رہی تھی۔ اس کے دل میں ناگہاں گماں گزرا کہ وہ پاتال کی جانب محوِسفر ہے۔

ذرا دیر میں اس کی ناؤ ایک پُراسرار جزیرے کے محیرالعقول ساحل پہ نمودار ہوئی۔ تب اس نے جانا کہ جھلملاتی اور رنگ برنگی شعاعیں بکھیرنے والی کوئی عام مچھلی نہیں بلکہ یہ نہایت حسین وجمیل جل پری تھی۔ جس نے بڑے تپاک کے ساتھ مسکراتے ہوئے غریب مچھیرے کا ہاتھ تھام کر کشتی سے اترنے میں مدد فراہم کی۔

نووارد کو اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آ رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس جزیرے پر جل پریوں، انسانوں، چرند پرند اور دیگر آبی مخلوق کو مساویانہ سطح پر شانہ بہ شانہ یکساں افرادِ معاشرہ کے مانند باہم زندگی بسر کرتے دیکھ رہا تھا۔ ساتھی جل پریوں نے نہایت فراخدلی اور مروت کے ساتھ اسے اپنے جزیرے پر خوش آمدید کہا۔ سُچے موتیوں سے مرصع زرق برق ریشمیں پوشاک اور ہیرے جواہرات سے مزین شاہانہ تاج پہنا کر نوع بہ نوع طعاموں سے اس کی سیوا کی گئی۔ یہ بات جان کر وہ حیران ہوا کہ ہر پردیسی کے ساتھ ایسا والہانہ رویہ یہاں کا دستور ہے۔ ماہی گیر اس آؤ بھگت پر دل ہی دل میں بے حد مسرور وشاداں تھا۔ جل پریوں کے ایک گروہ نے اسے اپنے دلفریب علاقے کی سیر کروائی۔ پورا علاقہ ایک مافوق العقل، جادوئی معاشرہ، سلیقہ، صفائی، توازن وتناسب، کیف وسرور یہاں کی ہر شے سے ٹپک رہا تھا۔ اجنبی ماہی گیر وہاں کے حسین وجمیل مناظر، دیدہ زیب گھروندوں، نیک خو، پاکباز لوگوں، طلسماتی طریقہ حیات، صاف وشفاف اور اجلی اجلی نباتات کو دیکھ کر سخت متعجب ہوا۔

ہر جانب امن وآشتی، سکون ولطافت، زندگی میں سلجھاؤ اور فارغ البالی، حزن وخوف سے بے نیاز شہری، ہنستے مسکراتے، تنومند وشاداب چہرے۔۔۔ حیوان وانسان بھائی چارے کی فضا میں آزادانہ سانس لیتے اُسے بے حد بھائے۔

اس کو حیران وپریشان دیکھ کر اڑتی ہوئی فاختہ نے یک دم نچلی اڑان بھری اور مہمان کے کاندھے پر بلاخوف وخطر آن بیٹھی۔ اس سے قبل کہ ماہی گیر زبان کھولتا، فاختہ ترت بولی۔ اے اجنبی! اپنے دیش میں تجھے خوش آمدید کہتی ہوں۔ میں امن کی آشا لیے تمہارے پاس آئی ہوں۔ مجھے تمام جہانوں میں امن کی سفیر مانا جاتا ہے۔ اگرچہ تمہاری دنیا کے لوگ میرا احترام نہیں کرتے، تاہم میری آشا اور میرا پیغام یہی ہے کہ تم سب انسان اپنی دھرتی پر مل جل کر احترام، بھائی چارے، عدل وانصاف، فراخدلی اور محبت کے اصولوں کے تحت زندگی بسر کرنا سیکھو۔ تب تم بھی ہماری مثل پُرامن معاشرے قائم کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ فاختہ نے اپنا ایک ننھا سا سرمئی پَر مچھیرے کے کان میں اڑسا اور پھُر کر کے فضاؤں میں اوجھل ہوگئی۔ معاً ماہی گیر کے دلِ آزردہ میں آرزو مچلی کہ کاش! میری زمین کے لوگ بھی اس مخلوق جیسی زندگی گزارنا سیکھ لیں۔

اور پھر۔۔۔ کسی سٹیمر کے طاقت ور انجن کے شور نے اس کے سہانے وسعتوں کی دنیا کو بھک سے اڑا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر گہری نیند کی آغوش سے بیدار ہوا۔ اس کا ادراک اس یقین سے قطعاً نابلد تھا کہ وہ کتنی دیر سویا۔ البتہ ڈراؤنی وردیوں میں ملبوس غیر مانوس انسانوں کی غیر مہذب واخلاق باختہ آوازوں نے خواب کا سارا مزہ کرکرا کر ڈالا۔ خواب ماضی اور وقوعہ حال میں بمشکل چند ثانیے حائل تھے مگر اس رتی بھر فرق، اس حقیر سے وقفے نے اسے ششدر وسراسیمہ کر ڈالا۔ وہ ذرا چونکا، حواس بحال ہوئے کچھ سنبھلا تو خوف کے مارے تھرّا گیا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی۔

دوسرے ملک کے کوسٹ گارڈز کے ہتک آمیز ونامعقول سوالوں کا بدقسمت کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ ٹھڈوں اور دھکوں کے ساتھ چند ساعتوں میں مشکیں کس کر غریب ماہی گیر اور اس کی کشتی کو فاتحانہ انداز میں اپنے ساتھ لے گئے۔ اور وہ نادان دل ہی دل میں سوچتا رہ گیا کہ اس کا قصور آخر کیا تھا۔ اس نے تو ایک بھی مچھلی شکار نہ کی تھی۔

شام ڈھل گئی۔۔۔ تیرگی نے بستی کو سیاہ قبا پہنانا شروع کر دی۔ بگلوں کے غول تھک ہار کر بالآخر فضا کی پہنائیوں میں تحلیل ہونے لگے۔ کائنات پر آہستہ آہستہ سکوت چھانے لگا۔ بے چاری ماروی نے اڑوس پڑوس کے جھگیوں کے مکینوں کو شوہر کی گمشدگی سے آگاہ کیا۔ آناً فاناً چند ماہی گیر ہاتھوں میں لالٹینیں اور لاٹھیاں اٹھائے، کشتیوں میں سوار ہو، اپنے گمشدہ ساتھی کی تلاش میں نکلے، لیکن بدقسمتی سے تیز ہوا کی وجہ سے مدّ وجزر اتنا شدید کہ کشتیاں ناتواں تتلیوں کی مانند بپھری ہوئی موجوں کے سینے پر ڈولنے لگیں۔ لاچار اپنی جانوں کی خیر مناتے۔۔۔ وہ گھروں کو پلٹے۔ ماروی کو صبر کی تلقین کی کہ شاید پڑوس کے کسی جزیرے پر رک گیا ہو۔۔۔ صبح تک لوٹ آئے گا۔۔۔ اور پھر ان گنت صبحیں، کئی ماہ، کتنی ڈستی ہوئی راتیں، کتنے سال کرموں پھوٹی بیوی نے اسی جان لیوا انتظار کی نذر کر دیے کہ۔۔۔ شریکِ حیات کب پلٹے گا۔

پہلے پہل ماروی نے بین کیے، بال نوچے، کپڑے پھاڑے، کنگن توڑے، قبیلے کے بزرگوں نے ہمدردی جتائی، بوڑھیوں نے گلے لگایا۔ اشک شوئی کی، بڑوں نے شفقت بھرے ہاتھ سر پہ رکھے۔ بے آسرا، پھول سے بچوں کی کفالت کے چند روز، چند ہفتے ایسے مظاہرے دیکھنے میں آئے، رفتہ رفتہ ہر ہمدردی، ہر دلجوئی، ہر وچن ماضی کی دھول میں نام ونشان چھوڑے بغیر معدوم ہوتے چلے گئے۔ وقت کے مجرب مرہم نے ماروی کے زخم خوردہ دل سے شریکِ حیات کی جدائی کے داغوں کو مندمل کر ڈالا۔ تین بچیوں کی پرورش کی ذمے داری کے تصور نے اس سوگوار کو ٹوٹ پھوٹ سے بچا کر ہمت واستقامت عطا کی۔ وہ

تگ و دو کرنے پر مجبور ہوئی اور پیٹ کی آگ بجھانے کو دن کے وقت مچھیروں کے جھونپڑوں میں جا کر جال مرمت کرنے لگی۔

علاوہ ازیں۔۔۔جان جمالی دھیرے دھیرے کسی بن بلائے مہمان کے مانند اس کی زندگی کے نیم تاریک دریچوں میں جھانکنے لگا۔ تین بچیوں کی ولادت اور جنم جنم کی فاقہ کشیوں نے گو اس کے رنگ روپ کو متاثر کیا تھا۔ تاہم نوعمری، جفاکشی اور سخت کوشی نے ہنوز اس کے خدوخال کے تناسب کو قائم رکھا ہوا تھا۔ اس کا سراپا چکنی سیاہ مٹی کی طرح چمکدار اور گٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہر انگ میں سندرتا کی ابھرتی جھلک۔ جان جمالی ملحقہ جزیرے سے کشتی کھیلتا، ان کی بستی میں اشیائے خوردونوش کے چند تھیلے، بچیوں کے لیے ٹافی، گولی لاتا اور جاتے سمے ماروی کی حنا لگی خوشنما ہتھیلی پر کبھی کبھار نقدی بھی دھر جاتا۔ پہلے پہل ماروی کو یہ سب کچھ ایک آنکھ نہ بھایا۔ اس کو اپنی روح اجنبی شخص کے پاؤں تلے تڑپتی، تلملاتی، کڑلاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خود سے گھن آتی۔ آنے والے کے ساتھ بے نیازی برتنے کے علاوہ درشت لہجہ روا رکھتی۔ مگر جنسِ مخالف کی کشش سے بڑھ کر مفلسی کے خونخوار اور کاٹ دار خنجر نے اسے اپنے رویے پہ نظر ثانی کی ترغیب دی۔ تب وہ برف کے مانند پگھلنے لگی اور بلاآخر وہ وقت بھی چلا آیا جب شدت کے ساتھ اس کا انتظار رہنے لگا۔

سات سالہ طویل مدت کے بعد بیوی کو خاوند کی موت کا پختہ یقین ہو گیا۔ اہل بستی تو پہلے ہی اسے باور کروا کر تھک چکے تھے کہ تمہارا شوہر کشتی سمیت بحیرۂ عرب میں غرق ہو چکا ہے۔ جان جمالی کے متعدد پیغامات کو آخرالامر قبولیت کا درجہ نصیب ہوا۔ ماروی نے از سر نو ایک بھرپور جیون گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ شادی کے لیے طرفین نے چار ماہ کی مدت رضامندی کے ساتھ مقرر کی۔

بمشکل دو ماہ کا عرصہ بیتنے پر ایک روز بستی کے سرپنچ کو حکومتی مراسلہ موصول ہوا۔ کسی انسانی حقوق کی تنظیم نے ''امن کی آشا'' پروگرام کے تحت جذبہ خیر سگالی کو بروئے کار لاتے ہوئے دونوں ممالک کے مابین قیدیوں کے تبادلے کا بندوبست کیا۔

غیر متوقع طور پر لسٹ میں فقیر لکھیو کا نام دیکھ کر بستی کے مکین سخت حیران ہونے کے ساتھ خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ آناً فاناً ہر جگہ یہ خبر پھیل گئی کہ وہ 13 اگست براستہ کھوکھراپار وطن واپس آ رہا ہے۔ یکا یک سات سال قبل پُراسرار طور پر غائب ہونے والے ساتھی کی باتیں زبان زدِعام ہو گئیں۔ پوری بستی عجیب وغریب کیفیات سے دوچار ہو گئی۔ لیکن ماروی کے مکھ پر مچلنے والی مسرت، رونق اور طمانیت دیدنی تھی۔ اس کا اداس چہرہ یک بہ یک شگفتہ و شاداب، اس کی پژمردہ ناامید آنکھیں پھر سے جینے لگیں۔ ان میں فرحت و تسکین کی موجیں مچلنے لگیں۔ اس کا نیم مردہ سراپا تازہ پھول کی مانند کھل اُٹھا۔ جان جمالی کا تصور یوں دل سے جھٹکا جیسے اس کا کبھی وجود نہ تھا۔

فقیر لکھیو کے بھارتی قید سے رہائی پا کر گھر آنے سے چند روز پیشتر اُڑتی اُڑتی خبر ماروی کے کانوں میں پڑی کہ جان جمالی عنقریب دبئی نقل مکانی کا قصد کر رہا ہے۔ مگر اس خبر کا اس پر قطعاً کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بالکل افسردہ یا دلبرداشتہ نہ ہوئی۔

ماہی گیروں نے حسب توفیق اپنے گھاس پھونس کے جھونپڑوں کو سجایا، سنوارا، رنگ برنگی جھنڈیاں ہر سو لہرائیں۔ باہر سے آنے والے ریتلے راستے پر دو رویہ سفید چونا بکھیرا۔ یہ ساتھی کے استقبال کی تیاریاں تھیں۔ لوگوں کا جوش و خروش و ولولہ قابلِ دید، ایسا دکھائی پڑتا جیسے ملک کا وزیر اعظم بستی میں تشریف لا رہا ہو۔ بڑے بوڑھے، بالک، عورتیں اجلے کپڑوں میں ملبوس دیرینہ ساتھی کو خوش آمدید کہنے کے لیے بے تاب!

یوم آزادی سے ایک روز قبل بوقت شام غروب ہوتے ہوئے سورج نے افق پر گلناری رنگ بکھیرنا شروع یا تو دور سمندری ساحل پر ایک تیز رفتار جیپ ریت اڑاتی ہوئی ظاہر ہوئی۔ دن بھر کے منتظر ہجوم میں یک لخت کھلبلی مچ گئی۔ ہر آنکھ اس جیپ پر مرکوز ہو گئی۔ دو باوردی اہلکاروں کے ساتھ تیسرا شخص بمشکل اتر پایا۔

لوگوں نے دیکھا کہ دو توانا بازوؤں کے سہارے کے باوجود اسے اپنا وجود سنبھالنے میں دشواری کا سامنا تھا۔ اس کے سامنے اٹھائیس انتیس برسوں کے پھرتیلے، چاق و چوبند لکھیو کے بجائے ایک مخبوط الحواس بڈھا کھوسٹ کھڑا پھٹی پھٹی نظروں سے لوگوں کو یوں تاک رہا تھا جیسے کسی اجنبی دیس میں آن نکلا ہو۔ سات سالہ سلاسل کے دوران اس پر ڈھائے جانے والے تشدد پر اہل بستی سخت شکستہ دل اور برانگیختہ ہوئے۔ ان کی تمام خوشیاں، لکھیو کو زندہ پانے کی تمام مسرتیں غارت ہو گئیں۔ ان کی آنکھیں، ان کی بے بسی و کم مائیگی سے پُرنم، سوکھے ہوئے ہونٹ غصے اور باؤلے پن سے بھینچ گئے۔ المیہ صورت حال نے ان کے چہروں کے تمام تاثرات زائل کر ڈالے۔

وہ جوزف سٹالن کے دور میں سائبیریا کے برفشانوں میں عمر قید کاٹ کر آنے والے کسی بدقسمت شخص کی مانند ہجوم کے درمیان کھڑا تھا۔ جسے دیکھ کر سب کو تاسف اور ہر کوئی افسردگی کا اظہار کر رہا تھا۔ فقیر لکھیو کی خواب دیکھنے والی جیتی جاگتی، شرارتی آنکھیں اپنی حدت کھو کر اندر کو دھنس چکی تھیں۔ اس کی پتھرائی ہوئی پتلیاں جنہیں اس دنیا کو دیکھنے کی مزید قطعاً کوئی تمنا نہ تھی۔ گھنی سیاہ لٹوں کی جگہ کھچڑی بالوں میں گنج نمایاں، نقاہت اس کی مضبوط ٹانگوں میں لرزہ پیدا کر رہی تھی۔ کسی قسم کے تاثرات سے عاری سپاٹ چہرہ۔۔۔اپنی بچیوں سے مل کر جذبہ پدری سے انگڑائی لی نہ ماروی کے گداز بازو اس کے جامد و ساکت سینے میں زیروبم پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکے اور نہ ہی اپنے شفیق دوستوں، مہرباں ساتھیوں سے مل کر اسے احساسِ طمانیت ہوا۔ اہلِ قبیلہ بھی اس کو اپنے درمیان پا کر سخت مایوس و دل گرفتگی کی تصویر بن گئے۔ پل بھر کو سب کی خوشیاں کافور ہو گئیں۔ مجمع چہ مگوئیاں کرتا ہولے ہولے چھٹنے لگا۔ لوگ فقیر لکھیو کی ناگفتہ حالت پر اظہار تشویش، پڑوسی پولیس تشدد کی مذمت، اپنی حکومت کی نااہلی کو کوستے، کانوں کو

ہاتھ لگاتے اِدھر اُدھر منتشر ہوئے تو غمزدہ ماروی نے شوہر کا ہاتھ یوں تھاما جیسے کسی ذہنی اپاہج کی نگہداشت زبردستی اسے سونپ دی گئی ہو۔ وہ اسے لیے آہستہ آہستہ اپنی کٹیا کی جانب چل دی۔ پیچھے آنے والی تین کم سِن بچیاں حیران و پریشان، کچھ سمجھنے سے سراسر قاصر!

چند دنوں ہی میں حقیقت ماروی پہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ فقیر لکھو محنت و مشقت کرنے کے قابل نہیں رہا۔ الٹا کنبے میں ایک ایسے فرد کا اضافہ ہوگیا جس کو زندہ رکھنے اور اس کے دوادارو کی ذمے داری بھی اسے ہی اٹھانا ہوگی۔ وہ ناتواں عورت حالات کے اس بھنور میں گِھر گئی جس سے چھٹکارا پانا اس کے بس میں نہ تھا۔ گاؤں میں ایسا کوئی دھندا یا وسیلہ نہیں تھا جس کے ذریعے وہ کنبے کا پیٹ خوش اسلوبی سے پال سکتی۔

مستقبل میں اپنی جانب بڑھنے والی ابتلاؤں سے مقابلے کے متعلق خوب سوچ بچار کے بعد ایک شام کسی کو مطلع کیے بغیر گھاٹ پر جا کر کشتی کھولی اور جان جمالی کو دبئی جانے سے روکنے کے لیے ساتھ والے جزیرے کی طرف اسے کھینچنے لگی۔ زیادہ دیر نہ گزری کہ موافق ہوا۔۔۔ دفعتاً ناموافق ہونے لگی۔ لحہ بہ لحہ تند و شوریدہ ہوا، اس کے مختلف بازوؤں سے چپّو چلانے کی سکت سلب کرنے لگی۔ دونوں چپّو من وزنی، ساحل سے ٹکرا کر پلٹنے والی سرکش موجیں چھوٹی سی ناؤ کو تنکے کی طرح کھلے سمندر میں دھکیلنے لگیں۔ بتّا کھیتے کھیتے جانِ ناتواں نڈھال، اعصاب شل اور اوسان خطا ہونے لگے۔

بحر و آفاق باہم گڈمڈ ہونے لگے۔ چیخیں مار مار کر مدد کے لیے واویلہ، شور و غوغا۔۔۔ مگر سب بے سود! عالمِ تنہائی، بپھرتا ہوا سمندر، اوپر سے موت کے خوف نے اسے قریب قریب نیم بے ہوش کر ڈالا۔ ایک بے جان گٹھری کے مانند زمان و مکاں سے لاتعلق کشتی کے چوبی تختوں پر بے سدھ پڑی کہ اچانک سرچ لائٹ کی تیز روشنی نے پتھرائی ہوئی آنکھوں کو چندھیا ڈالا۔

گندے اور حقارت آمیز آوازوں کے ہتھوڑوں نے اس کے خوابیدہ حواس کو پاش پاش کر دیا۔ تب وہ دفعتاً سراسیمہ اور حیرت زدہ ہوئی۔ پورا سراپا خوف کے مارے تھرتھر کانپ رہا تھا۔ تاریکی کی وجہ سے سارا منظر غیر واضح اور مبہم۔ کشتی نے ایک زوردار جھٹکا سہا اور ایک عظیم الجثہ موٹر بوٹ اس کی ناؤ سے آن ملی۔ اجنبی لبادوں نامانوس وضع قطع کے مرد اس کی کشتی میں آن دھمکے۔ چند کھردرے ہاتھوں نے بڑی لاپروائی سے تنِ نازک کو اٹھایا جیسے شکاری جال میں پھنسی مچھلی کے بے نیازی سے نکال رہا ہو۔

اچانک ایک نفرت انگیز آواز نے دوسروں کو چونکا دیا۔

ارے! حرام زادی پہ تو زنانی دکھائی پڑے ہے اور جب۔۔۔! اور جب وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی تو جان پائی کہ سمندری پانیوں پر انسانی ہاتھوں سے کھینچی گئی غیر فطری و غیر مرئی سرحدوں کے پار وہ۔۔۔ پڑوسی ملک کے سیکورٹی اہلکاروں کی حراست میں ہے۔

- بقیہ -

پنجرے میں بند چڑیا

سوتی جاگتی اور باتیں بھی کرتی تھی۔ میں نے گڑیا پیک کروائی مجھے یقین تھا کہ بندیا گڑیا لے کر بے حد خوش ہوگی۔

صبح آفس جاتے ہوئے میں نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کی اور بھاگتے قدموں سے پلاٹ میں پہنچا۔ دُور ہی سے مجھے وہ کچرے کے ڈھیر پہ بیٹھی نظر آ گئی۔

بندیا! بندیا میں نے خوشی سے بھرپور آواز میں اُسے پکارا۔

دیکھو! میں تمہارے لیے گڑیا لایا ہوں۔۔۔

وہ خاموش نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔۔۔ پھر بولی۔۔۔

بابو! میں کل سے کچرے پہ نہیں آیا کرونگی۔

اوہ! وری گڈ گرل۔۔۔ اچھے بچے ہمیشہ بڑوں کا کہا مانتے ہیں۔

اس نے اپنا جھکا جھکا سر اٹھایا۔۔۔ میں نے دیکھا اُس کے چہرے پر شبنم کے ننھے ننھے قطرے جھلملا رہے تھے۔۔

ارے! تم رو کیوں رہی ہو۔۔۔؟

بابو! ابا میری شادی کرنا چاہتا ہے۔

شادی۔۔۔؟ مگر کس سے۔۔۔؟ تم تو ابھی بہت چھوٹی ہو۔

سپنا کے ابا سے۔

ہیں۔۔۔ اُس کے ابا سے۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی۔۔۔؟

میرا ابا اس کے ساتھ جوا کھیلتا تھا نا۔۔۔ اس نے مجھے جوئے میں ہار دیا ہے۔

اُف کیسا باپ ہے؟ بے غیرت۔۔۔ بے حس شرم نہیں آتی اُسے۔

عرب کے بلاد بھی تو یونہی اپنی ننھی منی بیٹیوں کو زمین میں زندہ گاڑ دیتے تھے۔ میں غصے سے کھولتا رہا۔

وہ روتی رہی۔۔۔ آنسوؤں سے اپنا چہرہ بھگوتی رہی۔

مگر میں نہ تو تسلی کے دو بول اُس سے کہہ سکا، نہ پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے دلاسا دے سکا۔ غم کی شدت سے میرے اندر عجیب سی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ یکدم گڑیا میرے ہاتھ سے گر پڑی۔ بندیا نے جلدی سے ڈبہ اٹھا لیا اور گڑیا کو گود میں لے کر پیار کرنے لگی۔ ابھی میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ اس کی رندھی رندھی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

بابو! گڑیا لے جاؤ۔۔۔ میرا ابا مجھے مارے گا۔

جنرل وارڈ

طاہرنواز
(راولپنڈی)

اسے جنرل وارڈ میں شفٹ ہوئے تین دن دس گھنٹے اور پندرہ منٹ ہو چکے تھے جب رحمت خان اس کے ساتھ والے بیڈ پر آیا تھا۔

ڈاکٹروں کی طرف سے طبیعت بہتر قرار دیے جانے کے بعد اسے ایمرجنسی سے نکال کر اس جنرل وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔۔وارڈ ایک طویل ہال پر مشتمل تھا جس میں چوبیس بیڈ قطار میں دیوار کے ساتھ ترتیب سے لگے ہوئے تھے۔۔کوئی بیڈ بھی اس وقت ہال میں خالی نہ تھا۔۔

وارڈ کے تین داخلی دروازے تھے جن میں سے دو ہر وقت بند رہتے تھے۔۔لوگوں کی آمدورفت کے لیے صرف ایک دروازہ کھلا رکھا جاتا تھا۔۔۔تازہ ہوا کے اندر آنے کے لیے چھت کے ساتھ روشن دان تھے جنہیں سردی کی وجہ سے بند کر دیا گیا تھا۔۔ان ہی میں سے ایک روشن دان کے نیچے عقبی دیوار کے ساتھ بیڈ نمبر بارہ پر نعیم لیٹا ہوا تھا۔۔

نعیم کو اس وارڈ میں آئے اب گیارہ دن ہوئے تھے اور یہ تمام وقت جو اس نے اس وارڈ میں گزارا تھا اس کی زندگی کا یادگار وقت تھا۔۔وہ وارڈ میں سب سے کم عمر مریض تھا۔۔اس کے عیادت گزاروں میں صرف اس کی ماں تھی جو ہر وقت اس کے پاس بیٹھی رہتی۔۔خاموشی سے صرف ہونٹ ہلاتی رہتی اور ہر تھوڑی دیر کے بعد منہ کو ہوا سے بھر کر اس کے چہرے پر پھونک مارتی۔۔پھر اس کا جسم دبانے لگتی۔۔وہ بہت کم باتیں کرتی تھی۔۔آنکھوں کو صاف کرنے کے بہانے ان میں آئی نمی کو وہ بار بار پونچھ لیتی۔۔نعیم بھی بہت کم بولتا تھا۔۔لیکن جب بھی وہ کوئی چیز مانگتا اس کی ماں روبوٹ کی طرح حرکت کرتی اور کام مکمل کرنے کے بعد دوبارہ پہلے والی حالت میں بیٹھ جاتی۔۔۔

ان کا خاندان صرف دو افراد پر مشتمل تھا۔۔اس کا باپ کون تھا وہ نہیں جانتا تھا۔۔بس اس کی ماں نے اسے بتایا تھا کہ ابھی وہ ایک سال کا ہی تھا جب اس کا باپ ایک ٹرک حادثے میں فوت ہو گیا تھا۔۔اس کا باپ اس ٹرک پر کنڈیکٹر تھا۔۔گھر میں اس کی کوئی تصویر نہ تھی۔۔وہ اپنے باپ کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا تھا۔۔

کچی بستی کے مکینوں میں بیماریاں عام تھیں۔۔پانی کی پائپ لائنیں جو اس بستی تک آتی تھیں خستہ ہو کر پھٹ چکی تھیں۔۔پانی رس رس کو ٹوٹی پھوٹی گلیوں میں آتا اور ان میں پڑے گڑھوں کو بھر دیتا۔۔۔یہ گلیاں چھوٹے چھوٹے تالابوں کی صورت اختیار کر لیتیں۔۔صفائی کا کوئی انتظام نہ ہونے کے باعث ان تنگ اور تاریک گلیوں میں ہر وقت گند پڑا رہتا۔۔اس گند کی سڑاند باہر سے آنے والے کو پریشان کرتی۔۔لیکن یہاں کے لوگ اس کے عادی ہو چکے تھے۔۔۔گندگی ملا پانی ہر گھر میں جاتا۔۔یوں آئے روز بیماریاں عام ہوتی جاتی تھیں۔۔

کچی بستی میں کوئی بڑا ہسپتال موجود نہ تھا۔۔صرف ایک ڈسپنسری تھی جس کا ڈاکٹر شام کو آتا اور تمام مریضوں کو ایک جیسی لال پیلی گولیاں دیتا۔۔محض دو گھنٹے بیٹھتا اور چلا جاتا۔۔اس دوران ڈسپنسری پر مریضوں کا رش رہتا۔۔۔تنگ دھڑنگ بچے ان تاریک گلیوں میں کھیلتے رہتے۔۔نعیم بھی اسی وجہ سے بیمار ہوا تھا۔۔گندے پانی کی وجہ سے اسے معدے کا کینسر ہو چکا تھا۔۔ماں کے پاس مہنگے علاج کے لیے پیسے نہیں تھے اور ڈاکٹروں نے اسے سرکاری ہسپتال کے اس جنرل وارڈ میں بھیج دیا تھا۔۔

کراہنے کی آوازیں سارا دن اس وارڈ سے آتی رہتیں۔۔نعیم کے لیے وہ لمحہ بڑا لطف اندوز ہوتا جب کسی مریض کو انجکشن لگانے کی کوشش کی جاتی اور وہ اس سے انکاری ہوجاتا۔۔لیت ولعل کرتا۔۔ہاتھ پاؤں چلاتا۔۔عزیز واقارب اس مریض کو قابو کرنے کی کوشش کرتے۔۔۔جب اس مریض کو انجکشن لگتا اور وہ درد سے آنکھیں بھینچ لیتا تو نعیم اس منظر سے بہت لطف لیتا۔۔اکثر وہ اس منظر کو غور سے دیکھنے کے لیے بیڈ پر اٹھ بیٹھتا اور لگاتار مسکراتا رہتا۔۔اس کی ماں جو بیڈ کی پائنتی بیٹھی ہوتی اسے ہاتھ کے زور سے پھر لٹا دیتی۔۔پھونک مار کر اس کے بالوں کو سہلانے لگتی۔۔

وہ رات کو بمشکل دو سے تین گھنٹے سوتا۔۔رات کے پچھلے پہر وارڈ میں موجود تمام مریض سوتے یا پھر خاموش ہونے پر ان کے سونے کا گمان ہوتا۔۔اس کی ماں بھی دن بھر کی تھکی ہوئی اس کے بیڈ پر ہی ایک طرف سمٹ کر سو جاتی۔۔اس وقت وہ ماں کو اٹھانا مناسب نہ سمجھتا۔۔یہ وقت گزارنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا۔۔

لیکن دن چڑھتے ہی وارڈ میں گہما گہمی شروع ہو جاتی۔۔مریضوں کے عزیز واقارب آنے لگتے۔۔اپنے ساتھ ناشتے اور کھانے کی دیگر اشیا لاتے اور پھر وارڈ میں ہی ناشتے کا آغاز ہو جاتا۔۔وارڈ میں موجود تیمار دار ایک دوسرے کا خیال رکھتے اور آنے والی اشیاء میں سے کچھ نہ کچھ آس پاس کے تیمار داروں اور مریضوں میں بھی بانٹ دیتے۔۔نعیم اور اس کی ماں کا کوئی عزیز نہ آتا تھا اس لیے سب لوگ ان کو بھی مختلف اشیاء کھانے پینے کو دے جاتے۔۔

وارڈ میں آنے والی خواتین عیادت گزاروں میں اکثر اپنے مریض کے پاس بیٹھ کر اس مریض کی حالت پر۔۔اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت کے اظہار کے لیے سسکیوں میں روتیں۔۔اس کو جلد صحت یابی کی دعا دیتیں اور پھر آنسو پونچھ کر باتوں میں مصروف ہو جاتیں۔۔یوں یہ وارڈ سارا دن لوگوں سے بھرا رہتا۔۔

ہر روز کچھ نئے مریض آتے اور کچھ پرانے مریضوں کو ڈسچارج کر دیا جاتا۔۔یوں نئے لوگ آتے اور ایک دوسرے سے متعارف ہوتے جاتے۔۔مریض کی تیمارداری سے شروع ہونے والی باتیں معاشرے میں چھائی لوگوں میں

بے حسی سے ہوتی ہوئی حالاتِ حاضرہ پر پہنچ جاتیں۔۔
وارڈ میں صرف اس وقت سختی کی جاتی تھی اور لوگوں کو باہر نکال دیا جاتا تھا جب ڈی ایم ایس جسے وارڈ میں موجود سب لوگ بڑا ڈاکٹر کہتے تھے کے آنے کا وقت ہوتا۔۔ اس وقت ینگ ڈاکٹر، وارڈ بوائے اور نرسیں وارڈ میں دوڑتے پھرتے تھے۔۔ مریضوں کی فائلوں کو مکمل کیا جاتا۔۔ مریضوں کی تازہ صورتحال کے بارے میں نئے اندراج کیے جاتے۔۔ کھانے پینے کی اشیاء اور دیگر لوازمات جو بیڈز کے آس پاس بکھرے ہوتے چھپا دیا جاتا۔۔ مریضوں کو درست حالت میں لٹایا جاتا۔۔
بڑا ڈاکٹر ہر مریض کی فائل کو سرسری دیکھتا۔۔ پاس کھڑے ینگ ڈاکٹرز اور نرسز کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا اور کبھی ان کی سرزنش۔۔ یہ تمام گفتگو مریضوں کی سمجھ سے بالا ہی رہتی۔۔ ہر مریض سے سرسری سا حال معلوم کر کے بڑا ڈاکٹر آگے بڑھ جاتا۔ ہر مریض کے پاس جاتا اور یوں بڑے ڈاکٹر کا راؤنڈ ختم ہو جاتا۔۔ اس دوران باہر کھڑکیوں سے چپکے لوگ یہ تمام کاروائی دیکھتے رہتے۔۔ یہ سب ایک لگے بندے مشینی انداز میں ہوتا۔۔ بڑے ڈاکٹر کے راؤنڈ سے ایک گھنٹہ قبل شروع ہوتا اور جونہی راؤنڈ ختم ہوتا وارڈ میں لوگوں کا داخلہ پھر سے شروع ہو جاتا۔۔
کبھی کبھار کسی مریض کے فوت ہو جانے پر اس کے لواحقین اونچی آواز میں روتے۔۔ وارڈ میں موجود دیگر لوگوں سے بے خبر ہو جاتے۔۔ روتی آنکھوں کے ساتھ سامان کو سمیٹتے اور کبھی حسرت سے اپنے عزیز کو دیکھتے جو ابھی کچھ دیر پہلے زندہ تھا اور اب ایک مردہ جسم ہو چکا تھا۔۔ اسے حسرت سے دیکھتے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہاتے تھے۔۔ اس مریض کو جو اب ایک لاش ہو چکا ہوتا جب تک سٹریچر پر ڈال کر لے جایا جاتا۔۔ اس تمام دورانیے میں وارڈ میں مرگ کی سوگواریت چھائی رہتی۔۔ ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک یہ سوگواریت قائم رہتی کہ پھر کوئی نیا مریض اس وارڈ میں داخل ہو جاتا اور وہ خالی بیڈ پھر سے آباد ہو جاتا۔۔
نعیم جس نے زندگی کے ابھی تک صرف دس برس ہی گزارے تھے کے لیے یہ سب واقعات بڑے عجیب ہوتے۔۔ دن تو اسی ہنگامے میں گزر جاتا لیکن رات کے اس لمحے جب ہر طرف خاموشی چھا جاتی۔۔ سب لوگ سوئے ہوتے وہ پریشان ہو جاتا۔۔ اس ماحول سے اسے ڈر لگنے لگتا۔۔ خاص طور پر اس رات جس روز اس کے ساتھ والے بیڈ پر ایک نوجوان فوت ہو گیا تھا۔۔ جس کے ساتھ وہ بات چیت کر لیتا کہ ان دونوں میں کسی حد تک دوستی ہو چکی تھی۔۔ وہ نوجوان نعیم کو کہانیاں سناتا اور اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا تھا۔۔۔
رات کی نیم تاریکی میں اس نوجوان شخص کا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا اور اس کے ساتھ ہی خوف کی لہر وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی تک سرایت کرتی محسوس کرتا۔۔
وارڈ میں آئے اسے اب آٹھ روز ہو چکے تھے۔۔ اس کی طبعیت کافی بہتر ہو چکی تھی۔۔ اس کی کم سنی کی وجہ سے ہسپتال کا عملہ بھی اس کا دوسروں سے زیادہ خیال رکھتا تھا۔۔ وہ سب اب اس کے نام سے واقف ہو چکے تھے۔۔ خاص طور پر وہ نرس جس کا جسم موٹاپے کی وجہ سے یا اس کے تنگ لباس پہننے کی وجہ سے سرکش تھا اس سے پیار کرتی تھی۔۔ اس کے بالوں کو سہلاتی کبھی کبھار اس کے گالوں پر بوسہ بھی دے دیتی۔۔ اس کے لیے کھانے کو ہر روز کوئی نئی چیز بھی لانے لگی تھی۔۔
لیکن رحمت خان کی موت کے بعد اس کی طبعیت خراب رہنے لگی تھی۔۔ وارڈ میں داخل ہوئے نعیم کو آٹھواں روز تھا جب رحمت خان اس کے پاس والے بیڈ پر مر گیا تھا۔۔ رحمت خان کو فوت ہوئے اب تین روز گزر چکے تھے۔۔
رحمت خان اس کے ساتھ والے بیڈ پر پانچ روز رہا تھا۔۔ رحمت خان کے محبت بھرے رویے نے ان دونوں کے درمیان ایک انسیت پیدا کر دی تھی۔۔ پہلی بار نعیم کو کسی کمی کا احساس ہوا۔۔
رات کے تیسرے پہر جب رحمت خان کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے ٹھہر گیا تو اس کے چہرے کے عکس میں اس نے اپنے نادیدہ باپ کا تصور کیا۔۔ جو فوت ہو چکا تھا۔۔ کیا موت کے وقت اس کے باپ کا چہرہ بھی ایسا ہو گیا تھا جیسا رحمت خان کا تھا۔۔ ہونٹوں پر ایک تبسم لیے جیسے ابھی جاگ پڑے گا اور ہنستے ہوئے کہے گا یار نعیم میں تو مذاق کر رہا تھا تم تو ڈر ہی گئے۔۔ لیکن اس کی ماں تو کہتی تھی کہ اس کا باپ ایک ایکسیڈنٹ میں مر گیا تھا۔۔ تو مرتے وقت اس کے چہرے پر کیسے کرب کی بجائے مسکراہٹ ہو سکتی تھی کہ اس نے اپنی بستی سے باہر بڑی سڑک پر ایک بار ایکسیڈنٹ دیکھا تھا جس میں زخمی ڈرائیور درد سے چلاّ رہا تھا۔۔ خون سے اس کے کپڑے سرخ ہو گئے تھے۔۔ تو اس کا باپ بھی ایسے ہی خون میں سرخ ہوتا درد سے چلاّیا ہو گا۔۔
اس سرد موسم میں بھی نعیم کے چہرے پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔۔ جب اسے قے آئی تو وہ درد سے دوہرا ہو گیا۔۔ اور ایک چیخ کے ساتھ ماں کو پکارا۔۔ ماں جو اس کے پاس ہی سمٹی ہوئی لیٹی تھی یکدم اٹھی اور نعیم کی حالت دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کے چہرے کو اپنے دوپٹے سے صاف کر کے بیڈ پر سیدھا لٹایا اور خود ڈاکٹر کے کمرے کی طرف دوڑی۔۔
جتنی دیر ڈاکٹر نے نعیم کا معائنہ کیا اور اسے درد کش انجکشن لگا کر سلا دیا اس کی ماں پاس کھڑی کانپتی رہی تھی۔۔ آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔۔ ہچکیوں کو روکنے کے لیے اس نے دوپٹے کا پلو سختی سے دانتوں میں دبا رکھا تھا۔۔ ڈاکٹر اسے تسلی دیتا ہوا واپس چلا گیا تو اس کے بعد بھی کافی دیر تک وہ یونہی کھڑی رہی۔۔
وہ آئندہ بھی کھڑی رہے گی۔ اُس وقت تک جب تک اُس کا بیٹا زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ ماں ہے۔۔۔ ایک مجبور و بے بس ماں۔۔۔ مگر مائیں تو وہ بھی مجبور ہیں، بے بس بھی ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے اُن کے جگر گوشے پانی کے نام پر زہر پینے کو مجبور ہیں!

پنجرے میں بند چڑیا

نگہت یاسمین (اٹک)

اُس کا نام بندیا تھا۔۔۔

بہت ہی معصوم اور بھولی بھالی سی لڑکی تھی۔۔۔

جب میں نے اُسے پہلی بار دیکھا وہ کچرے کے ایک بڑے سے ڈھیر پر جھکی ہوئی تھی۔سورج کی نئی نویلی کرنوں جیسے سنہرے گھونگھریالے بالوں کی لٹیں اُس کے گلاب گالوں کے آس پاس جھلملا رہی تھیں۔اُس کی گھیر دار پیلے رنگ کی فراک اُس کے اطراف زمین پر بکھری تھی۔سر پر سرخ رنگ کا پھولدار رومال باندھے وہ اپنے دھیان میں گم تھی اُس نے میرے قدموں کی چاپ سن لی تھی اُس نے آہستگی سے گردن گھمائی اور دو بھونرا سی کالی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے میرے چہرے پر آ ٹکیں۔اور پھر کچرے کے ڈھیرے پر جھک گئیں۔اُس کے سردی سے ٹھٹھرتے ننھے منے سے ہاتھ کچرے میں سے نہ جانے کیا الم غلم ڈھونڈ ڈھونڈ کر بائیں بازو سے لٹکے بڑے سے تھیلے میں ٹھونس رہے تھے۔

آج صبح گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں اچھا خاصا وقت ضائع ہو گیا۔اب پیدل دفتر جانے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔

سڑک کے پار جدید طرز کی کوٹھیوں کے درمیان ایک پلاٹ خالی پڑا تھا۔جہاں آس پاس کے مکینوں نے کوڑا کرکٹ اور فالتو اشیا کو پھینکنے کا مرکز بنا رکھا تھا۔دکاندار بھی اپنی گلی سڑی سبزیاں اور پھل یہیں لا کر پھینک جاتے تھے۔اس خالی پلاٹ سے شارٹ کٹ مارتے ہوئے اس سردی میں اس ننھی منی سی مخلوق کو یہاں بیٹھے دیکھ کر میں چونکا ضرور تھا۔مگر دفتر سے لیٹ ہو جانے کے خیال سے تیز تیز قدم اٹھاتا میں دفتر کی جانب روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن جب میں یہاں سے گزرا وہ کچرے کے ڈھیر سے اپنی پسند کی چیزیں گتے، ٹین کے خالی ڈبے، کاغذ اور کولڈ ڈرنک کی خالی بوتلیں وغیرہ تھیلے میں بھر رہی تھی۔اس بار مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں پہچان کی دھنک سی لہرائی۔ میں اس کے قریب رُکا تو اس اجنبی سی لڑکی کے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ بھی نمودار ہو گئی۔

اوہ ! کیوٹ بے بی! کیسے گندے کام کر رہی ہو تم؟ اپنے ہاتھ گندے کر لیے تم نے۔۔۔

وہ جلدی سے بولی۔۔۔ بابو! یہ گند ہے نا مگر ہم اس میں سے اچھا نکالتا ہے مگر دیکھو! تمہارے جیسے پیارے پیارے بچے یونیفارم پہنے سکول جا رہے ہیں۔تمہارا دل نہیں چاہتا سکول جانے کو؟

کیوں نہیں بابو! ہمارا دل بہت چاہتا ہے مگر ہمارا ابا نہیں چھوڑتا۔وہ زبردستی ادھر بھیجتا ہے۔شام کو یہ ساری چیزیں کباڑیے کے پاس بیچ کر ابا کو پیسے دیتا ہے۔وہ جوا کھیلتا ہے نا۔۔۔ پیسے نہ دوں تو مارتا ہے۔

اوہو! میں پریشان ہو کر جلدی سے وہاں سے کھسک گیا۔

اگلے روز بھی گاڑی کا مسئلہ جوں کا توں تھا میں شارٹ کٹ کرتے ہوئے پھر وہاں سے گزرا۔میرے قدم آپ ہی آپ اس کچرے کے ڈھیر کے پاس رُک گئے میں خود حیرت زدہ تھا کہ مجھے اس سے کیوں اتنی دلچسپی ہو گئی ہے۔شاید میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی اور رحم کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔فرصت کے لمحات میں بھی وہ ننھی منی معصوم سی لڑکی میرے دھیان دریچے میں آن کھڑی ہوتی۔

کچرے میں سے چیزیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر آج ایک گڑیا اس کے ہاتھ لگی تھی۔یہ ٹوٹی پھوٹی سی گڑیا جس کی دونوں ٹانگیں ندارد تھیں اُسے اپنے ہاتھوں میں تھامے وہ عجب سی خوشی محسوس کر رہی تھی۔اپنے آپ میں مگن وہ گڑیا سے باتیں کر رہی تھی۔''میں تیرے لیے پیارا سا گھگھرا سلواؤں گی پھر تجھے پہناؤں گی پھر تیری شادی کروں گی۔۔۔''میں قریب پہنچا تو وہ شرما کر چپ ہو گئی۔

کس سے شادی کرو گی گڑیا کی۔۔۔؟ میں نے پوچھا۔

سپنا کے گڈے سے۔۔۔؟

مگر یہ تو ٹوٹی پھوٹی ہے وہ اسے اپنے گڈے کی دلہن بنانا پسند نہیں کرے گی۔

کیوں نہیں کرے گی۔۔۔؟ وہ میری سہیلی ہے۔۔۔

اتنے میں ایک پیاری سی بچی اُس کے پاس آکے بیٹھ گئی۔

بابو! یہ میری سہیلی سپنا ہے۔ یہ سکول جاتی ہے کچرے پہ بھی نہیں آتی۔اچھی بچی ہے نا۔۔۔ وہ ہنسی۔۔۔

تم بھی اچھی بچی بنو نا۔۔۔

کیسے بنوں۔۔۔؟ بابو! اس کے چہرے پر حسرت کی پرچھائیں آکے ٹھہر گئی۔

اچھا یوں کرو اس ٹوٹی پھوٹی گڑیا کو پھینک دو۔۔۔

''کیوں پھینک دوں۔۔۔؟''

میں تمہیں نئی گڑیا لا کے دوں گا۔

نئی گڑیا۔۔۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔

لو! پھینک دی۔۔۔ اس نے فوراً گڑیا کو کچرے کے ڈھیر پر پھینک دیا۔

اوہ۔۔۔ سویٹ گڈ گرل۔۔۔ میں نے پیار سے اس کے گال کو چھوا تو وہ ہنسی۔۔۔ گنگناتی ہنسی۔۔۔

میری گاڑی ٹھیک ہو گئی تھی اب میں نے گاڑی پر دفتر جانا شروع کیا تھا۔ہفتہ بھر کچھ دفتری مصروفیات رہیں۔ایک دن اچانک مجھے یاد آیا۔اوہو! میں نے تو بندیا سے گڑیا دلانے کا وعدہ کیا تھا۔وہ کیا سوچتی ہو گی۔

چھٹی کے بعد میں نے گاڑی کا رُخ مارکیٹ کی طرف موڑا اور ایک شاپنگ پلازہ میں کھلونوں کی دکان میں داخل ہوا جلد ہی مجھے ایک گڑیا پسند آ گئی جو

باقی صفحہ ۶۳ پر ملاحظہ کیجیے

مولانا گاؤدی

گلزار جاوید

(راولپنڈی)

ہوائی اڈے کے الیکٹرانک ڈسپلے پر اپنی فلائٹ 509 کے بارے میں چوتھی بار تازہ اطلاع دیکھنے گیا تو ہنوز دلّی دُور است والی خبر پڑھ کے دل و دماغ پر طاری بوجھ سیروں کے بجائے مَنوں میں تبدیل ہوگیا۔قبل اس کے مڑ کر اپنی جگہ بیٹھتا کہ ساتھ کھڑی موڈرن خاتون نے بے تکلفانہ انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"Excuse Me"

"Yes"

"If I am not wrong" تم مولانا۔۔۔گاؤدی۔۔۔میرا مطلب ہے عابد ہونا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے خاتون کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔اگر میں غلطی پرنہیں ہوں تو تم SSS کی کمانڈو صباحت ہو۔میرے منہ سے اپنی شناخت سنتے ہی خاتون نہایت بےتکلفانہ انداز میں معانقہ کے لیے آگے بڑھی۔معاف کیجیے گا آج کل معانقہ کے لیے انگریزی کا لفظ HUG استعمال ہوتا ہے۔آپ ہی بتلایئے جس لفظ کے صوتی معنی اثرات پر گراں گزریں تو اسے استعمال کرنا مناسب ہے کیا؟

"اور سناؤ کیا حال ہے،کہاں ہوتے ہو،قلموں میں سفید بالوں نے بڑا گریس فُل بنادیا ہے۔"اصولی طور پر مہذب طریقہ تو یہ ہے کہ خاتون کتنی موٹی، بھدی،کالی یا پستہ قد کیوں نہ ہو اُس کے لیے چند تعریفی جملے ضرور کہنے چاہیے مگر ہم نے بےساختہ کہہ ڈالا کہ تم نے بھی تھوڑا ساوِیٹ پُٹ آن کیا ہے۔

"صاف صاف کہو ناموٹی ہوگئی ہوں۔"

"میرا مطلب ہے گریس فُل لگ رہی ہو۔اگر ٹین ایج کے دو یا تین بچے ساتھ کھڑے ہوں تو تمہاری پرسنلٹی اور چارمنگ ہو جائے۔By the way تمہارے بچے ہیں کتنے؟"

"ایک تو تم مردوں کی یہ بہت بُری عادت ہے کہ ملتے ہی سب سے پہلے بچوں کے بارے میں پوچھتے ہو۔بھئی ہم خواتین ہیں بچے جننے کی مشین نہیں۔جب شادی ہوگی تب دیکھا جائے گا۔"

"I am sorry" اصل میں ایک مدت کے بعد ملاقات ہوئی ہے اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ویسے میں اپنے بارے میں بتادوں کہ میرے ایک درجن بچے:

"حیرت سے ایک درجن؟"

"جملہ مکمل تو کرنے دو۔۔۔ایک درجن بچے ہوتے اگر شادی ہوجاتی"

"Don't be silly" یار یہیں کھڑے کھڑے بور کرتے رہو گے یا کوفی بھی آفر کروگے؟

"Sure" آؤ۔۔۔کوفی،آئس کریم جو دل کرے۔

"میں خواب تو نہیں دیکھ رہی،یونیورسٹی میں تو تم اس قدر کنجوس مکھی چُوس مشہور تھے کہ الگ ٹیبل پر بیٹھ کر ایک چائے کا کپ منگواتے،ایک ہاتھ سے چائے کا گھونٹ بھرتے اور دوسرے سے باوا آدم کے زمانے کی عینک ٹھیک کرتے ہوئے خاموشی سے باہر نکل جاتے۔"

"وقت وقت کی بات ہے،اسی مولانا گاؤدی نے SSS بریگیڈ کا وہ پروگرام بھی ناکام بنایا تھا جب میں امتحان کی تیاری کے لیے کالج کے گراؤنڈ کے ایک کونے میں ٹہل ٹہل کر پیپر کی تیاری کر رہا تھا۔اور جیسے ہی میں نے تم تینوں یعنی تم،سفینہ اور صائمہ کو اپنی جانب آتے دیکھا تو تیز تیز قدموں سے مخالف سمت میں قدم بڑھا دیے۔تم تینوں نے پیچھے سے ایک ساتھ آواز لگائی"ہائے ہائے کتنا شریف بچہ ہے"

کوفی کا کپ رکھتے ہوئے صباحت نے کہا:

"میرا خیال ہے فلائٹ کا وقت ہوگیا ہے،تم بھی اسلام آباد جا رہے ہونا،تمہاری فلائٹ کا نمبر کیا ہے؟میری تو 311 ہے"

"نہیں میری فلائٹ کا نمبر 509 ہے جو وایا لاہور اسلام آباد جائے گی میں لاہور رکوں گا وہاں مجھے کچھ کام ہے۔ایک یا دو روز بعد اسلام آباد آؤں گا۔"

"پھر ملاقات ہونی چاہیے"

"Why Not" کہتے ہوئے میں آگے بڑھنے لگا"

"اے اے،او مسٹر۔۔۔کہاں ملوگے مریخ پر۔۔۔"

"کیوں۔۔۔"

"رہے نا مولانا گاؤدی،بھلے آدمی فون نمبر دوگے لوگے تبھی تو رابطہ ہوگا نا"

"سوری کہتے ہوئے میں نے اُس کا نمبر دریافت کر کے اپنے موبائل میں محفوظ کر کے اُس کے موبائل پر بیل دی تو اُس نے ہنس کر ہاتھ کے اشارے سے بائے کیا۔"

لاہور سے آنے کے بعد زندگی اپنے ڈھرے پر چلنے لگی۔صبح کالج شام کو نوٹس کی تیاری اور موبائل پر دوستوں کے گروپ سے چیٹنگ کے بعد کھانا اور حالات حاضرہ سے واقفیت کے لیے کچھ دیر ٹی وی کے آگے بیٹھ کر سو جانا۔

قریب ایک ہفتہ یا شاید دس دن گزرے ہوں گے کہ صباحت کے نام کے ساتھ موبائل کی گھنٹی بجی۔موبائل کا بٹن آن کرنے اور صباحت کا نام دیکھنے

کے درمیان ایک سیکنڈ کے وقفے میں درجنوں خیالات ذہن میں گھوم گئے کہ اُسے فون نہ کرنے کا کیا بہانا کیا جائے۔ جیسے ہی میں نے موبائل آن کر کے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے غصے سے بھرپور آواز سنائی دی:

''کہاں سے بول رہے ہو؟''

''گھر سے اور کہاں سے''

''میں تو سمجھی تھی کہ آج تمہارا قُل یا چالیسواں ہونا چاہیے''

''دوست اپنے دوستوں کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں اور تم مجھے جیتے جی مارنے پر تُلی ہوا!''

''تُلی نہیں اگر تم مل جاتے تو سچ مچ مار بھی دیتی۔''

''سوری مجھے فلو ہو گیا تھا ورنہ ضرور فون کرتا''

''No arguments معافی اسی شکل میں مل سکتی ہے جب تم گاڑی لے کر آؤ مجھے لونگ ڈرائیو پر لے جاؤ اور واپسی پر کینڈل لائٹ ڈنر کراؤ۔''

شام کو صباحت کے بتلائے ہوئے پتہ سے اُس کو پک کیا اور ہم دونوں لونگ ڈرائیو پر نکل گئے۔ گاڑی چلے ابھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ صباحت نے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا:

''ہاں جی، مولانا گاؤدی صاحب اب بتلاؤ جناب نے شادی کیوں نہیں کی اور جناب کے ایک درجن بچے ہوتے ہوتے کیوں رہے گئے؟''

''ہم شریف لوگ ہیں، لہٰذا خواتین کا احترام کرنا جانتے ہیں اس لیے Ladies First کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے یہ حق تمہیں دیتے ہیں کہ پہلے تم بتلاؤ کہ تم نے شادی کیوں نہیں کی؟''

''بکواس نہ کرو، خواتین کا احترام My Foot شادی کرتے وقت ماں باپ لڑکی کو یہ کہہ کر رخصت کریں کہ بیٹا باپ کے گھر سے ڈولی نکلے اور شوہر کے گھر سے جنازہ، سبحان اللہ، شادی کے بعد بیٹا ہو جائے تو شوہر نامدار چھاتی پھلائے پھریں اور اگر بیٹی ہو جائے تو بیچاری بیوی موردِ الزام ٹھہرائی جائے اور کسی وجہ سے اولاد نہ ہو تو بیوی کو طرح طرح کے حکیموں، ڈاکٹروں، پیروں فقیروں کے پاس لیے پھریں۔ کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں کہتا کہ بھائی شوہر نامدار کا بھی چیک اَپ کرالو۔ کیوں کہ یہ male chauvinism کی اَنا کے خلاف ہے۔ جیسے ہی حکیم، ڈاکٹر یا پیر نے نفی میں جواب دیا اور مزاجی خدا دوسری شادی کے خواب دیکھنے لگے جس میں اُن کی امّاں رنگ بھرنے کے لیے ادھار کھائے بیٹھی ہوتی ہیں۔ دوسری طرف بچے فیل ہو جائیں یا کم نمبر لے آئیں تو خاتونِ خانہ کی شامت، کھانے میں مرچ مصالحہ اوپر نیچے ہو جائے تب خاتونِ خانہ کی شامت، آمدن کم خرچ زیادہ ہو تب خاتونِ خانہ موردِ الزام، بیاہ شادی یا کوئی تقریب ہو تو خواتین کی باری مردوں کے بعد، سچ سچ بتاؤ اس بوسیدہ لفظ کو ڈکشنری سے خارج نہیں کر دینا چاہیے۔''

''یار ایک بات بتاؤ تم نے وہاں کوئی N.G.O وغیرہ تو Join نہیں کر لی؟''

''یہ کیوں پوچھا تم نے؟''

''بھئی جس طرح تم نے میرا یعنی مردوں کا پوسٹ مارٹم کیا ہے اُس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔''

''بات کا رُخ مت پھیرو اگر نہیں بتانا چاہتے تو صاف صاف کہو۔''

''آآآآہ۔۔۔ہا۔۔کہاں تک سنو گی کہاں تک سناؤں''

''جہاں تک تمہارا جی چاہے یا جہاں تک تم مناسب سمجھو''

''ہوں۔۔۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے تمہیں بتلایا تھا کہ نہیں کہ میری پیدائش کے فوری بعد میری والدہ انتقال کر گئی تھیں جس کے کچھ عرصے بعد والدین کے اصرار پر میرے والد نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری والدہ کے بطن سے تین بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ مگر یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ میری دوسری والدہ ایک اوسط درجے کے گھرانے کی نیم خواندہ خاتون تھیں جن کے ہاں مذہب کا تصور بہت محدود اور مخصوص قسم کا تھا یعنی نیم مُلّا، نیم حکیم، نیم پیر فقیر کی نیم خواندہ اور ضعیف الاعتقادی کچھ اس طرح ہمارے گھر میں آئی کہ ایک علمی، ادبی گھرانہ جو روشن دماغی کے ساتھ اعلیٰ قدروں کا حامل بھی تھا وہ کٹھ مُلّائیت کی گرفت میں قید ہو کر رہ گیا۔''

''Oh my God تم۔۔۔تم کس طرح الگ ہو''

''اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ میں والد صاحب کی لاڈلی اولاد تھا جو ہماری دوسری والدہ کو پسند نہ آتا تھا۔ پھر تعلیم کی طرف میرا رجحان اور شوق کو دیکھتے ہوئے والد صاحب نے مجھے میرے چچا کو سونپ دیا تھا کیونکہ چچا کالج میں پروفیسر تھے اس لیے میرے تعلیمی مراحل آسانی سے طے ہوئے اور اُنہی کی راہنمائی میں مَیں نے بھی مدرس بننے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ تمہارا SSS گروپ میرا مذاق صحیح اڑاتا تھا کیونکہ میں حالات کے ہاتھوں اتنا پس چکا تھا کہ مجھے ہر چیز سے خوف بھی آتا تھا اور اپنی کم مائیگی کا احساس بھی شدت سے ستاتا تھا۔''

''I am Sorry جو کچھ ہوا انجانے میں ہوا پلیز مائنڈ مت کرنا''

''ارے نہیں۔۔۔تم لوگوں کی باتیں تو مجھے کچھ کرنے کا حوصلہ دیتی تھیں اور میرے لیے Energy کا کام کرتی تھیں۔ ہاں تو میں بتلا رہا تھا کہ میرے تینوں سوتیلے بھائی مختلف مدارس میں نیم خواندہ مولویوں کے ہاتھوں خود بھی مولوی بن گئے۔ ایک کہتا کہ داڑھی کے ساتھ مونچھے رکھنا خلاف شرع ہے۔ دوسرا کہتا مونچھوں کے بغیر داڑھی رکھنا خلافِ سنت ہے۔ تیسرا کہتا کہ ٹخنوں کے نیچے شلوار کا ہونا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح داڑھی کی قامت کے بارے اُن کے درمیان اختلاف پایا جاتا۔ کوئی مٹھ بھر داڑھی کو شریعت سے منسوب کرتا کوئی گز بھر داڑھی کو اور ایک تو خط پر بھی اکتفا کرنے کو تیار ہوتا۔ اس کے علاوہ گھر میں مسالک کی بحث بھی زور شور سے رہا کرتی۔ کوئی امام ابوحنیفہ کو درست گردانتا کوئی امام شافع کو، کوئی امام مالک کو اور کوئی امام حنبل کو اور کوئی ان سب کو ملوکیت سے تعبیر کرتا۔ اسی

طرح شیعہ سُنی، دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث کی تکرار بھی رہا کرتی۔ جو کوئی ایک دوسرے کے نکتہ نظر سے اختلاف کرتا وہ کافر ٹھہرایا جاتا۔''

''یار عابد تمہاری زندگی تو بڑی تکلیف دہ ہے''

ابھی کہاں۔۔۔تینوں میں سب سے بڑے صاحب ایک دن تبلیغ کا کہہ کر گھر سے گئے اور مڑ واپس نہ آئے۔ ہفتہ، مہینہ، دو مہینہ جب ایک سال گزر گیا تو والد صاحب کی حالت خراب ہوگئی۔ میں والد صاحب کو دیکھنے گیا تو اُنہوں نے بھرّائی آواز میں میرا ہاتھ تھام کر کہا ''تُو میرا سمجھ دار بیٹا ہے مجھے تم سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ تُو سمجھ رہا ہے میرا اشارہ کس طرف ہے'' میں نے والد صاحب کی گفتگو کے جواب میں مختصراً ''جی'' کہہ کر بات ختم کرنا چاہی تو والد صاحب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔'' کچھ کر بیٹا کچھ کر۔۔۔اپنے بھائی کو کسی طرح ڈھونڈ کے لادے میری آنکھیں اُسے دیکھنے کو ترس رہی ہیں''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''کرنا کیا تھا۔علامہ اقبال کے شعر کی تصویر بن کر دشت اور دریا میں گھوڑے دوڑا دیے۔ سارے تعلقات، ساری واقفیت، سارے مراسم کام میں لانے کے بعد پتہ چلا کہ صاحبزادے کابل کی جیل میں ہیں۔ اسے میری خوش نصیبی کہو کہ وزارتِ خارجہ کے ایک اعلیٰ افسر کا بیٹا میرا طالب علم تھا جن کے تعاون سے قریب دو ماہ کی کاوش کے بعد صاحبزادے آئے تو کسی طرح کی شکر گزاری یا فرمانبرداری کے بجائے بڑے کرّ وفّر اور اس شان سے آئے کہ اُن کے دوستوں اور حامیوں نے اُنہیں ہار پھول سے ڈھک دیا۔ وجہ دریافت کی تو کہا گیا کہ جہاد سے واپس آئے ہیں۔''

''جہاد۔۔۔میں سمجھی نہیں۔۔۔کس کے خلاف؟''

''خدا جانے۔۔۔وہی امریکی فوجی وغیرہ جو افغانستان میں آئے ہوئے ہیں اُن کے خلاف سوات میں رہنے والے کسی صوفی صاحب کے پانچ ہزار مجاہدین میں یہ بھی شامل تھے۔''

''تو انہوں نے کیا کیا۔۔۔؟''

''کرنا کیا تھا آدھے گاجر مولی کی طرح کاٹ دیے گئے اور آدھے جیلوں میں ڈال دیے گئے۔''

''اب کیا کرتے ہیں وہ۔۔۔؟''

''ٹھیکیداری۔۔۔!''

''کس چیز کی۔۔۔؟''

''اسلام کی۔۔۔''

'Oh my God، اب اپنی شادی کا بھی تو کچھ بتلاؤ؟''

''بھئی نوکری کے پانچ سال تک جو بچت کی اُس کی لے لی گاڑی، اُس کے دو سال بعد کی ساری کمائی صاحبزادے کو چھڑانے پر لگ گئی۔ اس کے بعد والد صاحب نے انٹر فیل اور میٹرک فیل دوسرے بھائیوں کو سیٹ کرنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ تم تو جانتی ہو آج کل بی۔اے، ایم۔اے تو کیا ڈاکٹریٹ کی ڈگری لیے لوگ مارے مارے پھر رہے ہیں اور جاب نہیں ملتی۔ تو میٹرک فیل اور انٹر فیل کو کوئی کیا نوکری دیتا۔ مجھ سے جتنا بن پڑا یا جتنا میرے پاس تھا اُس سے میں نے دونوں کو کاروبار کرا دیا۔ ایک کو میڈیکل اسٹور اور دوسرے کو سنار کی دُکان کھلوا دی۔ اب وہ ہر سال حج پہ بھی جاتے ہیں، عمرہ پر بھی جاتے ہیں اور تبلیغی جماعت میں بھی وقت لگاتے ہیں اس کے باوجود اُن کے اخراجات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور میں اچھی بھلی تنخواہ لینے کے باوجود بیس سال کے بعد بھی Hand to mouth ہوں۔ اب تم ہی بتلاؤ۔۔۔نا میرے پاس اپنا گھر ہے، نا بینک بیلنس ہے اور نا کوئی اور اثاثہ۔ ایسے میں شادی کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ چلو چھوڑو میری رام کہانی پوری ہوئی اب یہ بتلاؤ کہ ڈِنر کہاں کرنا ہے؟''

''آج نہیں پھر کسی دن، تمہاری باتوں سے بھوک مر گئی۔''

اب کی بار ڈر کے مارے میں نے صباحت کو تیسرے دن ہی فون کر لیا۔ حال چال پوچھنے پر بولی ''میں ابھی تک شاک میں ہوں۔ تم نے کس قدر Sacrify کیا اور اُس کا صلہ تمہیں کچھ بھی نہیں ملا۔'' ''میں نے کہا چھوڑو ہر کسی کو اپنے حصے کے دکھ سکھ بھوگنے پڑتے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ میں کتنی دیر میں تمہیں لینے آؤں؟'' جواب میں اُس نے کہا ''آج نہیں میں خود کسی دن فون کروں گی''

تین دن بعد میں نے اُسے پھر فون کیا تو وہ شوخی سے بولی ''ارے مولانا گاؤدی یہ گھڑی گھڑی فون کی وجہ کیا ہے جبکہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں خود فون کروں گی، کہیں عشق تو نہیں ہو گیا مجھ سے؟''

''تمہیں حق پہنچتا ہے جتنا جی چاہے مذاق اڑا لو۔ میں نے تو یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا کہ ڈِنر کا کیا ہوا؟''

''لگتا ہے مولوی بھائیوں کا کوئی اثر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو پیٹو ضرور ہو گئے ہو تم، یار صبر کرو میں خود فون کروں گی۔''

''میں نے ڈر کے مارے فون کرنے سے توبہ کر لی مگر پانچویں روز اُس کا خود فون آ گیا۔''

''پروفیسر۔۔۔کیا کر رہے ہو؟''

''میں نے حیرت سے کہا۔۔۔پروفیسر۔۔۔کون پروفیسر۔۔۔؟''

''رہے نا۔۔۔مولانا گاؤدی۔۔۔غلطی سے تمہیں کہا تھا۔ سو جناب اپنے الفاظ واپس۔ آج رات کو آٹھ بجے میں آپ کا انتظار کروں گی۔ آٹھ بجے کا مطلب آٹھ بجے ہی سمجھئے گا۔''

میں نے گاڑی اُس کے گھر کے قریب کھڑی کر کے موبائل پر بیل دی تو دوسری طرف سے آواز آئی ''پردہ کرنے لگے ہو کیا'' میں نے کہا ایسا تو نہیں تم باہر آ جاؤ تو پھر ساتھ چلتے ہیں۔ جواب میں بولی ''پہلے تم اندر آؤ'' گاڑی پارک کر کے جوں ہی میں نے ڈور بیل بجائی تو اُس نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر آنے کو کہا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی علیک

سلیک کے بغیر اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور ڈائننگ ٹیبل پر لے گئی۔ ڈائننگ ٹیبل نا صرف خوشبو دار کھانوں سے سجی ہوئی تھی بلکہ ہر ڈش کے درمیان خوبصورت پھولوں کا گلدستے بھی سجے ہوئے تھے اور درمیان میں لکڑی کے خاص ڈیزائن کردہ کینڈل اسٹینڈ پر ایک بڑی موم بتی بلند شعلے کے ساتھ جل رہی تھی۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ’’یہ کیا ہے؟‘‘

’’بندہ پرور۔۔۔حضورِ اعلیٰ۔۔۔یہ اس ناچیز کی دعوت ہے‘‘

’’دعوت۔۔۔تمہاری۔۔۔یہاں۔۔۔؟‘‘

’’کیوں کوئی اعتراض ہے، بے شک ہو اب تو کھانا پڑے گا۔ گذشتہ دس دن سے تیاری میں لگی ہوئی ہوں۔‘‘

’’آٹھ بجے ہی کھانا کھلا دوگی۔۔۔؟‘‘

’’نہیں جناب۔۔۔مہذب لوگ کھانے سے پہلے سوپ پیتے ہیں، حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کرتے ہیں، اسنیکس لیتے ہیں پھر جا کر کھانے کی باری آتی ہے۔۔۔تمہاری شکل بتا رہی ہے کہ سوپ تمہیں پسند آیا ہے مگر تعریف میں کنجوسی سے کام لے رہے ہو۔۔۔‘‘

’’صحیح کہہ رہی ہو۔ میں نے اتنا لذیذ سوپ پہلے کبھی نہیں پیا۔ میں تو سوچتا تھا کہ تم صرف لوگوں کو بیوقوف ہی بنا سکتی ہو مگر اب احساس ہو رہا ہے کہ تم کُک بھی کمال کی ہو۔‘‘

’’مذاق نہ کرو، پہلے کھانا کھاؤ پھر کوفی پیو پھر جی چاہے جتنی تعریف کر لینا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔‘‘

’’کیا خیال ہے گفتگو کا سلسلہ آگے نہ بڑھایا جائے؟‘‘

’’لگتا ہے تمہیں کہیں جانا ہے!‘‘

’’نہیں۔۔۔ہرگز نہیں۔۔۔ہرگز نہیں۔۔۔‘‘

’’تو پھر جلدی کس بات کی ہے۔ کھانے کے بعد آرام سے گفتگو کریں گے۔‘‘

’’کھانا میری توقع کے برخلاف کافی لذیذ اور منفرد تھا۔ مغرب میں ایک عرصہ گزارنے کے باوجود شاہی ٹکڑے اتنے ہی لذیذ تھے جتنے لذیذ بچپن میں کھائے تھے۔ قورمہ اور اسٹو کے علاوہ اُرد کی بُھنی ہوئی دال اس طرح پکی ہوئی تھی کہ زمین پر بکھیر کر ایک ایک دانہ چُن لو۔ میں نے صباحت سے کہا کہ تم نے یہ سب کہاں سے سیکھا۔ تو اُس نے بتایا کہ اُس کی والدہ وہاں پر بھی یہی کھانے پکاتی ہیں اور جب کسی کا دل مغربی کھانے کا ہوتا ہے تو وہ بازار جا کر کھا آتا ہے یا آرڈر کر دیتا ہے۔ کھانے کے آخر میں مہمان نوازی کا تقاضا پورا کرتے ہوئے صباحت نے بھی رسمی جملے کہے کہ تم نے ٹھیک سے نہیں کھایا۔ تمہیں اچھا نہیں لگا وغیرہ۔۔۔ جواب میں مَیں نے صرف اتنا کہا ’’کوفی ملے گی؟‘‘ Sure کہتے ہوئے وہ کچن کی طرف لپکی۔‘‘

قبل اس کے کہ تم میرے بارے میں سوالات کرو میں خود ہی تمہیں تفصیل سے بتلائے دیتی ہوں۔ ہم لوگ اچھے بھلے اپنے وطن میں رہ رہے تھے کہ ابو نے پہلے بڑے بھائی کو اور پھر مجھ سے چھوٹے کو پڑھائی کی غرض سے باہر بھیج دیا۔ دونوں بھائی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد واپس آنے کے بجائے وہیں سیٹل ہو گئے بلکہ اس سے پہلے انہوں نے میرا داخلہ بھی ایک یونیورسٹی میں کرا دیا۔ میں نے لاکھ منع کیا مگر امّی ابّو کے اصرار کے آگے میری ایک نہ چلی۔ تو جناب مولانا گاؤدی صاحب میں نے تعلیم مکمل کرتے ہی جب امّی ابّو سے واپس آنے کا ذکر کیا تو وہ بہت ناراض ہوئے بولے: ’’تمہارے دونوں بھائی واپس آ نہیں رہے تم بھی آ کر اپنے گھر چلی جاؤ گی تو ہمارا کیا بنے گا؟‘‘ لہٰذا میں نے بھائیوں کی مدد سے پہلی کوشش یہ کی کہ امّی ابّو کو اپنے پاس بلایا جائے۔ جو کام نیک نیتی سے کیا جائے اُس میں اللہ تعالیٰ کامیابی بھی دیتا ہے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد امّی ابّو کو ایک سال کا ویزہ مل گیا جسے ہم نے ریزیڈنسی میں تبدیل کرا لیا۔

امّی ابّو کی ساری کوشش میری شادی کے لیے وقف ہو گئی۔ اوّل تو کوئی مناسب رشتہ نہ ملتا اور اگر کوئی قابلِ غور رشتہ ہوتا تو میں اُسے رد کر دیتی۔ سلسلہ ابھی آگے چلتا کہ چھوٹے بھائی صاحب نے گُل کِھلا دیا اور ایک دن اپنی گرل فرینڈ کو Positive Report کے ساتھ گھر لے آئے۔ لڑکی اپنے وطن کی تھی مگر جس طرح کا حجاب اُس نے لے رکھا تھا اُس سے اُن کی فیملی کی بابت اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ امّی ابّو بہت جُز بُز ہوئے اور مشرقی والدین کی طرح بھائی کو گھر سے نکل جانے کی دھمکی بھی دی جس کے جواب میں کسی قسم کا Reaction دکھلائے بغیر وہ پلٹ کر جانے بھی لگا مگر میں نے اُسے ’’ٹھہرو‘‘ کہہ کر روکا اور بیٹھنے کا اشارہ کر کے امّی ابّو کو اندر لے گئی۔ امّی ابّو پڑھے لکھے انسان تھے میری دلیل کے جواب میں خاموشی اختیار کر کے رضامندی کا سگنل دے دیا اور دوسرے دن مسجد میں جا کر سادگی سے نکاح کر دیا۔ البتہ یہ دیکھ کر دل کو دھچکا لگا کہ وہ لوگ مغرب میں رہ کر بھی چہرے مہرے، لباس اور بود باش سے پڑھے لکھے ہرگز نہ لگتے تھے۔

بڑے بھائی نے اس رشتے پر بہت واویلہ مچایا۔ یہاں تک کہہ بیٹھے کہ مجھ سے بڑا اُلو کا پٹھا کوئی نہیں کہ گھر کی تمام ذمہ داریاں میں نبھاتا ہوں اور شادی چھوٹے صاحب کر بیٹھے۔ بیشک چھوٹا بھائی ابھی کچھ نہیں کرتا تھا مگر میں اتنے پیسے ضرور کما رہی تھی کہ اپنا اور امّی ابّو کا خرچ آسانی سے اٹھا سکوں۔ موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں نے خاموش رہنا بہتر سمجھا اور بڑے بھائی سے جلد اُن کا رشتہ تلاش کرنے کا وعدہ کر کے بات کو رفع دفع کیا۔

بھائی کے جانے کے بعد امّی ابّو کو کمرے میں روتا دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے دیکھ کر دونوں نے چمٹا لیا اور بولے ’’کاش ہماری ایک ہی اولاد ہوتی‘‘ میں نے امّی ابّو کو ماضی، حال، مستقبل کے حوالے دے کر کسی قدر مطمئن کرنے کی کوشش کی جو بار آور ثابت ہوئی۔ مسئلہ ایک اور سر ابھارنے لگا۔ امّی ابّو کا اصرار تھا کہ پہلے میرا رشتہ کیا جائے جبکہ میری خواہش بڑے بھائی کا رشتہ کرنے کی

تھی۔اس مسئلے کا میں نے یہ حل نکالا کہ امّی ابّو کو فری ہینڈ دے دیا کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں جب چاہیں میرا نکاح کر دیں اور میں شدّ و مدّ سے بھائی کے لیے خود بھی لڑکی ڈھونڈنے لگی اور بھائی کو بھی اس سلسلے میں متحرک ہونے کی تاکید کی۔

آٹھ ماہ بعد گھر میں ایک فرد اور ایک داڑھی کا اضافہ ہی نہیں بلکہ چھوٹے بھائی صاحب نے مغربی لباس ترک کر کے ٹخنوں سے اونچی شلوار، کرتا اور دوپلّی ٹوپی پہننا شروع کر دی تھی۔ انہی دِنوں بڑے بھائی کے دفتر میں ایک صاحب کام کرتے تھے جنہوں نے بھائی سے راہ و رسم بڑھانے کے ساتھ اُنہیں صوم وصلوٰۃ کا پابند کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی۔ اس کوشش میں اُن صاحب سے زیادہ اُن کی اکلوتی صاحبزادی کا دخل تھا جس کے لیے بڑے بھائی نرم گوشہ رکھتے تھے۔

ایک دن میں نے بڑے بھائی کی باتوں سے اندازہ لگا کر کہا کہ اگر آپ کہیں تو میں اور امّی آپ کا رشتہ لے کر اُن کے گھر چلے جائیں۔ بڑے بھائی کی خاموشی ایک طرح سے رضا مندی تھی اس لیے میں اور امّی دوسرے روز ہی بڑا سا کیک لے کر اُن کے گھر پہنچ گئے۔ ہمیں دیکھ کر اُن لوگوں نے جس گرم جوشی کا اظہار کیا اُس سے یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہ تھا کہ وہ ہماری آمد کے منتظر تھے۔ بظاہر ہماری تجویز پر اُنہوں نے غور کرنے کا وعدہ کر کے خاطر تواضع کے بعد ہمیں رخصت کیا اور چند دن بعد ہی بڑے بھائی سے کہا ''اپنے گھر والوں سے کہیے کہ کسی دن چائے پر آئیں یا ہمیں بلائیں'' بڑے بھائی نے جیسے ہی یہ اطلاع دی میں نے فوراً اُن لوگوں کو دوسرے دن شام کی چائے پر مدعو کر لیا۔

ہم تو صرف کیک لے کر گئے تھے وہ باقاعدہ تحائف لے کر آئے جس کا مطلب یہ تھا کہ اُنہوں نے رشتہ قبول کر لیا ہے۔ جب والد صاحب نے اُن سے رشتے کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے کہا ''مناسب تو نہیں لگتا اگر آپ ہماری درخواست قبول کر لیں تو ہمیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں'' ابّو نے قدرے بیزاری سے کہا ''جی فرمایئے''، ''اصل میں ہماری کوئی اولادِ نرینہ نہیں ہے صرف ایک بیٹی ہے اور اللہ کا دیا بہت کچھ ہے ہماری خواہش ہے کہ بیٹا ہمارے ساتھ رہے'' قبل اس کے ابّو کوئی جواب دیتے میں نے ابّو کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا ''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے'' میرا جواب سُن کر بڑے بھائی کی باچھیں کھِل گئیں امّی کا منہ لٹک گیا اور ابّو کا منہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ القصہ مختصر اگلے مہینے کی سات تاریخ طے پا گئی۔ تیس باراتی لانے کی اجازت دی اور کوئی شرط ہو تو وہ بھی دریافت کرنا چاہی جس کا جواب ہماری طرف سے نفی میں پا کر دونوں میاں بیوی خوش ہو گئے۔

چھوٹے بھائی کو ایک فیکٹری میں نوکری مل گئی تھی لہٰذا وہ اپنی بیگم کو لے کر ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے۔ بڑے بھائی سسرال میں رہنے لگے۔ ہفتہ دس دن سے شروع ہو کر ملاقات کا وقفہ مہینے دو مہینے تک جا پہنچا۔ امّی ابّو کی تمام کوشش کے باوجود میرے لیے کوئی مناسب رشتہ اس لیے دستیاب نہ ہو سکا کہ میری عمر تیزی سے بڑھ رہی تھی جبکہ لڑکے نوخیز لڑکیوں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ بڑے بھائی نے قطعی طور پر تو ہاتھ نہیں کھینچا تھا البتہ اونٹ کے منہ میں زیرہ برابر جب آتے کچھ نہ کچھ امّی کے ہاتھ میں تھما جاتے۔ ایک مرتبہ وقفہ طویل ہوا تو میں نے سوچا کہ ہم لوگ جا کے خود مل آتے ہیں۔ ہمارا جانا اُن لوگوں کے لیے کسی طرح سے کوئی خاص اہمیت کا حامل نہ تھا البتہ ایک بات جس نے ہمیں چونکایا وہ بڑے بھائی کے چہرے پر کھچڑی داڑھی تھی۔ روزمرہ شیو کرنے کے باعث ہمیں کبھی احساس نہ ہوا اب غور سے دیکھا تو اُن کے بالوں میں کہیں کہیں چاندی چمکنے لگی تھی۔

بظاہر ہمارے خاندان کی گاڑی جیسے تیسے رواں دواں تھی کہ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی دونوں ایک ساتھ آ کر امّی ابّو کے کمرے میں بیٹھ کر سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ میں چائے بنا کر لے گئی اور بڑے خوشگوار موڈ میں کہا ''خیر تو ہے باپ بیٹوں میں بڑی گاڑھی چھن رہی ہے'' ابّو نے تو میری طرف دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی البتہ بڑے بھائی میری طرف دیکھ کر بولے ''تمہاری باتیں ہو رہی ہیں'' میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''میری'' بڑے بھائی نے بھی ذرا ترش انداز میں ''ہاں تمہاری'' اب امّی نے دھیمے لہجے میں کہا ''بیٹا تمہارے بھائی چاہتے ہیں کہ تم حجاب لینا شروع کر دو'' میں نے کبھی امّی ابّو کو جواب نہیں دیا مگر اُس روز جانے کیا ہوا کہ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا ''کیوں لینا شروع کر دوں''، ''اس لیے کہ تمہارے بھائی یہی چاہتے ہیں'' میرا جواب سن کر بڑے بھائی کی آنکھوں میں غصہ اُتر آیا ''زیادہ بکواس کرنے کی کوشش کی تو یہیں گلا دبا دوں گا'' میری گردن کو ہاتھوں میں تھامتے ہوئے دہاڑے۔ ''اسے سمجھا دینا'' امّی کی طرف منہ کر کے ''اگر یہ ایسے باز نہ آئی تو ہمیں سمجھانا آتا ہے''

اُس دن کے بعد سے امّی ابّو دونوں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے میری منّت، ترلا، خوشامند کرتے کہ بیٹا بھائیوں کی بات ماننے میں کیا حرج ہے ''میں غصے سے کہتی میں نے کبھی اُن کی زندگی میں دخل دیا ہے'' امّی سر پر ہاتھ پھیر کر کہتیں ''بیٹا کہتے تو تیرے بھلے کی ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی ہدایت کر رہے ہیں کوئی غلط بات تو نہیں کہہ رہے'' میں خود پر قابو پاتے ہوئے جواب میں طنزیہ لہجے میں کہتی ''اسلامی تعلیمات'' امّی کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتیں ''توبہ کر بیٹا، توبہ کر'' میری برداشت جواب دے جاتی ''توبہ بھی میں کروں امّی کچھ تو خدا کا خوف کیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے حقوق اللہ پر حقوق العباد کو فوقیت دی ہے۔ مجھے اسلام کے دائرے میں جکڑنے والوں سے آپ یہ تو پوچھیے کہ وہ اپنے ماں باپ اور بہن کی نسبت کس قدر اسلامی فرائض ادا کر رہے ہیں؟''

میں تو ایک عورت ہوں، کمزور و ناتواں عورت، طاقتور اور منہ زور بھائیوں کے آگے سپر ڈالنا میری مجبوری تھی مگر یہ مجبوری دوسرے دن ہی اُس وقت گلے کا طوق بن گئی جب مجھے دفتر سے یہ کہہ کر فارغ کر دیا گیا کہ ہمارے

ہاں جنونی مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔
جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق میرے لیے سرِ دست حجاب اتارنا ممکن نہ تھا۔ دونوں بھائی یہ کہہ کر چلے گئے کہ اللہ کے نبیؐ نے دین کی ترویج کے لیے بے پناہ صعوبتیں برداشت کی ہیں تو کیا تم ایک نوکری کی قربانی نہیں دے سکتی۔ بھائیوں کا ارشاد بجا مگر اُن کا یہ حق نہیں بنتا تھا کہ وہ اپنے والدین کی ضروریات کی مد میں کچھ کرتے جو میری تنخواہ سے پورے ہو رہے تھے۔ الٹا ہوا یہ کہ اُن کی آمدن میں وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا اور ہم لوگ دو وقت کی روٹی کے لیے لوگوں کے گھروں، دکانوں اور فیکٹریوں میں چھوٹے چھوٹے کام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لفظ ہم لوگ پر چونکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے بوڑھے والدین بھی اس مشقت کو جھیلنے پر مجبور تھے۔
بات یہاں تک ہوتی تو ہم برداشت کر لیتے کیونکہ ہم تو سختیاں جھیلنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ایک دن ڈور بیل پر ایک صاحب کو کھڑے دیکھا تو میں ابّو کو بلانے کے لیے پلٹی۔ پیچھے سے آواز آئی ''باجی'' مڑ کر میں نے غور کیا تو چھوٹا بھائی بمعہ بیگم کھڑا تھا۔ میں نے کہا خیریت تم اس حالت میں، میرے کاندھے پر سر رکھ کر بھائی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے کہا اندر آؤ اُس کی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچا اور اُس کے آنسو صاف کر کے وجہ جاننا چاہی تو بولا ''روز صبح میرے فلیٹ کے آگے گاربیج کا ڈھیر لگا ہوتا تھا میں جس پڑوسی سے بات کرتا وہ شانے اچکا کر آگے بڑھ جاتا۔ ایک دن ایک پڑوسی کو میں نے گاربیج کا شاپر رکھتے ہوئے دیکھ لیا تُو تُو میں میں اتنی بڑھی کہ سارے فلیٹس کے لوگ نکل آئے۔ انہوں نے نا صرف مجھے مارا پیٹا بلکہ میری داڑھی مونڈھ کر میرا سامان بھی فلیٹ سے باہر پھینک کر کہنے لگے دفع ہو جاؤ مسلم جنونیوں۔ آئندہ ادھر نظر آئے تو جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے''
''تم لوگوں کو یہ بات سمجھ کیوں نہیں آتی'' غصہ سے لال پیلی ہوتی صباحت نے بھائی کو فرسٹ ایڈ دیتے ہوئے ''کہ ہر چیز اپنی جگہ پر اچھی لگتی ہے۔ بزرگوں نے بھی کہا ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس''
''تمہارا کیا خیال ہے میں نے بھیس بدلا ہوا ہے؟'' چھوٹے بھائی نے چیختے ہوئے بہن سے دریافت کیا۔
''بھئی کچھ بھی کہہ لو تم لوگوں کا وہ حساب ہے کہ سہولتیں یہاں کی اور کلچر وہاں کا''
''کون سی سہولتیں حاصل کر لیں میں نے یہاں آ کر، بارہ بارہ گھنٹے کام کرتا ہوں تب بھی گزارہ نہیں ہوتا''
''زیادہ واویلا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ابھی ڈالر ایک سو آٹھ روپے سے صرف آٹھ روپے پرآ جائے، میں دیکھتی ہوں تم میں سے کتنے اِدھر کا رُخ کرتے اور کتنوں کے پیٹ میں اسلام کا مروڑ اٹھتا ہے۔''
''فضول کی باتیں مت کرو باجی! اللہ تعالیٰ نے کلامِ پاک میں صاف صاف فرمایا ہے کہ یہ زمین اُس کی بنائی ہوئی ہے اور اُس کے بندے جہاں چاہیں جیسے چاہیں رہ سکتے ہیں۔''
''میرے پیارے بھائی یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ یہ اُن کا ملک ہے، اُنہوں نے محنت کی اور ترقی میں آگے نکل گئے۔ اب اُن کی مرضی ہے وہ جیسی بود و باش چاہیں اپنائیں ہم کون ہوتے ہیں اُس میں دخل دینے والے۔ سچ سچ بتاؤ اگر یہی لوگ تمہارے ملک میں آ کر اپنا کلچر عام کریں تو تمہاری سوچ کیا ہوگی؟''
''نَکّی دبا دوں گا سالوں کی۔''
''زبانی کلامی نَکّی دباتے رہنا اور وہ عملی طور پر ہماری شہ رگ دبائے ہوئے ہیں، بڑے آئے نَکّی دبانے والے۔'' بڑبڑاتی ہوئی کچن کی جانب چلی گئی۔
بہت دن ہو گئے ہیں جو روکھی سوکھی ہم کھا رہے تھے اُس میں دو افراد کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔ نا بھائی کبھی پوچھتا ہے نہ بھابھی کہ میری جوان بہن اور میرے بوڑھے ماں باپ کہاں جاتے ہیں، کیا کرتے ہیں اور اس گھر کا نظام کیسے چلتا ہے۔
ایک دن میں مزدوری پر گئی ہوئی تھی کہ امّی ابّو بڑے بھائی کے پاس اپنی بپتا لے کر گئے کہ تمہارے ہوتے ہوئے میری بیٹی محنت مشقت کر کے ہمارا پیٹ پال رہی ہے۔ کیا ہماری نسبت تمہارا کوئی فرض نہیں بنتا۔ بقول ابّو جب وہ بڑے بھائی کے گھر گئے تو بڑے بھائی نے پس مژدگی کے عالم میں دروازہ کھول کر بڑی گرم جوشی سے ابّو کو گلے لگایا اور بولے ''آپ نہ آتے تو آج شام میں آپ کی طرف آتا'' ابّو نے وجہ پوچھی تو بتلانے لگے کہ میں اپنے شہر سے جہاز کے ذریعے دفتری کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جا رہا تھا کہ ایک عورت نے اُٹھ کر شور مچانا شروع کر دیا کہ اس داڑھی والے کو اتارو یہ دہشت گرد ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایک کر کے جہاز کی تمام سواریاں میرے خلاف ہو گئیں اور انتظامیہ نے مجھے جہاز سے آف لوڈ کر دیا۔ جوں ہی میں جہاز سے باہر آیا پولیس میری منتظر تھی۔ ہر چند تین دن کی قید میں پولیس نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا مگر اس قدر ذہنی کوفت پہنچائی کہ مجھے ماہر نفسیات سے رجوع کرنا پڑا۔ بڑے بھائی کی باتیں سن کر ابّو آب دیدہ ہو کر بولے ''کاش بیٹا میں کسی قابل ہوتا'' بڑے بھائی نے ابّو کے ہاتھ میں ایک بڑی رقم پکڑاتے ہوئے کہا ''ابّو سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ رقم لیجیے اور جس طرح مناسب سمجھیں واپسی کی تیاری کیجیے ہم پھر سے اپنا گھر، اپنا وطن آباد کریں گے'' بڑے بھائی کی بیوی کی نسبت ابّو نے سوال کیا تو بھائی نے کہا ''اُس کی مرضی ہے ساتھ چلے یا یہاں رہے ہم اب یہاں نہیں رہیں گے''
صباحت نے آ کر گھر خریدا، سیٹ کیا پھر والدین کو بلایا اور پھر بھائیوں کو۔ اُس کی دونوں بھابھیاں بھی خوشی خوشی آنے پر رضا مند ہو گئیں۔ اب وہ لوگ اعلیٰ ملازمتوں پر فائز ہیں۔ ایک ساتھ رہتے ہیں اُن کا گھر جنت کا نمونہ پیش کر رہا ہے۔ صباحت نے اپنی خوشی میں مجھے شریک کرنے کے لیے کینڈل ڈنر پر بلایا ہے۔ آج نجانے میں بھی کیوں خصوصی تیاری کے ساتھ صباحت کے ہاں کینڈل ڈنر پر جا رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ اُس کے گھر والوں پر اچھا تاثر قائم ہو سکے۔

''راگِ الفت''

شگفتہ نازلی (لاہور)

(خواجہ حیدرعلی آتش کی نذر)

ہمارے بھی ہیں، ترجماں کیسے کیسے — ہوئے ہیں مگر، امتحاں کیسے کیسے
جوسُن کے سناتے رہے دوسروں کو — ملے ہیں ہمیں، رازداں کیسے کیسے
وہاں بات سیدھی سمجھ ہی نہ آئے — یہاں حل ہوئے، چیستاں کیسے کیسے
اگرچہ حقیقت تو کچھ بھی نہیں ہے — ہوئے ہیں واں لیکن گماں کیسے کیسے
بہت پہلے اقبالؔ سمجھا گئے ہیں — ''ستاروں سے آگے، جہاں کیسے کیسے''
تھی خواہش شگفتہؔ ہمیں تو کلی کی — مگر واں کھلے گلستاں کیسے کیسے

○

تبسم انوار (کینیڈا)

رات بھر کوئی میرے دھیان میں تھا — ایک نشہ سا جسم و جان میں تھا
روح جھلسا رہی تھی کوئی تپش — گرچہ یہ جسم سائبان میں تھا
سر سے دستار تک نہ گرنے دی — بانکپن مر کے بھی جوان میں تھا
وہ اگر میں نہیں تھی تو پھر وہ — کون تھا جو تری امان میں تھا
ہمسری کرتی حوصلے کی مرے — ظرف اتنا کہاں چٹان میں تھا
اس کی جانب نہ لے سکی کروٹ — مسئلہ کوئی در میان میں تھا
گر پڑا خوف سے عدو میرا — تیر میرا ابھی کمان میں تھا
جل اٹھی جانے کون سی حسرت — اک دھواں چار سو مکان میں تھا
لمس تھا لطف تھا لطافت تھی — اور بدن پیار کی امان میں تھا
کاش وہ رس نصیب ہو مجھ کو — میر و غالب کی جو زبان میں تھا
دشمنوں کو معاف کر دینا — عیب یہ میرے خاندان میں تھا
پھر وہ پیکر ڈھلا حقیقت میں — پہلے جو سوچ کی اڑان میں تھا
تھا کسی اور ہی جہاں کا وہ شخص — اور کسی اور ہی جہان میں تھا
خاک زادی تھی اس لیئے مخفی — میرا جوہر بھی خاک دان میں تھا
ذکر تھا جسمیں حسنِ قدرت کا — وہ قصیدہ تو میری شان میں تھا
ہر پتنگا رواں تھا اس کی طرف — سحر کچھ ایسا شمع دان میں تھا
تان کر خود پہ سو گئی اس کو — جو مزہ جسم کی تھکان میں تھا
جب تبسم سے تھی زمیں غافل — تذکرہ اس کا آسمان میں تھا

○

روپا صبا
(چندی گڑھ، بھارت)

ہے چبھن اتنی پھر بھی اُف نہ کروں
حکم ہے ضبط کی حدوں میں رہوں

اک ماتم ہے اُس کی خاموشی
جشن وہ پل، صدا جب اُس کی سنوں

راکھ کر دی ہیں جس نے اُمیدیں
لَو اُسی نام کی لگاتی پھروں

کب سے اس موڑ پہ کھڑی ہوں میں
وہ نہ آئے گا پھر بھی راہ تکوں

کہہ چکی ہوں خدا میں اس کو صباؔ
اس سے نفرت کروں تو کیسے کروں

○

حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

کبھی جو اس کی گلی میں جانا خیال رکھنا
صدا نہ کرنا نہ لب پہ کوئی سوال رکھنا

شکستہ خاطر ہے ان دنوں وہ اکیلا رہ کر
وہ جو بھی چاہے کہے، نہ دل میں ملال رکھنا

گزر رہی ہے عجیب صورت میں زندگانی
بھلا دیا ہے حسابِ ہجر و وصال رکھنا

اسے بھی کہنا کہ فصلِ گل ہے خزاں کی زد پر
عروج پا کر نظر میں عہدِ زوال رکھنا

محبتوں کے وہی زمانے پلٹ کے آئیں
کسی کے بس میں نہیں ایسا کمال رکھنا

میں نقشِ عبرت بنا حوادث کے راستے پر
جو کوئی پوچھے تو پیش تازہ مثال رکھنا

کسی بھی صورت حسنؔ یہ شامِ فراق گزرے
اداس لمحوں سے ربط اپنا بحال رکھنا

○

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی
(بہار، بھارت)

جانے کس کس کی زمیں کاٹ کے دریا نکلا
پھر بھی خود داری کا کچھ زعم دکھاتا نکلا

نیند لانے کو سنایا جو مجھے دادی نے
ظلم پیشہ کسی راجا کا وہ قصہ نکلا

مکتبِ عشق کا بدلا ہے کچھ ایسا انداز
یہ بھی بازیچۂ اطفال کے جیسا نکلا

کیسے فریاد رسی اپنی مؤثر ہوتی
حال دل جس سے کہا میں نے وہ بہرا نکلا

آج تک اپنی سمجھ پر ہے ندامت مجھ کو
میں نے سمجھا تھا جسے غیر وہ اپنا نکلا

ہے عروج اور زوال ایک بنائے ہستی
تیرگی کا ہوا جب خون سویرا نکلا

گھر میں شاید نہیں محفوظ رہا اپنے بھی
پَر بریدہ کوئی گلشن سے پرندہ نکلا

عشق میں کام بھی ہشیاری سے ہم کیا لیتے
عاشقوں میں نہیں اب تک کوئی دانا نکلا

ہوتا ہے اس شخص سے کس طرح مناظرؔ کا نباہ
صاف باہر سے مگر دل کا جو میلا نکلا

○

ملک زادہ جاوید (نوئڈا، بھارت)

بلندی سے اترنا چاہتے ہیں ہم اپنے پر کترنا چاہتے ہیں
محبّت کو خدا محفوظ رکّھے سنا ہے دونوں مرنا چاہتے ہیں
نئے اک آئینے کی ہے ضرورت کئی چہرے سنورنا چاہتے ہیں
شجر کو فکر ہے سائے کی لیکن سبھی پتے بکھرنا چاہتے ہیں
حرارت ہی نہیں جن کے بدن میں وہ مجھ میں آگ بھرنا چاہتے ہیں
تلاطم ہے خیالوں کی ندی میں جو ڈوبے تھے ابھرنا چاہتے ہیں

○

احسان قادر (لاہور)

تمہارے شہر کی ہر شے سے پیار کرتے ہیں خس و غبار پہ بھی دل نثار کرتے ہیں
عطا تمہاری ہیں سب ہجر و وصل کے لمحے سو دانہ دانہ انہیں ہم شمار کرتے ہیں
عروجِ ذات فقط عجز و انکسار میں ہیں پسند عجز کو پروردگار کرتے ہیں
سیاہِ ہجر کو دل سے نکال کر اب ہم نئے وصال سے دل ہم کنار کرتے ہیں
یہ درد میرے لئے سود مند ٹھہرا ہے اسی لئے تو یہی کاروبار کرتے ہیں
جو کم نگاہی پہ میری ہیں معترض سن لیں ہم ایک جست میں صدیوں کو پار کرتے ہیں
میں دیکھ آیا ہوں ساری کرامتیں ان کی وہ دشت لائقِ رشکِ بہار کرتے ہیں
نگار خانۂ حیرت کو دیکھ کر ہم لوگ نئے جہانوں کی رہ اختیار کرتے ہیں

○

حسنین اقبال (تربت، بلوچستان)

ہوا کا زور یہاں اب چلے گا کوئی نہیں چراغ سارے جلیں گے بجھے گا کوئی نہیں
بنانا خود ہی پڑے گا اب راستہ ہم کو یہ شہرِ سنگ ہے یہاں پر ہٹے گا کوئی نہیں
ہے اب کی بار جنگ ایسی محاذِ الفت پر ہمیں یہ خوف ہے اب کے بچے گا کوئی نہیں
ہمیں وہ شوق سے چھوڑے مگر ہمارے بعد قسم سے اسکو پھر ہم سا ملے گا کوئی نہیں
یہ نئی بات نہیں یہ اصولِ فطرت ہے تباہ کر کے کسی کو بسے گا کوئی نہیں
الاپتے رہو تم لاکھ راگ الفت کے یہاں سب لوگ ہیں بہرے سنے گا کوئی نہیں
خدارا روک لو تعصب کے زہر کو مل کر اگر یہ پھیل گیا تو بچے گا کوئی نہیں
سبھی بے موت مریں گے ہوس کے مارے اب یہاں اب بھوک کے ہاتھوں مرے گا کوئی نہیں
یہ میرے لوگ ہیں میں خوب ان کو جانتا ہوں پڑا جو وقت کبھی تو رکے گا کوئی نہیں
ازل سے حسن اور عشق مقابل ہیں مگر انا کے دونوں ہیں قیدی جھکے گا کوئی نہیں
ہمارے عہد کا حسنین المیہ ہے یہی یہاں حقوق کی خاطر اٹھے گا کوئی نہیں

○

نعیم الدین نظر

(میر پور خاص)

بھید کیسے کھلے ستم گر پر — انگلیوں کے نشاں ہیں خنجر پر
ہر شرارت پہ پیار آتا ہے — جان چھڑکتا ہوں جانِ مادر پر
ہاتھ میں عرضیاں ہیں لوگوں کے — اور تالا پڑا ہے دفتر پر
رنگ غالب رہے اُداسی کے — ڈوبتی شام کے مقدر پر
حسرت دید دل میں باقی رہی — تھک کے بیٹھا ہے کوئی پتھر پر
بام و در سے خوشی ٹپکتی ہے — تیری یادوں کا راج ہے گھر پر
خوف دُہرا تھا ماہی گیروں کو — کالے بادل بھی تھے سمندر پر
گھر کی کھڑکی سے جب خزاں اُتری — پھول بکھرے پڑے تھے بستر پر
لڑکھڑاتا ہوں ہر قدم پہ نظر — کیسا غم کا پہاڑ ہے سر پر

○

ظفر علی ظفر

(اسنسول، بھارت)

تمام سمت ہوا تیز چل رہی ہے ابھی — یہ اور بات بلا میری ٹل رہی ہے ابھی
کبھی تو خواب مری پلکوں میں سجائے وہ — کہ رتجگوں سے مری آنکھ جل رہی ہے ابھی
گلاب و لالہ وَ نسریں کا ہے خدا حافظ — فضا ہمارے چمن کی بدل رہی ہے ابھی
کسی بھی پودے پہ کھل پائے گا نہ پھول کوئی — ہر ایک سمت زمیں زہر اگل رہی ہے ابھی
سبھی دریچہ و در اپنے بند کر لینا — کہ سر پھروں کی جماعت نکل رہی ہے ابھی
ہیں آنسوؤں کے سمندر مری ان آنکھوں میں — جہاں میں برف کی چوٹ پگھل رہی ہے ابھی
وہ کب کا مر چکا ہے ہجر یار میں لوگو — بدن سے روح ظفر کی نکل رہی ہے ابھی

○

عطاء الرحمٰن قاضی

(عارف والا)

اندر سے شب و روز وہ باہر کا الجھنا — اچھا نہیں لگتا ہے مے و ساغر کا الجھنا
ہر شام مناظر کا بکھرنا وہ بہر سُو — ہر گام مسافر سے کسی ڈر کا الجھنا
کچھ وسعتِ امکاں تو نہیں وسعتِ صحرا — دیوار کی ہے قید نہ وہ در کا الجھنا
ہر روز وہی کشمکشِ شام و سحر ہے — ہر روز مکینوں سے وہی گھر کا الجھنا
دکھلائے گا کیا رنگ عطا دیکھئے دل سے — اک لمحۂ موجود و میسّر کا الجھنا

○

شاہدہ تبسم

(راولپنڈی)

دل دستکیں سناتا ہے دریا سے پار کی
یہ بھی تو ایک وجہ ہے خوں میں فشار کی

دو پھول پاس آئے کھلے اور بکھر گئے
یہ مختصر کہانی ہے فصل بہار کی

آنکھوں سے نیند دور ہے پھیلا ہے بحرِ شب
اور ڈولتی ہے کشتی دل بے قرار کی

رخصت کی صبح تم جہاں مل کر بچھڑ گئے
اب تک ہے شبنمی وہ زمیں سبزہ زار کی

گو دھند میں ہیں لپٹے مناظر تمام اب
تم آؤ تو کھلے گی فضا مرغزار کی

وہ پاس آ کے بیٹھے کھلے ہم پہ بھی کبھی
جس پر تھی ہم نے دل سے جوانی نثار کی

کچھ کہنے بولنے کا نہ آیا ہنر ابھیں
دنیا سے چپقلش یہ رہی اہل دار کی

کیا عشق نے تمہیں بھی نکما ہے کر دیا
شدت نہیں ہے پہلے سی اب تیرے وار کی

تو آفتاب حسن ہے میں تیری اک کرن
میری تمہاری نسبت شعلہ شرار کی

تیری محبتوں نے ہی بخشا ہے وہ سرور
دنیائے دل کی شکل ہے اب نغمہ زار کی

○

ابن عظیم فاطمی

(کراچی)

وقت وافر ہے میسّر رنگ و ساماں کے لیے
کس قدر بے چین ہوتے ہیں کسی "ہاں" کے لیے

تین سو چونسٹھ (۳۶۴) دنوں تک تیری یاد آتی نہیں
کر لیا مخصوص دن ہم نے بھی اک "ماں" کے لیے

ہم دعاء کی آرزو رکھتے ہیں لیکن کیا کہیں
کچھ نہیں کرتے کوئی پل اس نگہباں کے لیے

مرکز و محور جسے ہونا تھا بے مصرف ہے وہ
اور مصروفِ عمل ہیں دشتِ امکاں کے لیے

آسماں نے بے سبب نازل کیا ہے کیا عذاب
اک سبق پنہاں رہا ہے نسلِ ناداں کے لیے

تیری جنّت اس کے قدموں میں رکھی اللہ نے
در بہ در پھرنے لگا ہے کیسے ارماں کے لیے

رب نے اپنی رحمتیں رکھی ہیں جس دل میں عظیم
تُو بتا تُو نے کیا کیا اس مہرباں کے لیے

○

فرح کامران

(نیویارک)

اک مکاں شہرِ تمنا میں ہوا کرتا تھا
دل کا دروازہ اسی سمت کھلا کرتا تھا

میں بھی رہتی تھی کسی حسن نظر میں آباد
ایک شہزادہ مرے دل میں رہا کرتا تھا

میرے آنگن میں بہت پھول کھلا کرتے تھے
زندگی کا بھی عجب رنگ ہوا کرتا تھا

خشک کر ڈالا زمانے کی ضرورت نے اسے
ایک دریا تھا جو صحرا میں بہا کرتا تھا

یہ جو کھنڈرات ہیں یاں لوگ رہا کرتے تھے
اک زمانہ تھا یہاں شہر ہوا کرتا تھا

کیا شناسائی تھی اس کی مرے جسم و جاں سے
آنکھ سے دل میں مرے جھانک لیا کرتا تھا

○

گیانی میرایار

پنجابی کہانی:سلیم خان گمی

ترجمہ: **نویدسروش** (میرپورخاص)

''اُس جنگل میں رابن ہڈ کا ڈیرا تھا۔'' گیانی بولا۔''کوئی ثبوت'' میں نے کہا۔''تمام لوک گیت دیکھ لو،سب لوگ یہی کہتے ہیں۔کتابوں میں درج ہے۔انگریزی سماجی تاریخ میں آیا ہے۔'' گیانی نے ایک ہی سانس میں کہا۔''گیانی جی،تم بھولو ہو،انگریز جھوٹ بولتے ہیں اور اُن کی کتابیں اور تاریخ بھی جھوٹ بولتی ہے۔'' میں نے چڑ کر کہا۔''مگر لوک گیت تو جھوٹ نہیں بولتے۔لوک گیت کہتے ہیں کہ اس جنگل میں رابن ہڈ کا ڈیرا تھا''۔''ہوگا،مجھے کیا؟اگر نہیں بھی تھا تو پھر بھی اُس کا ڈیرا اسی جنگل میں ہونا چاہیے کیوں کہ میرا یار اقبال سنگھ گیانی یہ کہتا ہے'' میں نے کہا۔''اب تُو مذاق پر اُتر آیا ہے۔میں بات ہی نہیں کرتا۔'' وہ ناراض ہوتے ہوئے بولا۔

ہم لندن سے ایک لمبی کار میں آئے تھے۔یہ کار گیانی کی تھی اور وہ مجھے سیر وتفریح کروانے کے لیے آیا تھا۔ہم ایک بار میں بیٹھے تھے جو بار کم ڈھیا زیادہ لگ رہا تھا۔لگتا تھا یہاں شراب نہیں گنے کا رس بکتا ہے۔گنے کے رس کی عجیب سی بُو مجھے پریشان کررہی تھی۔۔۔''اس بار کی شراب بس اتنی پرانی ہے جتنی رابن ہڈ کی کہانی۔'' گیانی بولا۔

''کوئی چارسوسال پرانی ہوئی۔'' رابن ہڈ کا نام سن کر مجھے پھر غصہ آ گیا تھا''۔۔۔''ہاں بس یہی سمجھو'' گیانی بیئر کا گھونٹ بھر کر بولا۔اس نے بُرا سامنہ بنایا۔

''بوآتی ہے تو نہیں پیو کس حکیم نے کہا ہے کہ بُری چیز کھاؤپیو'' میں نے اُس کو ہدایت دینے والے انداز میں کہا۔۔۔یہ رابن ہڈ کا بار ہے یہاں بیٹھ کر رابن ہڈ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دارو پیتا تھا۔بعد میں یہاں بار بن گیا۔لگتا ہے رابن ہڈ کی بچی ہوئی شراب کا ذائقہ اُسی وقت سے چلا آ رہا ہے۔'' گیانی نے ایسی سنجیدگی سے یہ بات کہی جیسے گوربانی سُن رہا ہو۔

''شراب اجو کی ہو یا رابن ہڈ کے وقت کی۔ہے تو بُری چیز'' میں نے کہا اور پائین ایپل کا آخری گھونٹ بھر کر گلاس خالی کردیا۔اس بار سے اُٹھ کر ہم جنگل کی طرف آئے اور شام ڈھلے تک گھومتے پھرتے جب بُری طرح تھک گئے تو لندن واپسی ہوئی۔اندھیرا ہو چکا تھا اور لالٹین روشن ہو چکی تھیں۔کچھ دیر ٹی وی دیکھنے کے بعد میں نے تین سلائس گرم کیے۔مکھن اور جیم اُن پر چپڑا اور پھر اگلے کمرے میں صوفے پر تکیہ رکھا اور سو گیا۔اُٹھ کر سلائس تیار کیے مکھن اور جیم اُس پر لگایا کریم ڈال کر کوفی کا مگ تیار کر کے ناشتہ کیا اور باہر کار میں جا کر بیٹھ گیا۔گیانی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔گیانی کار ڈرائیو کر کے ان کو اسکول چھوڑنے چلا گیا۔اس کام سے فارغ ہو کر گیانی کاروبار میں مصروف رہا۔میں نے اسے جن کی طرح کام کرتے دیکھا۔ہم نے دوپہر کو ہلکا پھلکا کھانا کھایا۔

''میں لکھ پتی ہوں اور کروڑ پتی بننا چاہتا ہوں۔'' وہ کار چلاتے ہوئے آہستہ سے بولا۔۔۔انگریز کسی کو بھی کروڑ پتی نہیں بننے دیتے۔لندن میں کروڑ پتی بننا مشکل ہے مگر میں بن جاؤں گا۔وہ سکھوں والے پُر یقین لہجے میں بولا۔۔۔گیانی تو سودخور پٹھانوں کی طرح قرضہ دیتا ہے اور پھر تیرا سود اصل رقم سے بڑھ جاتا ہے۔یعنی داڑھی سے مونچھیں لمبی ہو جاتی ہیں۔کروڑ پتی بننے کا اس سے اچھا اور سستا نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ آج رات کسی الھڑ گوری میم سے تیرا متعہ کرادوں'' گیانی نے ہنس کر کہا اور میرے سوال کا جواب گول کر گیا۔متعہ مجھے نہیں کرنا تم میرے سوال کا جواب دو۔'' میں نے غصے سے کہا''تم ٹھیک کہتے ہو'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔۔۔

میرا لندن کا یہ پہلا چکر تھا۔جب میں کچھ عرصے بعد پھر لندن گیا تو گیانی مجھے کچھ تھکا تھکا سا لگا۔۔۔''گیانی!رابن ہڈ والا بار؟'' میں نے پوچھا''یار دفع کر،رابن ہڈ کو اور اُس کے بار کو،مجھے تو بھگت سنگھ اور دُلا بھٹی یاد آتے ہیں۔'' وہ بولا۔''انقلابی ہو گئے ہو'' میں نے طنزاً کہا۔۔۔''بھائی صاحب!انگریز دیسی لوگوں کو آگے نہیں آنے دیتے۔ہم سکھ ہوں یا مسلمان،ناستک ہوں یا دھارمک شہری ہوں یا دیہاتی یہ ہمیں آگے نہیں نکلنے دیتے'' وہ رک رک کر بول رہا تھا۔''تیرے سودخوری بینک کا کیا بنا؟'' مجھے اُس کی لکھ پتی سے کروڑ پتی بننے والی بات یاد تھی۔''۔۔۔''فیل ہو گیا۔کچھ قرض واپس نہیں ہوا۔کچھ سود نہیں ملا کچھ انکم ٹیکس والے پیچھے پڑ گئے''۔۔۔''یہ تو بہت بُرا ہوا'' میں نے افسوس کیا۔۔۔''بس جیتتے جیتتے ہار گیا،کروڑ پتی بنتے بنتے رہ گیا'' وہ مخصوص سکھوں والی خوش دلی سے بولا۔''پینے پلانے کا کیا حساب ہے'' میں نے اسے کھنگالا''پائین ایپل جوس پر آ گیا ہوں بات پیسے کی ہوتی ہے اور آج کل جیب خالی ہے'' وہ مجھے ہیتھرو ایئرپورٹ سے سنٹرل لندن لے جا رہا تھا۔کار اُس کی تھی اور اُس نے میرے خرچے پر میرے لیے ہوٹل میں ایک کمرا بک کروا دیا تھا۔''میں تمہیں اپنے گھر اس لیے نہیں لے کر گیا کہ میں نے اپنا بڑا گھر بیچ کر ایک چھوٹا گھر خریدا ہے وہ گھر تمہارے لائق نہیں''۔۔۔''بھابی سجونت کور کا کیا حال ہے'' میں نے اخلاقاً پوچھا۔۔۔''مزے میں ہے۔ایک لانڈری پر ملازمت کرتی ہے''۔''پہلے تو بھابی ملازمت نہیں کرتی تھیں'' میں نے کہا۔۔۔''ہاں پہلے میں خود کفیل تھا اور وہ لکھ پتی کی بیوی تھی'' اُس نے جواب دیا۔''تو اب؟''''اب تو بس گزارا ہے۔میرا بڑا بیٹا پڑھائی سے بھاگ گیا وہ ایک دکان پر کام کرتا ہے۔چھوٹا کا کا ہاتھ چھوڑ ہے انگریز لڑکیوں کے ساتھ لڑتا رہتا ہے اسے گورا رنگ زہر لگتا ہے۔بیٹی سندر کور انگریزی بولتی ہے،انگریزی پڑھتی ہے اور اُس کی سوچ بھی انگریزی ہے۔سکھ مذہب کی کوئی بات اُس کے پاس نہیں ملے گی۔

''بے بے جی''۔۔۔''وہ آج کل اسپتال میں ہیں،شوگر ہے۔دعا کرو آرام آ جائے۔'' اُس نے جواب دیا۔

''اللہ سے نا اُمید نہیں ہونا چاہیے۔اللہ فضل کرے گا تو مایوس نہ ہو''
''تو آج کل کیا کر رہا ہے''۔۔۔میں ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔گاڑی میری اپنی ہے۔''
اُس نے میری بات کا جواب دیا۔

میں سات دن لندن میں رہا مگر پھر گیانی سے نہیں مل سکا دو ایک مرتبہ صرف فون پر گپ شپ ہوئی۔وہ ہمیشہ مجھے جلدی میں لگا۔میں جب کاروبار کے سلسلے میں تیسری بار لندن گیا تو گیانی مجھے نہیں ملا۔مجھے یورپ کے دوسرے ممالک بھی جانا تھا اور ریگ کے کچھ افسروں سے ملنا تھا۔ریگ انگریزی میں چیتھڑے یا کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکروں کو کہتے ہیں۔درحقیقت سستے سلے سلائے کپڑوں کا کاروبار ریگ انڈسٹری کہلاتا ہے۔میری دُکان لاہور کے لنڈا بازار میں ہے اور میں تھوک کا کاروبار کرتا ہوں اس سلسلے میں مجھے ہر سال یورپ کے کئی ملکوں میں جانے کا موقع ملتا ہے۔

ایک بار میں یورپ کے دورے کے بعد لاہور آیا تو مجھے گیانی کا خط ملا۔۔۔''میں لندن چھوڑ کر جالندھر آ گیا ہوں۔بڑا بیٹا ایک سکھ کی دکان پر کام کرتا تھا وہ سکھ کی بیٹی سے شادی کر کے الگ ہو گیا۔چھوٹا بیٹا ایک دن گورے بدمعاشوں سے لڑائی میں ختم ہو گیا۔بیٹی گھر سے ایسی گئی کہ اُس کا ایک سال تک کوئی پتا ہی نہیں چلا۔بے بے کو انگریز ڈاکٹر نہ بچا سکے۔میری ٹیکسی ایک حادثے میں تباہ ہو گئی اور بیمہ کمپنی نے یہ کہہ کر بیمہ کی رقم ادا نہیں کی کہ ''قصور آپ کا تھا'' میں گھر بیچ کر تمہاری بھابی کو لے کر جالندھر آ گیا ہوں۔ویزا لے کر جالندھر آ جاؤ تا کہ ماضی کے دنوں کی یادیں پھر تازہ ہو جائیں مگر آنے سے پہلے مجھے خط کے ذریعے اطلاع دے دینا کیوں کہ یہاں سیاسی قتل ہو رہے ہیں اور سرکار چھاپے مار رہی ہے۔تمہارے لیے دل بے قرار ہے۔تیری بھابی کا سلام۔

تیرا اپنا

اقبال سنگھ گیانی

خط عام سا تھا مگر از جالندھر پڑھ کر مزا ہی آ گیا۔گیانی فارسی بھی خوب جانتا تھا اس لیے از جالندھر کے لفظ اُس کی ایرانی تہذیب سے واقفیت ظاہر کر رہے تھے میں اس خط کا جواب کیا دیتا بس یہی سوچ کر چپ ہو گیا کہ گیانی جالندھر سے گیا تھا اور واپس جالندھر لوٹ آیا ہے جو اُس نے مجھے جالندھر آنے کی دعوت دی تھی اُس میں خطرے کی بُو تھی اس لیے میں جالندھر نہیں گیا اور نہ ہی جواب دیا۔مجھے چھ ماہ بعد بھابی کا خط ملا کہ تیرا بھائی گیانی دلی جیل میں ہے۔اُس پر الزام ہے کہ وہ لوگوں کو سکھ مذہب کے خلاف اُکساتا ہے۔انقلاب کی باتیں کرتا ہے۔

بھابی نے یہ بھی لکھا کہ وہ شہیدی محلے کے گوردوارے میں رہتی ہے آنے والوں کی سیوا کرتی ہے اور گوردوارے کی جھاڑو دیتی ہے صفائی کرتی ہے۔

میں نے چاہا کہ دو دن کے لیے دلی جاؤں اور گیانی کو کہوں کہ معافی مانگ کر باہر آ جا مگر مجھے ڈر ہے کہ کہیں پولیس مجھے بھی اندر نہ کر دے۔

(پنجابی کہانیوں کی کتاب ''تر دے پیر'' کی کہانی گیانی میرا یار)

- بقیہ -

ذوالفقار عادِل کی اُردو غزل

یہ جو دریا کی خموشی ہے اِسے
ڈوب جانے کی اجازت سمجھو

"باغ" کا استعارہ کلاسیکی شاعری میں خصوصاً میر سے ہوتا ہوا جدید غزل میں کئی اہم شعرا کے علاوہ ثروت حسین، ادریس بابر اور ذوالفقار عادل کی غزل میں عکس ریز ہوا ہے۔جس کی معنویت کو اِن مذکورہ شعرا نے انفرادی تشخص کے ساتھ برقرار رکھا ہے۔ذوالفقار عادل کے ہاں باغ کا استعارہ عصری آشوب سے فرار کی صورت اختیار کرنے کی وقیع علامت ہے جو شاعر کی طبیعت میں بدرجہ اتم حلول ہو کر خوشبو و سرمستی کی پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔اُس کے نزدیک باغ کا متبادل یہ عصری آشوب نہیں صرف اور صرف من چاہی فرار کی دنیا "خواب" ہے:

سارا باغ الجھ جاتا ہے ایسی بے ترتیبی سے
مجھ میں پھیلنے لگ جاتی ہے خوشبو اپنی مرضی سے
باغ اپنی طرف کھینچتا تھا مجھے خواب اپنی طرف
بینچ پر سو رہا ہوں میں دونوں کا جھگڑا چکاتا ہوا
باغ ایسا اُتر گیا دل میں
پھر وہ کھڑکی نہیں کھلی ہم سے

اجتماعی طور پر "شرق میرے شمال میں" نے غزل کے محدود جگالی شدہ موضوعات کے منجمد تالاب میں ارتعاش پیدا کیا ہے۔اِس کی شعری کائنات یہ ادبی استدلال پیش کرتی ہے کہ غزل کے دائرہ کار میں ابھی کافی تخلیقی امکانات پنہاں ہیں۔جن کا ادراک روایت کی معرفت، انتھک مشقِ سخن، الفاظ کے ماہرانہ استعمالات تخلیقی قوت اور بے پایاں مشاہدے کا متقاضی ہے۔یہ شعری مجموعہ اِن اوصاف سے متصف ہونے کے ساتھ اکیسویں صدی کی شعری حنا بندی میں معیاری دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔یہی اِمتیازات جہاں "شرق میرے شمال میں" کو رواں صدی کے اولین ترین کامیاب شعری مجموعوں میں انفرادی شناخت بخشتے ہیں وہیں غزل کے سفر میں "سنگِ میل" کی ذمہ داریاں بھی تفویض کرتے ہیں۔

☆

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یو ایس اے)

قسط......۹

میری آنکھیں ایک کمرے کے بستر پر کھلیں۔ میں نے خالی الذہن اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ میرے بستر کو کئی مردوں اور عورتوں نے گھیرا ہوا تھا۔ مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر سب کے چہروں پر جیسے روشنی چھا گئی۔ میری آنکھیں نواب صاب پر آکر تھم گئیں۔ وہ میرے بستر کے داہنی جانب سرہانے کے قریب کھڑے تھے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش میں نے اپنا سر تکیے سے اٹھانا چاہا لیکن درد کی شدت سے سر نہ اٹھا سکا۔ کراہ کر میں نے اپنا سر واپس تکیے پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ کسی نے اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھا تو میں نے ایک بار پھر آنکھیں کھولیں۔ یہ ہاتھ میرے بستر پر باہنی جانب بیٹھی ہوئی ایک اجنبی خاتون کا تھا۔ خاتون نے چہرے کے علاوہ اپنا تمام جسم اور سر کے بال ایک نیلی چادر سے ڈھانپے ہوئے تھے۔ اُن کی آنکھوں کی سرخ رنگت ان کے رونے کی چغلی کھا رہی تھی۔ اب کیسے ہو بیٹا؟ انہوں نے بڑے شفیق لہجے سے پوچھا، ان کی آواز میں مجھے اپنے لیے کافی درد محسوس ہوا۔ میں نے خالی نظروں سے ایک بار پھر اپنے اطراف کا جائزہ لیا تو میں نے نواب صاب کے دو دامادوں کے علاوہ کئی اور خواتین کو وہاں پر کھڑے دیکھا۔ میری آنکھیں ایک بار پھر نواب صاب پر آکر جم گئیں۔ نواب صاب کو دیکھ کر مجھے اپنے بے ہوش ہونے سے پہلے سر پر تا بڑ توڑ حملے یاد آئے۔ میں نے اس بار اپنا سر اٹھانے کی بجائے اپنا ہاتھ اٹھا کر سر پر پھیرا تو مجھے اپنے سر پر کوئی پٹی بندھی ہوئی محسوس نہ ہوئی۔

اب کیسے ہو بیٹا؟ اسی شفیق خاتون نے بڑے میٹھے لہجے میں مجھ سے دوبارہ وہی سوال کیا۔ میں ۔۔۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ بالآخر میں نے اپنے اندر کی تمام توانائی جمع کرنے کے بعد پوچھا، مجھے کیا ہوا تھا؟ نواب صاب بولے، یہ سب کچھ میری غفلت کی وجہ سے ہوا تھا۔ آپ کی سے غفلت کیا ہوا تھا؟ میں نے دوبارہ پوچھا۔ نواب صاب بولے، میں آپ کو باغیچے میں بٹھا کر اندر آپ کی ہدایت کے مطابق گھر والوں کو حویلی خالی کرنے کا کہنے کے لیے گیا۔ مجھے آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ اگر میں جانے سے پہلے کسی ملازم کو آپ کے پاس چھوڑ جاتا تو یہ واقعہ رونما نہ ہوتا۔ کون سا واقعہ؟ میں نے پوچھا۔ نواب صاب بولے دراصل یہ باغ صرف اہلِ خانہ کے لیے بنایا گیا ہے۔ کوئی نامحرم اس باغ میں کبھی نہیں آیا۔ اس باغ میں یا تو ہمارے بچے ہوتے ہیں یا پھر ہماری خادمائیں۔ ہماری بیٹی باغ میں ٹہلنے گئی اور آپ کو اکیلا بیٹھے دیکھ کر غلط فہمی کا شکار ہوگئی کہ آپ غنڈے ہیں اور خدانخواستہ کسی غلط نیت سے باغ میں چھپے بیٹھے ہیں۔ اس نے آپ کے سر پر ضربیں لگا کر اپنی دانست میں بڑی بہادری دکھاتے ہوئے آپ کو نادانستگی میں تکلیف پہنچائی۔ اس حادثے کا علم ہوا تو مجھے خود پر غصہ آیا کہ آخر میں نے اتنی کوتاہی کیسے برتی۔ میں نے خاندانی ڈاکٹر کو بلا کر آپ کو دکھوایا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ سر زخمی نہیں ہے۔ یعنی کوئی خون وغیرہ نہیں نکلا اور آپ کے بے ہوشی کی وجہ سر کی چوٹیں نہیں بلکہ حیرت تھی۔

ایسے میں ایک خادمہ ایک ٹرے میں دودھ کا گلاس اور اس کے ساتھ اسپرو کی دو گولیاں لے کر آئی۔ اسی شفیق خاتون نے خادمہ سے گلاس لیا اور مجھ سے اسی لہجے میں مخاطب ہو کر کہا، بیٹے یہ گولیاں دودھ کے ساتھ کھا لو۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ سر کا درد جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے دودھ اور گولیوں کی حاجت سے زیادہ اس خاتون کا لہجہ بھایا۔ اس لیے میں نے اس بار آہستہ سے اپنا سر تکیے سے اٹھایا تو اس خاتون نے اپنا سہارا دے کر بیٹھنے میں میری مدد کی۔ میں نے اٹھ کر گولیاں منہ میں ڈالیں اور دودھ کا گلاس اپنے ہاتھ میں لے کر چند گھونٹ پینے کے بعد دودھ کا گلاس خادمہ کو واپس کرنے کے بعد ایک بار پر لیٹ کر نواب صاب سے پوچھا، میرا بیگ کہاں ہے؟ تم بیگ کی فکر مت کرو بیٹا، مجھے معلوم تھا کہ اس بیگ میں کیا ہے اس لیے میں نے اسے کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیا اور اسے وہیں پڑا رہنے دیا ہے۔ نواب صاب نے جواب دیا، پھر بڑی لجاجت سے بولے، بیٹا ہمیں معاف کردو یہ سب کچھ میری کوتاہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں نے ایک بار پھر تکیے سے اٹھتے ہوئے جواب دیا، غلط فہمیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔ اور غلط فہمی پر مبنی بات جتنی جلدی بھلادی جائے اتنی اچھی رہتی ہے۔ مجھے کسی سے کوئی گلا نہیں ہے۔ میرے خیال میں آپ تمام لوگ اس واقعے کو مجھ سے زیادہ سنجیدگی سے لے رہے ہیں۔ جو ایک طرف تو آپ کی خاندانی نفاست کی دلیل ہے دوسری جانب آپ کی اعلیٰ ظرفی کی۔ میرے سرہانے بیٹھی ہوئی خاتون نے مجھے اٹھتا دیکھ کر پوچھا، کیوں اٹھ رہے ہو بیٹا؟ مجھے اپنا کام پورا کرنا ہے، میں نے جواب دیا۔ کام وام پورا ہوتا رہے گا بیٹا، تم بس آرام کرو۔ میرے سر کا درد بھی اب خاصا ہلکا ہو گیا تھا اور میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا، میں اب بالکل ٹھیک ہوں، آپ فکر نہ کریں۔ بیٹے تم کم از کم آج کا دن آرام سے گزارو۔ کل سے اپنا کام دوبارہ شروع کر دینا۔ نواب صاب بڑی پژمردہ آواز میں بولے۔ ان کے ساتھ ہی گھر کے باقی افراد نے بھی اپنی آوازیں ان کے ساتھ ملائیں تو میں نے ہتھیار ڈال دئے۔

پردہ بڑے مسلمان خاندانوں کی آبرو ہوتا ہے۔ میرے لیے ان کی شرمندگی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی تھی اس واقعے کے بعد گھر کے تمام افراد اپنا پردہ ترک کر کے میرے سامنے آگئے تھے اور مجھے بات بات پر بیٹا اور آپ کی بجائے تم کہہ کر مخاطب ہو رہے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں نے ان کا کہنا نہ مانا تو یہ لوگ اپنے آپ کو عمر بھر ملامت کرتے ہوئے یہ سمجھتے رہیں گے کہ میں نے انہیں ابھی تک معاف نہیں کیا۔ یہ سوچ کر میں نے کہا، اچھا جی میں کل سے اپنا کام شروع کروں گا۔ لیکن میں اب الحمدللہ خود کو خاصا بہتر محسوس کر رہا ہوں اس لیے اگر آپ کی اجازت ہو تو میں باغیچے میں جا کر اپنا بیگ اٹھا لاؤں؟ چلیں میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں، نوابزادہ کلیم نے کہا۔ میں بستر سے اٹھا تو مجھے معلوم

ہوا کہ میں جوتوں کے ساتھ بستر پر لٹایا گیا تھا۔ سر میں اب بھی ہلکا ہلکا لیکن قابلِ برداشت درد تھا۔ میں خود کو سنبھالتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ کلیم نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے چلانے کی کوشش کی تو میں نے کہا، میں ٹھیک ہوں کلیم بھائی۔ اس نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کلیم کی قیادت میں چلنے لگا۔ کمرے سے نکلا تو مجھے پتہ چلا کہ میں اس وقت گھران خانے کے کسی کمرے میں تھا۔ برآمدے میں لگے گھڑیال پر میری نظر پڑی تو اس وقت سہ پہر کے چار بجے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ میں کئی گھنٹوں بعد ہوش میں آیا تھا۔

برآمدے کے پچھلے دروازے سے نکل کر ہم باغ میں داخل ہوئے تو کلیم نے مجھے کچھ ایسے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ بیگ کہاں رکھا تھا؟ میں اس کی بات کو سمجھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ایک کونے کی جانب بڑھا۔ کلیم سے کوئی بات نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر تمام گھر والوں کی طرف سے مجھ سے معافی مانگی تو میں نے اپنے داہنے ہاتھ سے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا، کوئی بات نہیں کلیم بھائی ایسی غلط فہمیاں اکثر ہو جاتی ہیں۔ بلکہ آپ بھی میری جانب سے گھر والوں کو ایک بار پھر یقین دلائیں کہ میرے دل میں کسی کے لیے کوئی کدورت نہیں ہے۔ میں نے اس واقعے کو ایک حادثہ سمجھ کر اب تک بھلا دیا ہے۔ آپ بھی اسے ویسے ہی بھول جائیں۔ کلیم کہنے لگا، اس واقعے کے بعد ماموں حضور بار بار خود کو ملامت کئے جا رہے ہیں۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کلیم سے کہا، آپ بھی انہیں سمجھائیں اور میں بھی انہیں کہوں گا کہ خواہ مخواہ خود کو ہلکان کرنے کا کیا فائدہ۔ اتنے میں ہم لوگ حملے کی جگہ پہنچ گئے۔ جس جگہ میں بیٹھا تھا وہاں قریب ہی بیگ پڑا تھا۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بیگ کے قریب مٹی کھدی تھی جس کا مطلب تھا کہ بہادر نے اپنا کام نہیں روکا تھا۔ میں نے بیگ اٹھا کر کلیم سے کہا، کلیم بھائی مجھ سے باقی دن بے کار نہیں بیٹھا جائے گا۔ اگر کہیں سے چند کتابیں مل جائیں تو کم از کم میرا بقیہ دن اچھا کٹ جائے گا۔ چلو میرے ساتھ میں تمہیں چند کتابیں نہیں کتابوں کی پوری لائبریری دے سکتا ہوں، کلیم نے چہک کر کہا۔ ہم واپس گھران خانے میں گئے تو کلیم نے پاس گزرتی ہوئی ایک خادمہ سے کہا، ماموں حضور کو بتا دو کہ ہم لائبریری جا رہے ہیں۔ گھران خانے سے ہوتے ہوئے ہم مہمان خانے پہنچے، مہمان خانے کے درمیان ایک بڑا سا ہال نما کمرہ تھا جس کی چاروں دیواروں پر خانوں میں کتابیں بڑے سلیقے سے سجی ہوئیں تھیں اور درمیان میں میز اور کرسیاں بچھی تھیں۔ اپنے لیے چند کتابیں منتخب کرنے کے بعد میں نے کلیم سے کہا، مجھے واپس اپنے کمرے میں چھوڑ آئیں۔ وہ کہنے لگا، پہلے ماموں حضور کے پاس جا کر طے کرتے ہیں کہ تمہارا سامان کسی اور کمرے میں تو نہیں بھیجا گیا۔ میں نے کہا، تو پھر آپ یوں کریں کہ مجھے یہاں لائبریری میں ہی چھوڑ جائیں۔ وہ بولا، ٹھیک ہے تم یہاں بیٹھ کر پڑھو اور میں ابھی واپس آ کر تمہیں بتاتا ہوں۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ کر کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد نواب صاب اور کلیم آ گئے۔ ان کے ساتھ وہ خاتون بھی تھیں جو میرے بستر پر تیمار داری کے لیے بیٹھی تھیں اور ساتھ ایک ملازم بھی تھا۔ میں انہیں آتا دیکھ کر کرسی سے کھڑا ہونا ہی چاہتا تھا کہ نواب صاب نے مجھے بیٹھے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے، بیٹے میں چاہتا ہوں کہ تم اس مہمان خانے میں آ جاؤ۔ یہاں پر لائبریری بھی تمہارے قریب ہو گی اور ہم بھی تمہارے قریب ہوں گے۔ اس وقت مہمان خانے میں کوئی اور مہمان بھی نہیں ہے۔ میں نے کہا، حضور اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میری اجازت کے بعد انہوں نے اپنے ساتھ آئے ہوئے ملازم سے میرا سامان لانے کو کہا۔ لائبریری کے سامنے مہمان خانے کا ایک کمرہ میرے لیے کھولنے کے بعد نواب صاب نے اپنے ساتھ آنے والی خاتون کا تعارف کرتے ہوئے کہا، یہ ہماری بڑی بیگم ہیں۔ میں نے انہیں خالہ جان کہہ کر آداب کیا تو انہوں نے ایک بار پھر میرا حال دریافت کیا، بیٹا امید ہے۔۔۔ وہ ایک بار پھر معافی مانگنے کے لیے منہ کھولنے والی تھیں کہ میں نے انہیں کہا، خالہ جان خدارا آپ مجھے بار بار شرمندہ نہ کریں۔ میرے خیال میں اگر آپ لوگ اس غیر اہم واقعے کو یکلخت بھلا دیں تو یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ کلیم کہنے لگا، ممانی حضور، رامو ٹھیک کہتا ہے ہم اس واقعے کو بار بار دہرا کر اس کی اہمیت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

بات نواب صاب اور ان کی بیگم کی سمجھ میں بھی آ گئی، کہنے لگے اچھا ٹھیک ہے اب کے بعد ہم اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں کریں گے۔ نواب صاب بولے اچھا یہ بتاؤ کہ کل کا کیا پروگرام ہے۔ میں نے جواب دیا، آپ کل صبح میرے لیے ساری حویلی خالی چھوڑ کر اپنے اہلِ خانہ اور تمام خدمتگاروں کے ساتھ کم از کم پورے دن کے لیے چلے جائیں۔ آپ صرف دو ملازم میرے لیے یہاں چھوڑ جائیں۔ بڑی بیگم بولیں، بیٹے تمہارا اب اس گھر میں کسی سے کوئی پردہ نہیں۔ تم جب چاہو، بغیر دروازہ کھٹکائے گھران خانے میں آ اور جا سکتے ہو۔ کلیم بولا تو پھر گھر والوں کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ رامو اپنا کام گھر والوں کی موجودگی میں کرتا رہے گا۔ نواب صاب بولے نہیں، یہ بات پردے یا بے پردگی کی نہیں، یہ بات سانپ کی ہے۔ وہ کیسے؟ بڑی بیگم نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ نواب صاب نے انہیں تفصیل بتائی تو وہ کہنے لگیں، ہاں پھر تم ہو سب کا گھر سے جانا ضروری ہے۔

ایسے میں خادم میرا سامان لے آیا تو اس کے ساتھ بہادر بھی تھا۔ بہادر نے آتے ہی ہمیں بتایا کہ اس نے اب تک تیس کے قریب قبروں سے سانپ نکال کر جلائے ہیں اور وہ قبریں میرے لیے کھلی چھوڑ دیں ہیں اور ایک بوری کھگل کا برادہ بھی منگوا لیا ہے۔ تم کل ناشتے کے بعد میرے ہاں آ جانا، میں باقی سب کچھ سنبھال لوں گا، میں نے بہادر سے کہا۔ بہادر کے جانے کے بعد نواب صاب بولے ہم بھی کل صبح ناشتے کے بعد حویلی سے چلے تو جائیں گے لیکن ہمیں واپس کب آنا ہوگا؟ کل میں سب سے پہلے گھران خانہ اور پچھلا باغ سہ پہر تک دیکھ لوں گا۔ اس لیے آپ کے علاوہ گھر کے باقی افراد سہ پہر تک واپس آ سکتے ہیں۔ جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق

ہے تو آپ نے دیکھا تھا کہ آپ کی بُو پانے کے بعد آپ کی موجودگی میں میرے سانپ کا کیا حال ہوا تھا۔ اس لیے میں اپنے سانپ کو آپ کی موجودگی میں کھلا نہیں چھوڑنا چاہتا۔ آپ میرے بلوائے بغیر حویلی میں واپس نہیں آئیں گے۔

ملازم نے سہ پہر کی چائے کی تیاری کی خبر دی تو ہم سب نواب صاب کے پیچھے گھران خانے میں چائے پینے گئے۔ چائے پچھلے باغیچے میں ایک میز پر بیٹھے لوازمات کے ساتھ لگی تھی۔ ہم لوگ میز کے گرد لگی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بڑی بیگم نے چائے بنا کر میرے آگے رکھ کر بیٹھے کے لیے پوچھا تو میں نے جواب دیا کہ مجھے میٹھا پسند نہیں۔ ارے، بڑی بیگم نے حیرت سے کہا، لوگ میٹھے پر جان دیتے ہیں اور تمہیں میٹھا پسند نہیں۔ میرے علم میں تم پہلے انسان ہو جسے میٹھے سے کوئی رغبت نہیں۔ بڑی بیگم کے علاوہ گھر کی تمام خواتین کسی بھی گفتگو میں بہت کم حصہ لیتی تھیں۔ تینوں نوابزادوں کے ساتھ والی کرسیوں پر شاید ان کی بیگمات بیٹھی تھیں اور ان سے کچھ فاصلے پر باقی خواتین بیٹھی تھیں۔ میں نواب صاب کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر اپنی نظریں جھکائے چپ چاپ چائے پیتا رہا۔ وہاں زیادہ دیر تک بیٹھ کر ان کے لیے بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا اور میرے سر میں ہلکا سا درد بھی ہونے لگا تھا، اس لیے چائے پی کر میں نے نواب صاب سے اپنے کمرے میں جانے کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے کے ساتھ ہی نواب صاب نے کہا، عشائیہ بھی ہمارے ساتھ کرنا بیٹا۔ پھر انہوں نے قریب کھڑے ہوئے ایک خادم کو میرے ساتھ جانے کو کہا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے خادم کو اسپرو کی کچھ گولیاں لانے کو کہا۔ وہ مجھے اسپرو دے کر اپنے کمرے میں چھوڑ گیا۔ میں نے پانی کے چند گھونٹ سے اسپرو کی گولیاں کھائیں اور بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹنے کے کچھ دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔ میں شاید سویا ہی رہتا اگر خادم آ کر مجھے عشائیے کے لیے نہ جگاتا۔ سونے سے سر کا درد نہیں رہا اور میں خود کو کافی ہلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے غسلخانے میں جا کر غسل کیا۔ نہا کر طبیعت اور زیادہ بشاش ہو گئی۔ کرتا پاجامہ پہن کر میں انتظار میں بیٹھے خادم کی قیادت میں ایک بار پھر گھران خانے کی جانب چل پڑا۔ سب لوگ کھانے پر میرے منتظر تھے۔ میں حسبِ عادت نگاہیں جھکائے کھانا کھاتا رہا۔ معلوم نہیں میری خاموشی کی وجہ سے گھر کے باقی افراد خاموش تھے یا اس گھر میں کھانے کے دوران لوگ نہیں بولتے تھے۔ ان کے کم بولنے کی وجہ جو بھی تھی، میرے لیے اچھی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ لوگ ابھی تک صبح والے واقعے سے کافی شرمسار تھے اور میں وہاں زیادہ دیر تک بیٹھ کر اپنی موجودگی کے احساس سے کسی کو زیرِ بار اور شرمسار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد میں جلد ہی وہاں سے اٹھ کر لائبریری میں آ گیا۔ جو کتابیں میں نے اپنے لیے سہ پہر کے وقت منتخب کیں تھیں وہ ابھی تک میز پر رکھی تھیں۔ میں لائبریری میں ہی بیٹھ کر ایک کتاب پڑھنے لگا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک خادمہ لائبریری میں داخل ہو کر سیدھے میرے پاس آئی اور ایک لفافہ میرے ہاتھ پر رکھ کر کہنے لگی، حضور، میں کچھ دیر بعد اس کا جواب لینے آؤں گی۔ میں بند لفافہ ہاتھ میں لیے خادمہ کو جاتے دیکھتا رہا۔ پھر لفافہ کھول کر اس میں سے خط نکال کر پڑھنے لگا۔ خط اردو زبان میں تحریر کیا گیا تھا خط کی لکھائی بہت ہی خوبصورت تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے یہ خط ہاتھ سے لکھنے کی بجائے پرنٹ کیا ہو۔ لکھا تھا۔

رامو صاحب، تسلیمات

اللہ کرے میرے ہاتھ ٹوٹ جائیں کیونکہ یہ آپ کو تکلیف پہنچانے کے سزاوار ہیں۔ آپ بڑے دل کے مالک ہیں کہ مجھے معاف کر دیا، میں ابھی تک خود کو معاف نہیں کر پائی اور اس وقت تک خود کو معاف نہیں کروں گی جب تک آپ سے ذاتی طور پر معافی نہیں مانگوں گی۔ للہ آپ مجھے صرف چند لمحوں کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔

خط کے آخر میں کوئی نام نہیں تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا جواب دوں۔ میرے خیال میں تو بات ختم ہو گئی تھی۔ یا شاید یہ سب کچھ میرے لیے ختم ہوا تھا کسی اور کے لیے نہیں۔ ایک بار خیال آیا لکھ دوں کہ بھئی اب آپ اس بات کو جانے دیں۔ لیکن پھر سوچا کہ کچھ لوگ زیادہ حساس ہوتے ہیں اگر میں نے خط لکھنے والے کو یونہی ٹکا سا جواب دے دیا تو شاید وہ سمجھے کہ میں نے اس کو دل سے معاف نہیں کیا۔ یہ سوچ کر قریب پڑے ہوئے میز کی دراز کھول کر قلم تلاش کرنے لگا۔ قلم کی بجائے ایک پنسل ہاتھ آئی تو میں نے بھی اردو میں اسی خط کے پیچھے جواب لکھا۔

نوابزادی جی، آداب۔

آپ کے ہاتھ بہت خوبصورت لکھتے ہیں، خدارا ان کو دعائے بد نہ دیں۔ کسی نامحرم کے پاس چل کر جانا آپ کے شایانِ شان نہیں ہوگا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ میں نے اس واقعے کو ایک حادثہ سمجھ کر اب تک بھلا دیا ہے۔ آپ بھی اسے ویسے ہی بھول جائیں۔ آپ کو مجھ سے بذاتِ خود معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو پھر آپ کی آمد میرے لیے باعثِ عزت ہوگی۔

رامو

میں نے خط اسی لفافے میں ڈال کر ایک جانب رکھ دیا اور ایک بار پھر کتاب پڑھنے لگا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہی خادمہ پھر آئی۔ میں نے کچھ کہے بنا لفافہ اسے پکڑا دیا۔ خادمہ کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر کتاب پڑھنے کی کوشش میں لگ گیا۔ کوشش اس لیے کہ میرا دھیان خط کے جواب میں تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب خط آئے گا یا خط لکھنے والا آئے گا اور یا پھر میرا بلاوا آئے گا۔ اگرچہ اس گھر میں پچھلی بار مراقبے میں جاتے ہی اولے پڑے تھے اس کے باوجود اپنی عادت سے مجبور ہو کر میں نے کتاب ایک جانب رکھ دی اور آنکھیں بند کیے کرسی سے ٹیک لگائے مراقبے میں چلا گیا۔ مراقبے میں وقت بڑی تیزی سے گزرتا ہے اس لیے وقت کا صحیح اندازہ کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ معلوم نہیں میں کب

تک مراقبے کی کیفیت میں رہا۔اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے میں نے چندلمحوں کے لیے بے خیالی میں اپنی آنکھیں کھولیں تو گھبرا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے والی کرسی پر سلونی رنگت والا ایک گول اور تر و تازہ چہرہ اپنے لال لال ہونٹوں پر مرمریں مسکراہٹ بکھیرے، بڑی بڑی روشن آنکھوں سے مجھے دیکھنے میں محو تھا۔ میں چہرہ اس لیے کہہ گیا ہوں کہ اس کا باقی تمام جسم ایک بڑی پھولدار کشمیری شال نے ڈھانپ رکھا تھا۔ مجھے آنکھیں کھول کر اپنی جانب دیکھتا پا کر اس کی بھی محویت ٹوٹی اور ہم دونوں نے اپنی اپنی نظریں جھکا دیں۔

ایک بار پھر ہم دونوں نے ایک ساتھ نظریں اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک بار پھر ہم دونوں کی نظریں ایک ساتھ جھک گئیں۔ تیسری بار ہم دونوں نے ایک ساتھ نظریں اٹھا کر بیک زبان کہا، آپ، آپ۔۔۔ ہم دونوں نے خاموش ہو کر اس بار نظریں نہیں جھکائیں۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا، نوابزادی جی آپ، کب آئیں؟ جی میرا نام سارہ ہے اور مجھے آئے ہوئے کچھ دیر ہوئی ہے، اس نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ آپ کو خواہ مخواہ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ آپ نے آتے ہی مجھے ہشیار کر دیا ہوتا، میں نے کہا۔ دراصل آپ سوتے میں اتنے پرسکون لگ رہے تھے کہ میں نے آپ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں سو نہیں رہا تھا۔ فرصت کے چند لمحے مراقبے میں گزار رہا تھا، میں نے جواب دیا۔ تو اس کا مطلب ہے آج صبح بھی میں نے آپ کو مراقبے کے دوران۔۔۔ میں نے اس کی بات کاٹنے کے لیے بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، میرا خیال ہے اگر آپ اس واقعے کو بھول جائیں تو یہ مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ اس نے بھی غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ہم دونوں اپنی اپنی غیر ارادی حرکت پر جھینپ گئے اور اپنے اپنے ہاتھ واپس کھینچ لیے۔

آج صبح اگر میں نے آپ کے سر سے پہلے آپ کا چہرہ دیکھا ہوتا تو وہ حادثہ کبھی نہ ہوتا۔ دراصل آپ مراقبے میں خاصے پُرکشش لگتے ہیں۔ سارہ جی، قدرت کے اسرار عجیب ہوتے ہیں۔ ہر حادثے کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اس حادثے کی بھی کوئی وجہ ضرور ہوگی، میں نے کہا۔ اچھا تو پھر آپ مجھے بتائیں کہ اس حادثے کی کیا وجہ تھی؟ اس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ تاکہ میں آپ کی خوبصورت تحریر دیکھ اور پڑھ سکوں۔ آپ کی تحریر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک اچھی مصورہ ہوں گی۔ میرے جواب پر وہ ہنس پڑی۔ ہنستے ہوئے اس کے دونوں گالوں کے ڈمپل اور گہرے ہو کر اس کے حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔ پھر ہنستے ہوئے بولی، آپ کا قیاس درست ہے، میں مصوری کی طالبہ ہوں۔ آپ کی لمبی لمبی انگلیاں بھی آپ کے مصورہ ہونے کی چغلی کھا رہی ہیں۔ میں نے اس کے ہاتھوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ابھی جب میں نے آپ کو مراقبے میں دیکھا تھا تو میرا جی چاہا تھا کہ کاش میں آپ کا بھولا بھالا اور معصوم چہرہ کینوس پر اتار سکوں، سارہ بولی۔ گو کہ میں مصور نہیں ہوں لیکن اس کا قدردان ضرور ہوں۔ یہ میری عزت افزائی ہوگی۔ اس نے خوش ہو کر کہا، سچ، مجھے اندازہ ہے کہ آپ خاصے مصروف انسان ہیں۔ اگر آپ مجھے اپنی مصروف زندگی سے صرف دو گھنٹے دیں تو میں اپ کی تصویر بنا سکتی ہوں۔

تو ٹھیک ہے آپ جب چاہیں مجھ سے دو گھنٹے لے سکتی ہیں، میں نے اپنی بات پوری کی تو اس نے کہا نہیں، مجھے دو گھنٹے اکٹھے نہیں چاہئیں۔ فنِ مصوری کا سب سے پہلا قاعدہ یہ ہے کہ تصویر تھوڑے تھوڑے وقفوں میں بنائی جائے۔ کیا آپ مجھے ایک گھنٹہ آج اور ایک گھنٹہ کل دے سکتے ہیں؟ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن نواب صاب یا آپ کے گھر والوں کو اس بات پر کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟ میں نے پوچھا۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میرے گھر کے تمام افراد جانتے ہیں کہ میں اس وقت آپ کے ہاں آئی ہوئی ہوں۔ ہم لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کون اور کیوں بھروسے کے لائق ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کسی کو آواز دی، زہرہ ذرا مصوری والا بیگ تو میرے کمرے سے اٹھا لاؤ اور ہاں کمرے کے کونے میں پڑا ہوا کینوس بھی ساتھ لانا نہ بھولنا۔ جی اچھا ابھی لاتی ہوں بی بی جی، لائبریری کے دروازے کے باہر سے آواز آئی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا، سارہ بولی، یہ میری خادمہ زہرہ ہے جو آپ کے لیے میرا خط لائی تھی۔ میں اسے اپنے ساتھ لائی تھی اور میں نے اسے باہر انتظار کرنے کو کہا تھا۔ اچھا، میں نے زیادہ سوال کرنے سے پرہیز کرتے ہوئے کہا، دو گھنٹوں میں کسی کی تصویر بنانا بڑے کمال کی بات ہے۔ لگتا ہے آپ مصوری کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں، دو گھنٹے تو خاکہ بنانے میں لگیں گے۔ تصویر تو مہینوں میں پوری ہوگی۔ آپ کی بات درست ہے، میں مصوری کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں جتنا آپ کے بارے میں جانتا ہوں۔ میں نے اپنی کم علمی کا اقرار کرتے ہوئے کہا۔ اگر آپ مجھے اپنا پتہ دے جائیں تو تصویر مکمل ہونے پر میں آپ کو بھجوا دوں گی، اس نے کہا۔

میں نے اسی میز پر پڑی پنسل اٹھا کر کاغذ کے ایک پرزے پر اپنے کالج کا پتہ لکھ کر سارہ کو پکڑاتے ہوئے کہا، آپ مجھے اس پتے پر تصویر بھجوا سکتی ہیں۔ اس نے پرچہ میرے ہاتھ سے لے کر پڑھا تو حیرت سے بولی، آپ کانونٹ کالج میں پڑھتے ہیں؟ جی ہاں، میں نے مختصر سا جواب دیا۔ آپ مراقبہ کرتے ہیں، آپ سپیرے ہیں اور آپ کانونٹ کالج میں بھی پڑھتے ہیں، اور میرے علم کے مطابق یہ تینوں ہنر ایک دوسرے سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ آپ میں اور کون کون سی خوبیاں ہیں جو میں ابھی نہیں جانتی؟ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ جس طرح خوبصورتی دیکھنے والی آنکھوں میں ہوتی ہے اسی طرح خوبیاں محسوس کرنے والوں کے دلوں میں ہوتی ہیں۔ آپ کو مجھ میں جو کچھ دکھ رہا ہے یہ دراصل آپ لوگوں کے اپنے محبت بھرے رویے کا عکس ہے۔ آپ کا طرزِ کلام بھی منفرد ہے۔ کیا آپ مجھے اپنے بارے میں کچھ اور بتانا پسند کریں گے؟ اس نے پوچھا۔ میری زندگی ایک کھلی کتاب ہے اس کو کوئی بھی پڑھ سکتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی سرگزشت بغیر کسی تمہید کے اور سانپوں کے تمام واقعات نکالنے کے بعد سارہ کے گوش گزار کرنا شروع کی۔ جسے وہ محوِ حیرت بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔ میں نے اپنی بات ختم کی تو اس نے کہا، یہ

سرگزشت تو افسانوں، ناولوں اور کہانیوں کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔

پھر اس نے اپنے بارے میں مجھے بتاتے ہوئے کہا، ہم چھ بہنیں ہیں۔ میری سب سے بڑی بہن ذہنی طور پر معذور ہے اور تین بہنیں شادی شدہ ہیں۔ میرا نمبر پانچواں ہے میں اس گھر کی سب سے لاڈلی اولاد ہوں۔ اس لیے کبھی کبھار حد سے گزر جاتی ہوں جس کا ثبوت آپ نے آج صبح دیکھا تھا۔ اس نے اپنی بات پر میرے چہرے کا ردِّعمل دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا، اچھا بابا اچھا۔ اب کے بعد میں میری زبان پر صبح والی بات کا ذکر کبھی نہیں آئے گا۔ ہاں تو میں آپ کو اپنے بارے میں بتا رہی تھی، میں ایم اے کے پہلے سال کی میں مصوری کی طالبہ ہوں۔ خاندانی روایت کے مطابق پیدا ہوتے ہی میری منگنی میرے خالہ زاد سے طے کر دی گئی تھی۔ میرے سسرال والے کلکتہ میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ ہمارے خاندان کے بارے میں تو کچھ نہ کچھ ضرور جانتے ہوں گے۔

ایسے میں زہرہ لائبریری میں اپنے ایک ہاتھ میں بیگ اور دوسری بغل میں کینوس دبائے داخل ہوئی۔ میں اور سارہ نے اٹھ کر اس کی مدد سے کینوس ایک جانب رکھا اور سارہ نے بیگ کھول کر اس سے پنسل نکال کر تراشے۔ کینوس کو ہموار زمین پر رکھا۔ پھر مجھے کہا، اب آپ مراقبے میں جا سکتے ہیں۔ میں نے جواب دیا، آپ جب چاہیں مجھے بتائے بغیر چلی جائیں۔ میں بھی کسی وقت مراقبے سے نکل کر سونے چلا جاؤں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی آنکھیں بند کیں اور اپنے اندر ڈوب گیا، یا اپنے اندر غوطہ زن ہو کر اپنی روح کی تلاش میں کھو گیا۔

معلوم نہیں کتنی دیر بعد میں مراقبے سے نکلا تو لائبریری میں میرے علاوہ کوئی اور نہیں تھا اس لیے وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ صبح میری آنکھ بہادر کی آمد سے کھلی۔ اس نے مجھے بتایا کہ تمام حویلی خالی کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ چند اور لوگ حویلی میں میری مدد کے لیے رہ گئے ہیں۔ بہادر نے ناشتے کا پوچھا تو میں نے اسے صرف ایک کپ چائے لانے کو کہا۔ چائے پی کر میں کالی کا بیگ اٹھائے بہادر کے ساتھ نکل کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے تمام کھدی ہوئی قبریں دکھائیں تو میں نے دو مزدوروں سے کہا کہ وہ ان کھدی ہوئی قبروں کی مٹی میں کھنگل کا برادہ ملا کر قبریں دوبارہ بھرنا شروع کر دیں۔ اس کے بعد میں نے کالی کو بیگ سے نکالا، بہادر کل کالی کو دیکھ چکا تھا اس لیے اس نے کسی ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے بہادر سے کہا کہ مجھے حویلی کے تمام حصوں میں لے جائے۔ سب سے پہلے ہم گھران خانے گئے جہاں میں کالی کو ہر کمرے میں کھلا چھوڑ دیتا۔ وہ کمرے کا چکر لگا کر میرے پاس آ جاتی جس کا مطلب تھا یہ کمرہ سانپوں کی زد یا سانپوں کی بُو سے محفوظ ہے۔

گھران خانے سے نکل کر ہم خدام کے کوارٹروں میں گئے۔ وہاں سے ہم مہمان خانے پہنچے اور آخر میں ہم مردان خانے کے ایک ایک کمرے میں گھومے۔ پھر ہم نے کالی کے ساتھ گھران خانے کے پچھلے باغ کا رخ کیا۔ یہاں پر کالی نے تین جگہوں پر پڑاؤ ڈالا۔ کالی کا کسی جگہ بیٹھ جانا اس بات کی دلیل تھا کہ کالی نے اس جگہ سانپ کی بُو پائی ہے۔ کالی جہاں جہاں رکتی میں چاک سے ایک نشان لگا کر مزدوروں سے وہ جگہ کھود کر سانپ کی باقیات نکال کر جلانے اور قبر کی مٹی کو کھنگل کے برادے میں ملا کر دوبارہ بھرنے کو کہتا۔ بہادر کے کہنے کے باوجود میں دوپہر کا کھانا کھائے بغیر حویلی کے اندر باہر کالی کو لئے پھرتا رہا۔ کالی کی نشان دہی پر ہم نے تقریباً بیس کے قریب اور قبریں تلاش کیں۔ تمام کھودی ہوئی قبروں سے سانپ کی باقیات نکال کر اس مٹی میں کھنگل کا برادہ ملا کر دوبارہ بھروا دیا۔ اس کے بعد میں نے ایک بالٹی میں پانی منگوا کر اس میں کھنگل کا برادہ ملایا اور اس برادہ ملے پانی سے کالی کو نہلایا۔ کھنگل کے پانی میں غسل سے سانپ میں بُو کی پہچان ایسے دُھل جاتی ہے جیسے صابن سے میل دھلتی ہے۔ میں نے نواب صاب کی بُو دھونے کی وجہ سے کالی کو اس پانی میں غسل دیا تھا۔ یہ سب کچھ کرتے کرتے سہ پہر کے پانچ بج گئے۔

میں بہادر سے نواب صاب سمیت ان کے گھر والوں کو واپس بلانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دن بھر کی لگاتار محنت کی تھکن ٹھنڈے پانی کے غسل سے دور کرنے کے بعد میں اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ غنودگی کے عالم میں مجھے نواب صاب کی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو نواب صاب اور بہادر میرے کمرے سے واپس نکلنے والے تھے۔ میں نے آواز دے کر انہیں روک کر کہا، میں جاگ رہا ہوں اور آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ میری آواز سن کر پلٹے تو میں نے نواب صاب سے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ ان کے بیٹھنے پر میں ایک بار پھر کالی کو بیگ سے نکال کر نواب صاب کے قریب لایا۔ اس بار کالی نے کوئی خطرناک ردِّعمل نہیں دکھایا۔ جس کا مطلب تھا کھنگل کے برادے نے کالی کی بُو والی یاداشت دھو دی ہے۔ کالی کو بیگ میں واپس ڈالا تو نواب صاب نے مجھے تشکر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، میں تمہارا کس منہ سے شکریہ ادا کروں بیٹے۔ بہادر نے مجھے تمہاری آج کی تمام کارکردگی بتائی ہے۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ اب تمہارے سانپ کو میری بو بھی نہیں آ رہی۔ کیا اس کا مطلب ہے کہ اب میں ان بلاؤں کے متواتر حملوں سے محفوظ ہو گیا ہوں؟ ابھی آپ مکمل طور پر محفوظ نہیں ہیں، میں نے جواب دیا۔ وہ کیوں؟ وہ حیرت سے بولے۔ ابھی ہم نے کلکتہ میں مار کر دفنائے ہوئے پہلے سانپ کی قبر کو نہیں کھودا۔ جب تک وہ سانپ وہاں دفن رہے گا آپ کے پاس سانپ آنا بند نہیں ہوں گے۔ اس لیے جتنی جلد ہو سکے ہم نے کلکتہ میں مدفون سانپ کو وہاں سے نکالنا ہے۔ ارے ہاں! وہ تو میں بالکل بھول ہی گیا تھا، نواب صاب نے کہا۔ میں کل وہاں جانا چاہتا ہوں، میں نے انہیں بتایا۔ نواب صاب بولے میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔

آپ کو وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ وہاں میرے جانے کا انتظام کروا دیں اور وہاں پر کسی کو میری آمد سے مطلع کر دیں۔ باقی میں خود سنبھال لوں گا۔ میرا گھر چونکہ وہاں سے قریب ہے اس لیے میں آپ کی جاگیر سے ہوتا ہوا اپنے گھر چلا جاؤں گا، میں نے نواب صاب سے کہا۔ میں ان سانپوں کے خوف سے پچھلے چار سال سے اپنی جاگیر پر نہیں جا سکا۔ تمہارے ساتھ ایک بار جانے کے بعد بلا خوف و خطر آتا جاتا رہوں گا۔ اگر آپ یہی مناسب سمجھتے ہیں تو

پھر یہی سہی۔ہمیں اپنے سفر کا آغاز کل سے کر دینا چاہیے، میں نے کہا۔میں سفر کے سارے انتظامات کرا دیتا ہوں، اگر اللہ نے چاہا تو ہم کل ناشتے کے بعد نکل پڑیں گے،نواب صاب بولے۔

ایسے میں ایک ملازم نے ہمیں کھانا لگنے کی نوید سنائی۔یہ میرے لیے اس لیے بھی نوید تھی کہ میں نے آج صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اب مجھے بھوک لگی تھی۔ہم اٹھ کر کھانے کے لیے چل دیئے۔کھانے کی میز پر تمام اہلِ خانہ موجود تھے۔آج پہلی بار میں نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنے اطراف نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو سارہ مجھے ایک کونے والی کرسی پر بیٹھی نظر آئی۔ہم دونوں نے چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے سے آنکھیں چار کیں۔پھر میں نے اپنی آنکھیں جھکا کر کھانے کی جانب توجہ دی۔کھانے کے بعد میں جلد ہی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔یہاں کچھ دیر ستانے کے بعد میں لائبریری چلا گیا۔سارہ سے اگرچہ کوئی وقت طے نہیں ہوا تھا اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ وہ کل والے وقت پر آئے گی۔لائبریری میں کتابیں چھاننے میں کافی وقت گزار پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔کپڑے تبدیل کرنے کی بجائے میں ویسے ہی بستر پر دراز ہو گیا اور پھر مجھے نیند آنے میں دیر نہیں لگی۔معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ زہرہ نے مجھے بازو سے ہلا کر جگایا۔میں حیرت سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھا تو وہ بولی، بی بی جی لائبریری میں آپ کا انتظار فرما رہی ہیں۔میں نے کہا، اچھا تم جا کر انہیں بتاؤ کہ میں ابھی آتا ہوں۔میں نے جلدی سے غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ دھویا اور لائبریری آ گیا۔

سارہ آج کالے پھولوں والی سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔بڑی لجاجت سے بولی مجھے افسوس ہے کہ آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔انتظار کرانے کی زحمت کی معافی چاہتی ہوں۔دراصل کچھ لوگ ہمارے ہاں مہمان تھے انہیں واپسی کے لیے وداع کہہ کر آئی ہوں اس لیے کچھ دیر ہو گئی۔اگر آپ نے کل جانا نہ ہوتا اور مجھے آپ کی تصویر مکمل نہ کرنا ہوتی تو میں آپ کو سوتے سے ہرگز نہ جگاتی۔کوئی بات نہیں، دیر آید درست آید، میں نے کل والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ابا حضور بتا رہے تھے کہ آپ کل صبح ان کے ساتھ کلکتہ جا رہے ہیں، سارہ نے پوچھا۔جی ہاں، میں نے یہاں پر اپنا کام ختم کر دیا ہے اس لیے کل روانگی طے ہے۔مجھے زہرہ نے بتایا تھا کہ آج آپ سارا دن ایک سانپ کو حویلی میں لے کر پھرتے رہے، جی ہاں، پھر میں نے اس کو حویلی میں سانپ لے کر پھرنے کی وجہ بتائی تو وہ حیران ہو کر بولی، کیا یہ سانپ آپ کا پالتو ہے؟ نہیں اگر میں آپ کو بتاؤں کہ میں اس سانپ کا پالتو ہوں تو یہ زیادہ مناسب ہوگا، میں نے کہا۔اچھا وہ کیسے؟ وہ ایک بار پھر حیرت سے بولی۔اس لیے کہ اس سانپ نے اور میرے باپو نے مجھے پالا ہے، میں نے بتایا۔ اوہ اچھا! کل آپ نے جس کالی کا ذکر کیا تھا یہ وہی سانپ ہے؟ اس نے پوچھا۔جی ہاں بالکل وہی ہے، میں نے جواب دیا۔کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟ اس نے پوچھا، اگر آپ کو سانپوں سے ڈر نہیں لگتا تو مجھے دکھانے میں کوئی اعتراض نہیں، میں نے جواب دیا۔سانپ سے بھلا کس کو ڈر نہیں لگتا۔میں تو اس ہستی کو دیکھنا چاہتی ہوں جس کا آپ اپنی ماں جیسا احترام کرتے ہیں، اس نے کہا۔اچھا میں ابھی لاتا ہوں۔میں اسے وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے سے جا کر کالی کا بیگ اٹھا لایا۔

کالی کو بیگ سے نکال کر میں نے چوما اور پھر سارہ کو دکھاتے ہوئے کہا، یہ میری کالی ہے۔اس نے چند منٹ دور ہٹ کر کالی کو دیکھا، کالی نے اپنا منہ سارہ کی جانب کر دیا تو میں نے سارہ سے کہا، کالی آپ کے پاس آنا چاہتی ہے۔ آپ کو کیسے پتہ کہ یہ میرے پاس آنا چاہتی ہے؟ وہ بولی۔میں پچھلے سترہ سال سے اس کے ساتھ رہ رہا ہوں اس لیے میں اس کی زبان بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔یہ مجھے کاٹے گی تو نہیں؟ سارہ جھجکتے ہوئے بولی۔نہیں۔اسے کاٹنا تو نہیں چاہیے۔ویسے آپ کی مرضی اگر آپ اس کو ہاتھ نہ لگانا چاہیں، میں نے یہ کہتے ہوئے کالی کو بیگ میں ڈالنا شروع کیا تو سارہ بولی، اچھا آپ کہتے ہیں تو میں اسے اٹھا لیتی ہوں۔اس نے یہ کہتے ہوئے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔میں نے کالی کو سارہ پر رکھا تو اس کے تمام جسم نے ایک جھرجھری لی، پھر اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں تو کالی کا سر سارہ کے کندھوں پر رینگ رہا تھا۔اس نے کوئی حرکت نہیں کی بس ٹکٹکی باندھے کالی کو دیکھتی رہی۔کالی کا سر سارہ کے کندھوں سے ہوتا ہوا اس کے چہرے پر پہنچا اور کالی نے اپنی زبان نکال کر سارہ کے گال پر پھیرنا شروع کر دی۔سارہ بالکل ساکت کھڑی تھی۔میں نے اسے کہا، یہ آپ کا منہ چوم رہی ہے۔اچھا وہ شرما کر بولی۔ جی ہاں، میں نے جواب دیا۔کیا میں اس پر ہاتھ پھیر سکتی ہوں؟ اس نے پوچھا، جی ہاں۔اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ کالی کے سر پر رکھا تو کالی نے جواباً سارہ کے ہاتھ پر اپنی زبان پھیری۔

چند لمحوں بعد سارہ کہنے لگی، میرا خیال ہے اب کافی ہو گیا ہے۔اب آپ اسے میرے جسم سے اٹھا لیں۔میں نے کالی کو اٹھا کر چوما اور اسے بیگ میں رکھ دیا۔سارہ بیگ کی جانب دیکھتی ہوئی بولی، کسی کو میری بات پر یقین نہیں آئے گا کہ میں نے کسی شیش ناگن کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا تھا اور کسی شیش ناگ نے میرا بوسہ بھی لیا تھا۔پھر کہنے لگی اگر آپ چاہیں تو اس ناگن کو اپنی گود میں رکھ کر مراقبے میں چلے جائیں۔میں کالی کو بھی آپ کی تصویر کے ساتھ شامل کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا، سانپ آخر سانپ ہوتا ہے، مراقبے کے دوران میں اس کی کسی حرکت کو نہیں دیکھ پاؤں گا۔اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ اس کو صرف تصویر میں ہی شامل کریں۔میری بات سارہ کی سمجھ میں آ گئی۔کہنے لگی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اس کو آپ کی تصویر میں ضرور شامل کروں گی۔اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے میری ادھوری تصویر دکھا دیں، میں نے کینوس پر پردے کے پیچھے چھپی تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔کوئی مصور اپنا ادھورا شاہکار کبھی کسی کو نہیں دکھاتا۔ تصویر مکمل ہونے پر آپ کو بذریعہ ڈاک مل جائے گی اور ہاں اس کی رسید دینا نہ بھولیے۔اس نے حکیمہ انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔ٹھیک ہے میں آپ کی طرف سے بھیجی گئی اس تصویر کا شدت سے منتظر رہوں گا اور میں بھی تصویر ملتے ہی

آپ کواس کی رسید بھی بھجواؤں گا، میں نے جواب دیا۔ میں نے کالی کو بیگ اپنے پاس رکھ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا، کل شاید میں آپ کو خدا حافظ نہ کہہ سکوں، اس لیے مراقبے میں جانے سے پہلے میں آپ کو خدا حافظ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ آج بھی کل کی طرح اپنا کام ختم کرنے کے بعد آپ جاسکتی ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں مراقبے میں جاتا سارہ نے جھجکتے ہوئے کہا، اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔ جی ضرور، میں نے جواب دیا۔ وہ اچانک بڑے جذباتی انداز میں بولی، کل میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے۔ ہم بہنوں نے ساری عمر ایک بھائی کی تمنا کی تھی اور ہر لڑکی کے ذہن میں اپنے بھائی کے لیے ایک خاکہ سا ہوتا ہے۔ میرے ذہنی خاکے کے مطابق اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو وہ بالکل آپ جیسا ہوتا۔ سارہ کی بات جیسے میرے دل کے کسی گہرے خانے میں لگی۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، میری بھی کوئی بہن نہیں ہے۔ اگر میری بہن ہوتی تو وہ بھی بالکل آپ جیسی ہوتی۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ آج کے بعد آپ مجھے اپنا بھائی کہا کریں؟ آپ نے میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کر دی، اس نے بدستور جذباتی انداز میں بھائی کہتے ہوئے مجھے اپنی بانہوں میں بھرلیا۔ پھر نہ جانے مجھے کیا ہوا، میں بے ساختہ رونے لگا۔ مجھے روتا دیکھ کر سارہ بھی رونے لگی۔ ہم اسی حالت میں کافی دیر تک ایک دوسرے کو گلے لگائے آنسو بہاتے رہے۔ آنسوؤں کا یہ طوفان تھما تو ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ اس نے میرے آنسو اپنی چادر سے پونچھتے ہوئے کہا، بہنوں کی موجودگی میں بھائی نہیں رویا کرتے پگلے۔ میں رو تو نہیں رہا، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ ایک بہن کے ملنے کی خوشی کے آنسو، میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ آپ کو یاد ہے کل میں نے کہا تھا کہ ہر ہونی میں کچھ نہ کچھ مصلحت ہوتی ہے۔ کل والے واقعے کی وجہ سے، بہن بھائی کا ملاپ تھا۔

کیا تم اب بھی اپنی باجی کو چھوڑ کر واقعی کل جانا چاہتے ہو؟ سارہ نے اداس لہجے میں پوچھا۔ فاصلے رشتوں پر بے اثر ہوتے ہیں۔ میں جہاں بھی رہوں گا آپ کے بھائی کی حیثیت سے رہوں گا، میں نے جواب دیا۔ اچھا تو میں یہ تصویر تمہیں بذریعہ ڈاک نہیں بھجواؤں گی۔ اب یہ تصویر تمہیں خود آ کر لے جانی ہو گی۔ تصویر مکمل ہونے پر میں تمہیں خط لکھ کر بتا دوں گی۔ آپ یہ تصویر مکمل ہوں سے پہلے بھی اپنے بھائی کو خط لکھ سکتی ہیں۔ میں گھر پہنچتے ہی آپ کو اپنی پہنچ کا خط لکھوں گا پھر آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔ سارہ نے پنسل سے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا پتہ لکھ کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا، مجھے چھوٹا سا خط بھی نہ لکھنا۔ اپنے بارے میں پوری تفصیل سے خط لکھا کرنا۔ بھائیوں کو اپنی بہنوں کی پرواہو یا نہ ہو لیکن بہنیں اپنے بھائیوں کے بارے میں ہر پل فکرمند رہتی ہیں۔ اور ہاں ان خوبصورت آنکھوں سے آنسو نہ بہانا۔ اچھا۔ مجھ سے کچھ نہ چھپانا اور مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتاتے رہنا، بہنیں اپنے بھائیوں کے رازوں میں امین ہوتی ہیں۔ اور ہاں اپنی صحت کا بھی خیال رکھنا۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ بہن بنانے کے بعد مجھے یہ سب کچھ کرنا پڑے گا تو اپنا فیصلہ سوچ سمجھ کر کرتا۔ اب چونکہ زبان دے چکا ہوں اس لیے آپ کی تمام ہدایات پر بلا جھجک عمل کروں گا۔ میرا خیال ہے اب رات کافی بیت چکی ہے، آپ اپنا تصویری خاکہ مکمل کرلیں۔ میں نے مسکراتے کہا، اوہ ہاں، میں تصویر بنانا تو بالکل ہی بھول گئی۔ دراصل تم نے مجھے میری زندگی کی اتنی پیاری شے کا تحفہ دیا ہے جس نے مجھے باقی سب کچھ بھلا دیا ہے۔ صرف میں نے ہی نہیں آپ نے بھی مجھے ایک بہن جیسی مقدس ہستی کا تحفہ دیا ہے، میں نے جواب دیا۔ اچھا اب تم مراقبے میں چلے جاؤ اور میرے اس تحفے کو سنبھال کر رکھنا، پیارے بھیا۔ میری طرف سے خدا حافظ، سارہ میرا گال تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ خدا حافظ باجی، کہنے کے بعد میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کئے مراقبے میں چلا گیا۔

اپنے ماتھے پر کسی کے بوسے کے احساس کے ساتھ میں نے آنکھیں کھولیں۔ سارہ باجی، میرے ماتھ پر اپنے ہونٹوں کی مہر لگا کر جارہی تھی۔ میں نے اسے جانے دیا۔ اس کے جانے کے چند منٹ بعد میں نے کالی والا بیگ اٹھایا اور اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔ دوسری صبح ناشتے کے بعد نواب صاب، بہادر اور میں کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے بہادر سے کھنگل کا برادہ ساتھ لینے کو کہا۔ اجمیر شریف سے کلکتہ کا سفر خاصا لمبا اور صبر آزما تھا۔ بہادر اور میں باری باری گاڑی چلاتے رہے۔ بہادر تھک جاتا تو میں گاڑی چلاتا اور میرے تھکنے پر وہ۔ نواب صاب نے راستے میں خود گاڑی نہیں چلائی۔ شام کے چھ بجے ہم لوگ نواب صاب کی جاگیر پر پہنچے۔ نواب صاب کے خدام چار سال بعد نواب صاب کو جاگیر پر دیکھ کر حیران ہوئے۔ دو دن کے سفر کی تھکاوٹ سے ہم تقریباً ادھ موئے ہو گئے تھے اس لیے کھانا کھا کر جلدی سونے کے لیے چلے گئے۔

دوسرے دن ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میں نے نواب صاب سے مارے ہوئے سانپ کی قبر کی نشان دہی کرنے کے بارے میں استفسار کیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ عمارت سے باہر لائے اور داہنی جانب ایک ٹیلے کی سمت اشارہ کر کے بولے، مجھے جگہ تو ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ میں نے سانپ کو اس ٹیلے پر ہی کہیں دفنایا تھا۔ میں نے انہیں ٹیلے سے اترنے کا اشارہ کیا۔ کالی کو بیگ سے نکال کر ایک بار پھر میں نے چھوڑ دیا۔ وہ ٹیلے کے ایک کونے پر اُگی ہوئی گھاس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ میں نے کالی کے بیٹھنے کی جگہ پر ایک نشان لگایا اور کالی کو اٹھا کر بیگ میں رکھنے کے بعد، بہادر سے اس جگہ کی کھدوائی کروا کر سانپ کی ہڈیاں وہاں سے نکال کر جلوائیں اور قبر کی مٹی میں کھنگل کا برادہ بھرنے کے بعد میں نے کالی کو ایک بار پھر کھنگل کے پانی سے نہلایا۔ یہ سب کام تقریباً تین گھنٹوں میں مکمل کرنے کے بعد میں نے نواب صاب کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا، اللہ کے فضل سے اب کوئی سانپ آپ کا پیچھا نہیں کرے گا۔ اس سے پہلے کہ نواب صاب کچھ کہتے، میں نے کہا، میرا کام آپ کے ہاں ختم ہو گیا ہے اور ہمارا گاؤں یہاں سے سو میل کے فاصلے پر ہے، اگر آپ مجھے وہاں بھجوانے کا انتظام کردیں تو میں آپ کا مشکور رہوں گا۔ بیٹے تم نے میرے لیے اتنا

بڑا کام کیا ہے اب تم مجھے بتاؤ کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ نواب صاب نے کہا۔ بس آپ مجھے اپنی دعاؤں میں شامل رکھا کریں، میں نے جواب دیا۔ میری دعائیں تو ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں گی، بیٹے۔ اگر تم کچھ دن اور رک جاتے تو اچھا ہوتا، نواب صاب بولے۔ نہیں حضور، نہیں میں گھر سے ایک ہفتے سے نکلا ہوا ہوں۔ میرے باپو اکیلے ہیں، میں اگلا ہفتہ ان کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، میں نے جواب دیا۔ جیسی تمہاری مرضی بیٹے۔ میرے گھر کو اپنا سمجھنا اور کبھی کبھار ہمیں یاد کرتے رہنا، نواب صاب نے کہا۔ جی اچھا، میں نے جواب دیا۔

نواب صاب نے بہادر سے کہا کہ وہ مجھے گاڑی پر گاؤں چھوڑ آئے۔ کلکتہ سے ہمارے گاؤں تک گاڑی کا یہ سفر چار گھنٹوں پر مشتمل تھا۔ کلکتہ سے میں گاڑی خود ہی چلاتا ہوا اپنے گاؤں پہنچا۔ بہادر میرا سامان لے کر میرے ساتھ جھونپڑی تک چھوڑ آنے پر بضد تھا۔ شاید اسے میرا گھر دیکھنے کی خواہش تھی۔ مجھے کسی سے اپنی اوقات چھپانے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے اسے اوپر جھونپڑی تک آنے دیا۔ جس وقت میں جھونپڑی میں گھسا باپو میرا خط پڑھ رہے تھے۔ مجھے اچانک دیکھ کر انہوں نے اپنی باہیں پھیلا کر مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ ارے، ابھی کچھ دیر ہوئی تمہارا خط ملا تھا۔ میں تو تمہارے لیے اداس ہو گیا تھا رے، باپو بولے۔ بہادر نے میرا سامان ایک جانب رکھا اور اجازت چاہی تو باپو نے کہا، تم میرے راموکو گھر لائے ہو کچھ کھا پی کے چلے جاؤ بابو۔ بہادر بولا، جی اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ مجھے جلدی واپس کلکتے پہنچنا ہے۔ نواب صاب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ جیسے تمہاری مرضی بابو۔ خدا تمہارا حامی اور ناصر ہو، باپو نے اسے جانے دیا۔ بہادر کے جانے کے بعد میں نے کالی کو بیگ سے نکال کر چھوڑا تو وہ اُڑتی ہوئی باپو کے کندھوں پر جا پڑی۔ باپو نے کالی کو سہلاتے ہوئے اس سے کہا، اب اس گھر میں تمہارا ایک دوست بھی آ گیا ہے۔ کالی کا دوست، کیا مطلب؟ میں نے باپو سے پوچھا۔ وہ بولے، کالی کی غار کی جانب دیکھو۔ میں نے دیکھا تو حیران رہ گیا کہ کالی کی غار کے دہانے پر ارون کو ڈسنے والا چھنچھنا سانپ بیٹھا مجھے تک رہا تھا۔

میں تو اسے جنگلوں میں چھوڑ آیا تھا۔ یہ یہاں کیسے واپس آیا ہے باپو؟ میں نے باپو سے پوچھا۔ باپو بولے، تمہارے جانے کے دو روز بعد یہ آ کر جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ میں سمجھا تھا شاید تم نے اسے یہاں سے زیادہ دور نہیں چھوڑا تھا اس لیے یہ واپس آیا ہے۔ یہ سوچ کر میں دوسرے روز اسے یہاں سے کافی دور جا کر چھوڑ آیا۔ اگلے روز یہ پھر جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھا تھا۔ اس کی ایک بات مجھے پسند آئی کہ یہ جھونپڑی کے اندر جانے کے بجائے دروازے پر بیٹھتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں جیسے اندر جانے کے لیے ہماری اجازت کا طالب تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں اسے اندر لے آیا۔ اب پچھلے کئی دنوں سے کالی اور تمہاری غیر موجودگی میں یہ میرا جی بہلاتا رہا ہے۔ میں نے اس کی رنگت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کا نام چترا رکھا ہے۔ اس کا نام مجھے اچھا لگا اور اگر یہ یہاں رہنا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کالی اسے یہاں رہنے کی اجازت دیتی ہے یا نہیں؟ میں نے باپو سے کہا۔ باپو نے کالی کو اپنے کندھوں سے اتار کر غار کے پاس بیٹھے ہوئے چترے کے پاس رکھ دیا۔ کالی نے غار کے منہ پر کسی اور سانپ کو بیٹھے دیکھا تو اپنا پھن پھیلا کر ایک فٹ اوپر کھڑی ہو گئی۔ چترا بھی جواباً ایک فٹ کھڑا ہو کر اپنا چھنچھنا بجانے لگا۔ ہم دونوں دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگے۔ باپو اور میں آج پہلی بار امریکی اور ہندوستانی سانپوں کے درمیان لڑائی دیکھنے کے لیے تیار ہو گئے۔

- بقیہ -

جورنی اور مونے

مونے کے گھر میں داخل ہوئی تو یہ بھی ٹورسٹ سے بھرپور تھا۔ گھر کے اندر تصویر لینے کی اجازت نہ تھی۔ کچن بے حد کشادہ اور خواب گاہ میں بستر بہت چھوٹا۔۔۔ مونے اور ایلس (بیوی) کی خواب گاہ الگ الگ۔۔۔ کیونکہ وہ بیوی کی نیند خراب کیے بغیر پَو پھٹنے سے پہلے اُٹھ کر کُہاسے کے ساتھ مصوری کرتا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں تین کھڑکیاں ہیں جن سے باغ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ کھانے کا کمرہ بے حد کشادہ جس کا رنگ ابھی تک برقرار رکھا گیا ہے پیلا اور بلیو جو اُس وقت تھا۔ ہر طرف دیواروں پر جاپانی نقش و نگار آویزاں ہیں۔ مونے گھر کے اندر اپنی تخلیقات نہیں بلکہ دوسرے فنکاروں کی پسندیدہ تخلیقات سجایا کرتا تھا۔ اسٹوڈیو بہت وسیع و عریض ہے اور بے حد روشن کیونکہ اس کی چھت بیشتر شیشے کی ہے۔ سب دیواریں مونے کی شاہکار مصوری تھامے کھڑی ہیں۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہوئی وہاں۔ ایسا لگا جیسے وقت Rewind ہو گیا ہو۔ جیسے مونے وہیں کہیں آس پاس موجود ہو۔

Water Garden مونے کی شاہکار تخلیق ہے۔ ایک الگ کائنات یہاں نظر آتی ہے۔ رنگوں، لہروں اور کرنوں کی۔ پانی کے چاروں طرف پھول، پتوں اور درختوں کی پرچھائیاں اور بیچ میں چھوٹا سا آسمان Weeping Willow جھک کر پانی کے بدن کو چومتا ہوا تالاب کے رخسار پر تیرتے ہوئے کنول کے حسین رنگ۔۔۔ اور پھر کرنوں اور رنگوں کا امتزاج ایسا نشہ طاری کرتا ہے کہ دل وہیں کھو جاتا ہے۔ یہ بستی، جورنی (Giverny) گرمیوں میں پھولوں کی بستی بن جاتی ہے۔ فنکارانہ زندگی کا مرکز۔ رنگوں کی موسیقی ہر طرف گونجتی ہے۔ میں۔۔۔ جورنی سے کتنی مالا مال ہو کر واپس آئی ہوں۔ وہاں کی برسوں پرانی یادیں، باغ کے سرخ، پیلے، سفید اور نیلے پھولوں کے یعقوت، زمرد، ہیرے، جواہرات، سب کچھ اپنے کینوس کے آنچل میں بھر کر چرا لائی ہوں۔۔۔!

جورنی اور مونے

پروین شیر
(کینیڈا)

ہواؤں کی لہروں پر جیسے برسوں پرانی خوشبو اور نغمگی تیر رہی تھی۔ فضاؤں کے کینوس پر جیسے کسی موقلم کے گوناگوں رنگ بکھرے تھے۔ ہر طرف حسین پھول سحر انگیزیاں لیے جھوم رہے تھے اور تالاب میں پانی کے سینے پر دمکتے، مسکراتے پھول۔

میرے قدم اُس سرزمین پر پڑے اور آنکھیں حیراں ہوگئیں۔ وہ پر سکون قصبہ جورنی (Giverny) جسے ایک عظیم فنکار کی آنکھوں نے چنا تھا اور اپنا لیا تھا وہ تھا کلاؤڈ مونے۔۔۔ میرا برسوں پرانا خواب پورا ہو گیا تھا اس مشہور فنکار کی بستی، اُس کا گھر اور مشہور باغ دیکھنے کا۔

ندی Seine کے کنارے، صوبہ نورمنڈی کے قریب یہ بستی مشہور مصور کلاؤڈ آسکر مونے (Cloude Oscar Monet) کی بستی کہی جاتی ہے جو پیرس سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ خوبصورت جگہ پہاڑوں کے درمیان ہے جو مونے کے باغ اور رہائش گاہ کی وجہ سے مشہور ہے۔ بہت پہلے اس کا نام Warnacum تھا۔ ان دنوں وہاں انگور کی کاشت کاری ہوا کرتی تھی۔ زیادہ کاشت کار اور کچھ متوسط طبقے کے لوگ رہا کرتے تھے۔ مونے جو بہترین Impressionist مصور تھا، ۱۴، نومبر ۱۸۴۰ء کو پیرس میں پیدا ہوا اور ۵۔ دسمبر ۱۹۲۶ء کو یہ دنیا چھوڑ گیا۔ اب یہ جورنی اپنے پسندیدہ قصبے میں دفن ہے۔ جذباتی ہونے کے ناتے کسی ناخوشگوار حالات کے تحت ۱۸۶۸ء میں اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی تھی۔ اسے Master of Impressionist کہا جاتا ہے۔ ۱۸۷۴ء میں سب سے پہلی Impressionist نمائش پیرس میں ہوئی تھی۔ اس نمائش میں وہ مصور تھے جنہیں ججوں نے مسترد کر دیا تھا۔ اس میں تیس فنکاروں نے حصہ لیا تھا جن میں Renoin, Pissaro, Birthe Morisot,Edgar Degas اور Alfred Sisley وغیرہ بھی شامل تھے۔ مونے کی تخلیق Impression Sunrise اس نمائش میں شامل تھی۔

۱۹۲۳ء میں اس کی بینائی تقریباً ختم ہوگئی تھی لیکن سرجری کے بعد بہتر ہوگئی تھی۔ مونے نے ایک دن ٹرین میں سفر کرتے ہوئے کھڑکی سے اس خوبصورت قصبے کو دیکھا جو اس کے وسیع اسٹوڈیو اور اس کے عجوبہ باغ کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں سال میں پانچ سو ہزار سیاح آتے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں جب مونے کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے مائیکل کو یہ گھر مل گیا۔ ۱۹۶۶ء میں اسے مائیکل نے آرٹ اکیڈمی بنا دیا۔ مونے کے خاص باغبان نے دوبارہ اس باغ کو پھر سے بنایا اور اپنی اصلی صورت میں لایا۔ کیونکہ دورانِ جنگ یہ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ تالاب دوبارہ زمین کی تہوں سے باہر نکالا گیا اور وہی پھول اُگائے گئے جو مونے کی موجودگی میں تھے۔ اس کے لیے امریکہ نے بھی خاص مدد کی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں یہ مکان اور باغ ٹورسٹ کے لیے کھولا گیا۔ فرانس کا سب سے پرانا آرٹ کارگاہ (Work Shop) جورنی میں ہے۔ یہاں مصوری کی تعلیم کے لیے پانچ سو طالب علم ہر سال آتے ہیں۔ براہِ راست قدرتی رنگوں سے مصوری کو جلا بخشتے ہیں۔ قدرت سے مکالمہ کرکے تخلیقی تصورات کو راستہ دیکھاتے ہیں۔ مشہور مصور جیسے پساور (Pissarro) میری کساٹ (Mary Cassat) وغیرہ بھی یہاں بیٹھ کر مصوری کرتے تھے۔ اپریل سے اکتوبر تک یہاں پھولوں کے گوناگوں رنگ شباب پر ہوتے ہیں۔ سردیوں میں جورنی بند ہو جاتا ہے سیاحی کے لیے۔

وہ دن بہت حسین تھا۔ تقریباً گیارہ بجے صبح ہم لوگ جورنی پہنچے۔ پیرس سے ڈرائیو کرتے ہوئے اور راستے میں قدرتی مناظر سے سرشار ہوتے ہوئے۔ خوش گوار موسم کی نرم دھوپ باغ کے پھولوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ پھولوں اور پتوں کی تہوں کی رنگین چادر اوڑھے مونے کا لق ودق مکان جو لمبا زیادہ تھا اور چوڑائی میں کم، اب بھی بہترین حالت میں موجود ہے۔ گلابی رنگ کا یہ مکان جس کے دریچے سبز ہیں اس وقت سیاحوں سے بھرا ہوا تھا۔ مکان کی دیواریں ہی جیسے پھولوں کی ہوں ایسا لگتا تھا۔ باغ کے دو حصے ہیں۔ پھولوں کا حصہ جو مکان کے سامنے ہے اور جاپانی واٹر گارڈن (Water Garden) جو دوسری طرف ہے جس میں جاپانی پُل ہے اور ہر طرف Weeping Willows پانی کی طرف سرنگوں ہیں۔ ان کے اور مختلف پھولوں کے پیکر عکس افگن ہیں۔ مونے کے لیے یہ باغ الہام پذیر تھا۔ پانی میں سبز رنگ کے پُل اور پھولوں کا عکس دیکھ کر یہ محسوس ہوا جیسے وہاں ایک الگ دنیا تحلیل ہو کر رواں ہے۔ اس باغ میں چار عدد چھوٹے بڑے پُل ہیں۔ کنول کے تالاب (Water Lilly) پر جاپانی برج ہے۔ دن کی بدلتی روشنی کے ساتھ پانی پر پھولوں اور پتوں کے عکس بدلتے رہتے ہیں۔ سورج اور پانی کا خوبصورت تماشہ کسی اور دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ مونے پَو پھٹنے سے قبل اُٹھ جاتا تھا اور سورج نکلنے پر پانی اور سورج کی ایک دوسرے سے چھیڑ خوانی دیکھنا بہت پسند کرتا تھا۔ یہ باغ کسی مصور کا Palette ہے جہاں زندہ رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ آنکھوں کو قدرتی حسن سکون بخشتے ہیں۔

جورنی ایک قصبہ نہیں بلکہ پھولوں کا عجائب خانہ ہے۔ پھولوں کے باغ میں درمیان میں ایک تنگ سا راستہ ہے جو مونے کی قیام گاہ کی طرف جاتا ہے۔ جس کے دونوں طرف حسین پھولوں کا سیلاب ہے۔ میں نے وہاں بیٹھ کر سب کچھ کاغذ پر اسکیچ کر لیا۔ مونے کا مکان، کنول کا تالاب (Lilly pond) جاپانی پُل۔ اس دل کی عجیب ہی کیفیت تھی کہ اتنے اہم اور تاریخی مقام پر میں بھی مصوری کر رہی ہوں جہاں عظیم فنکاروں نے بھی اپنا کینوس سجایا تھا۔

باقی صفحہ ۸۷ پر ملاحظہ کیجیے

''حرفِ ملامت''

خواب معطل ہیں

یونس شرر (نیویارک)

یہ گلیاں ، یہ کوچے، مکاں بیچتا ہوں زمیں بیچتا ہوں، زماں بیچتا ہوں
میں غیرت کے سارے نشاں بیچتا ہوں گھروں کے یہ کڑیل جواں بیچتا ہوں
ادیبوں، نجیبوں کا مقتل سجا ہے یہاں حرف و حکمت کہاں بیچتا ہوں
یہ عصمت و حرمت کا نیلام گھر ہے
یہ دنیا کبھی تھی نہ اب معتبر ہے

یہ آواز اب میری کوہِ ندا ہے جو کٹ کر گری وہ زباں بیچتا ہوں
جو انسانی تاریخ برگشتہ کر دے میں کچھ وہم ایسے گماں بیچتا ہوں
تمہارا گریباں بھی آؤ میں سی دوں میں زخموں بھری داستاں بیچتا ہوں
یہاں قومی قزاق،اب صف بہ صف ہیں
ہیں دستار اُونچی،قباؤں پہ کف ہے

خداوندا! کیسا یہ رزق ہوا ہے؟ ہتھیلی پہ اپنی میں جاں بیچتا ہوں
کثافت کے جن پر کہ چھینٹے پڑے ہیں قبا کی وہ میں دھجیاں بیچتا ہوں
اماموں کے خوں اور قصص انبیاء کے مفسر ہوں ان کا بیاں بیچتا ہوں
بیاں میں بصیرت نہ فکرو نظر ہے
حوالہ صحیفوں کا نا معتبر ہے

المناک و پُر پیچ، وحشی فضا ہے میں تاراجگی کا سماں بیچتا ہوں
یہ دنیا پہ شب خوں کی تیاریاں ہیں میں وحشت زدہ بستیاں بیچتا ہوں
شبِ غم ہے کوئی کہ ماتم کی شب ہے چراغوں سے اُٹھتا دھواں بیچتا ہوں
تم ایک ایک گندم کا خوشہ جلا دو
سڑکیں بھی بارود کی اب بچھا دو

میں وجدان کی آگ میں جل رہا ہوں میں احساسِ سود و زیاں بیچتا ہوں
میں ملحد نہ ملا نہ صوفی کا پیالہ میں حرفِ سکوں ہوں، اماں بیچتا ہوں
میں حرفِ ملامت ہوں ایسی زمیں پر جہاں معجزوں کی دکاں بیچتا ہوں
اسی میں بقا ہے کہ جبریل آئیں
وہ تفہیم آیات و سورت سجھائیں

گوادر کی سڑکوں پہ میلا لگا ہے میں ساحل، سمندر رواں بیچتا ہوں
کمندیں فصیلوں پہ ڈالی ہوئی ہیں میں ناقہ کبھی، سارباں بیچتا ہوں
ہوا بھی درختوں پہ اب رو رہی ہے کہ قرضوں میں جکڑی میں جاں بیچتا ہوں
دعائیں بھی مجھ سے پنہہ مانگتی ہیں
یہ آدم کو نسلوں سے پہچانتی ہیں

نہ ہوتے ہوئے بھی جو ہے

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

نہ ہوتے ہوئے بھی جو ہے
اس میں جینا عبث
اس میں جینے کے سامان کرنا عبث
جانتے بوجھتے اک سرائے میں
تعمیر کرنا
اپنے خون اور پسینے سے، اپنے مکاں
بستیاں، گاؤں اور شہر
تہذیب نو کے نشاں
رایگاں

جانتے بوجھتے
اس سرائے میں ہے
آدمی
اپنے ہم جنس پر، جبر سے، جنگ سے
حکم راں

جنگ۔ تخریب۔ تعمیر نو کے لئے
امن کے نام پر
صرف کمزور قوموں سے
ملکوں سے جنگ
اور قتل عام
نہ ہوتے ہوئے بھی جو ہے
اس میں جینا عبث
رایگاں!!

❍

''Beta Blocker?''

بشریٰ رحمٰن
(لاہور)

میرے مسیحا نے کہہ دیا ہے،
کہ اب ذرا دل کو سست کرلو!
بہت ہے تڑپا
بہت ہے دھڑکا۔۔۔
بہت بھگایا ہے تم نے اس کو۔۔۔
وفا کے رشتے۔۔۔
جفا کے موسم۔۔۔
سبھی تو ہیں جھیل رکھے اس نے۔۔۔
وہ شوق کی پل صراط پر، سانس روکے گزرنا اس کا۔۔۔
سنبھلنا اس کا۔۔۔
نہ گرنا اس کا۔۔۔
مچان پر تھا چڑھا کے رکھا؟
نہ کچھ بھی پیچھے بچا کے رکھا؟
جو باقی مہلت بچی ہے اس کی۔۔۔
''بیٹا بلاکر'' سے کٹ سکے گی
یہ چھوٹی چھوٹی سی گولیاں ہیں۔۔۔
مگر اسے حد میں رکھ سکیں گی!
Slow کرو دھڑکنوں کو اپنی۔۔۔
Slow۔۔۔۔
نہ اس گلی سے بھی گزرنا؟
جہاں دھڑکنے کا موڑ آئے؟
خدا بچائے۔۔۔
تمہارے دل کو!!

❍

''خیالات کا پرندہ''

یوگیندر بہل تشنہ (امریکہ)

جب
اُس کی منہ بولی بیٹی نے
احساس دلایا
یہ کہہ کر
''گاہے گاہے تنہائی میں،
اُس کی آنکھیں نم ہوجاتی ہیں''
اُس کے دل میں ٹیس سی اُٹھی یہ سن کر
اُس کی سمجھ میں آیا کہ
خیالوں کا پرندہ، ناگہاں
کیسے کیسے ہے درد جگا دیتا!
لیکن وہ اکثر
حوادثِ وقت کو ماضی کی کسی
عمیق خندق میں اُتار دیا کرتا تھا
اک دو چار نظمیں کہہ کر
اپنا جی ہلکا کر لیتا تھا۔
اور گھوڑے بیچ کے سوجنا معمول تھا اُس کا!!
فقط زمانے کو ہی نہیں،
خود کو بھی یوں جُل دیتا تھا
اُس کے اندر کے موسم کو
کوئی بھی دیکھ نہ پائے
وقت کے ساتھ مکھوٹے بدل لیتا تھا
پھر بھی تنہائی میں اکثر
اس کے لمحۂ موجود کو
گذشتہ کا کوئی بچھو
ڈنک مارنے سے باز نہ آتا تھا
اندر کے موسم کو
لہولہان کر دیتا تھا
اُس کی بیٹی سچ کہتی تھی
کاش!
خیالوں کا یہ پرندہ اُس کی
گرفت میں آسکتا۔۔۔!!!

سانحہ مانچسٹر کانسرٹ

یونس صابر (پشاور)

آج ہی نشر کیا بی بی سی نے کیسا منظر
کل تک تھا ہنستا بستا گریٹر مانچسٹر!
رنگ و رقص میں کھل کر جب حصّہ ڈالا
یہ ہلّہ گلہ، سکرین پہ خوب اُچھالا
چبھتا رہے گا اس کے رنج و درد کا نشتر!
اپنے خاص دفاعی حلیف کو جھاڑ پلا دی
امریکہ، جس نے کانسرٹ کی فلم چلا دی
بن سوچے کہ اب تک وہ سُپر ، اک پاور!
We Love You Greater Manchester!
اپنی اس دھرتی سے کرتے ہیں اعلان
ہم بھی تیرے ساتھ کھڑے ہیں انگلستان
آلِ آدم تو سب آپس میں ہیں بردار!!

○

زیرِ زمیں

شگفتہ نازلی (لاہور)

یہ گھر میرا ہے۔۔۔
میرے نام پر ہے۔۔۔
اگرچہ اس کے در دیوار جیسے۔۔۔
مکینوں کے لیے عہدِ وفا ہیں۔۔۔
مگر یہ باعثِ تسکیں کہاں ہے۔۔۔
کہ میرے نام کی لوح تو وہاں ہے۔۔۔
دریچہ کوئی نہ روزن جہاں ہے۔۔۔
ہے سب کچھ پھر بھی کچھ میرا نہیں ہے۔۔۔
کہ۔۔۔میرا۔۔۔گھر۔۔۔
کہیں۔۔۔زیرِ زمیں۔۔۔ہے۔۔۔!

درد کے رشتے

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

بنیاد رکھی سب رشتوں کی ۔۔۔ بانی ٹھہرے آدم و حوا
رشتے بھی خدا کی نعمت ہیں ۔۔۔ پوچھو ان سے جو ہوں تنہا
کنبے کا تصور جب بھی کیا ۔۔۔ صد شُکر سدا اُس رب کا کیا
جو درد کے رشتے جان گیا ۔۔۔ وہ فرض اپنا پہچان گیا

ابلیس ازل سے کوشاں ہے ۔۔۔ سب ہو جائیں تنہا تنہا
پہچان نہ سکا جو رشتوں کو ۔۔۔ خود اپنا ہی نقصان کیا
کنبے کا تصور مشرق میں ۔۔۔ مغرب سے ہے ارفع اور جدا
ماں باپ کا سایہ شفقت ہے ۔۔۔ گر سر پہ رہے تو شان ہے کیا

اک تاج تھا جیسے سر پہ میرے ۔۔۔ بے تاج ہوا جب باپ مرا
ممتا کی محبت رشتوں میں ۔۔۔ لاثانی ہے یہ سب نے کہا
اک بھائی اور جو بہنیں تھیں ۔۔۔ میں محور ان کے پیار کا تھا
پھر رشتہ جیون ساتھی کا ۔۔۔ کیا خوب ہے سب رشتوں سے جدا

بیٹے تو خدا کی نعمت ہیں ۔۔۔ گر فائق ہوں تو بات ہی کیا
بیٹی بھی اُس کی رحمت ہے ۔۔۔ ہر روپ میں اس کی شان جدا
بچوں کے بچے ایسے لگیں ۔۔۔ اک شجر کو جیسے ثمر ملا
کچھ اور بھی رشتے ایسے ہیں ۔۔۔ آباد رہیں گے دل میں سدا

جو رشتے پیار کے چھوٹ گئے ۔۔۔ پائیں گے انہیں ہو کر ہی فنا
گر حق پہ چلا پائیں گے انہیں ۔۔۔ یہ وعدہ ریاضؔ اس رب نے کیا

○

امیر خسرو کے نام

پرویز شہر یار (دہلی، بھارت)

خسرو تیری شان نرالی
خسرو تیری جا ہے عالی

تو نے بھکتی کی نئی راہ نکالی
سماع، محفل، دف، قوالی
نظام الدین اولیا کا درباری
بن تیرے در کے نہ جائے سوالی
درِ شیخ المشائخ پر
جو کوئی جھولی پھیلائے
تیرے وسیلے سے
کبھی نہ وہ جائے خالی
راگ راگنی سب تیرے باندی
موسیقی، رقص سب تیرے غلام
کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں
تیرے آگے، سب مانگے پانی
تو نے جینے کی نئی ڈھب نکالی

نجا مودین سے نیناں ملائی کے
قرار دل کا چھینا تو سے نیناں ملائی کے
گنگا جمنی تہذیب کا تو امین ہے خسرو
ہندو مسلم ایکتا کا تو نقیب ہے خسرو
اے طوطیِ ہند،
اے امیر خسرو!
زبانِ ہندوی کی تو نے بنیاد ہے ڈالی
ہم سب ہیں تیرے آج ابھاری
تیرے ہی دم سے زندہ ہے یہ
تیرے ہی دم سے تابندہ ہے یہ
آج اردو زبان ہماری
اتنی شیریں اتنی پیاری

خسرو تیری شان نرالی

شائبہ

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

تیز آندھی غضب کی آئی تھی
پیڑ پتّوں سے ہاتھ دھو بیٹھے
اور شاخیں ''جمود پیرا'' ہیں
کوئی سایہ نہ دستِ شفقت ہے
کوئی دُھن ہے نہ کوئی سُن گُن ہے
لب پہ ٹھہری ہوئی ہے سرگوشی
لفظ کیسے سکوت پیرا ہیں
بانسری بھی ''صدا شکستہ'' ہے
اور نغمہ ''گلو نہفتہ'' ہے
میرا جنگل اداس رہتا ہے
بے حسی سے اجاڑ موسم کی
میرا احساس تک کشیدہ ہے
جنسِ افسوس بھی پریدہ ہے
کوئی دم خم ساعتوں میں نہیں
جب ہوا کے ہر ایک جھونکے پر
دمِ آ ہو کا شائبہ سا ہے

○

دستک اُس دروازے پر

غالب عرفان
(کراچی)

اب سے تقریباً بیس سال قبل لکھی گئی یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ ایک ایسی دستک ہے جو صحیح طرح پر سنائی دے تو جواب کے لیے ذہنی گرہیں بھی کھلتی جاتی ہیں اور جواب بھی بن پڑتا ہے ورنہ خارجی شور وغل کی نذر ہو کر اس دستک کی صدا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جاتی ہے۔ وزیر آغا مرحوم کی یہ تخلیق اپنی پہلی ہی سطر سے ایک عام قاری تک کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے تو پھر تخلیقی ذہن کے حامل افراد کا پوچھنا ہی کیا! شعر و ادب سے وابستہ افراد کو یہ "دستک" اس شدت سے ساتھ متوجہ کرتی ہے کہ وہ مضطرب ہو کر بغیر رُکے پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ پڑھنے والے کو اس کتاب کی ہر سطر میں کسی سنسنی خیز جاسوسی ناول کا لطف حاصل ہوتا ہے وہ پڑھتا جاتا ہے تو اس کا اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ اضطراب بڑھتا جاتا ہے لیکن وہ مضطرب نہیں ہوتا بلکہ قدرے مطمئن ہوتا جاتا ہے۔ سطور اور بین السطور کے گہرے مطالعے کے بعد حتیٰ کہ کتاب کے اختتام کے بعد اُسے ایک طرح کی فرحت وطمانیت کا احساس ہوتا ہے تو ایک مسرت کی لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ جاتی ہے یہ مسرت پھر اُس کی تخلیقی اُپج کے ساتھ مس ہو کر کسی نہ کسی تخلیق کے تانے بانے سنوارتی ہے۔ اس کتاب میں وہ سب کچھ موجود ہے جو موجودہ تنقیدی نظریات کا پس منظر منعکس کرتا ہے بالخصوص ساختیات کے موضوع کو سیاق وسباق کے ساتھ سہل الفاظ میں پُرکشش مکالمات کی صورت میں ایک بھر پور تاثراتی ماحول کے ساتھ پیش کرنا بھی وزیر آغا مرحوم کے قلم کا کمالِ فن ہی ہے جو اپنی طرزِ نگارش میں بھی یکتا و منفرد ہے۔

تاریخ کا گہرا مطالعہ، مذہبیات پر علمی دسترس، اساطیر عالم پر تحقیقی نظر، شعور اور لاشعور کا باہمی رابطہ اور صرف یہی سب نہیں بلکہ اِن تمام موضوعات کو مربوط کرتے ہوئے انسانی دماغ کی ساخت کا کائنات سے ازلی وابدی رشتہ جس طرح اور جس حسنِ ترتیب سے اس کتاب میں سمویا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ذرا دیکھئے کہ درج ذیل عبارت میں تخلیقی عمل کی تعریف کو واضح کرتے ہوئے وہ کس خوبی کے ساتھ اپنے قاری کو اساطیر کی دنیا میں کس طرح پہنچاتے ہیں:

"ہر کوئی فنکار یا تخلیق کار نہیں ہوتا۔ بعض لوگ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتے ہیں اور اس کائناتی آہنگ کو بہ آسانی محسوس کر لیتے ہیں جو ہمہ وقت جاری وساری ہے چنانچہ جب کوئی حساس شخص اُس آہنگ کو چھوتا ہے یا آہنگ اُسے مَس کرتا ہے تو وہ نپے تلے قدموں سے چلنے کے بجائے معاً تھرکنا شروع کر دیتا ہے بالکل جس طرح ڈھول بجنے لگے تو بعض لوگوں کی ٹانگوں میں ڈھول کی آواز سرایت کر جاتی ہے اور وہ بھی چھوٹی چھوٹی ڈھولکیوں کی صورت تھرکنے لگتے ہیں۔ یہ تھرکنا انسان کے تخلیقی عمل کا نقطہ آغاز ہے۔ اگر یہ تھرکنا زیادہ تیز ہو جائے تو اس کی ایک "سمت" بھی وجود میں آ جاتی ہے۔ یہ سمت اندر کی طرف ہوتی ہے وہ قدم بہ قدم تھرکتا اپنے ہی اندر اترنے لگتا ہے بالکل جیسے بھنور کی زد میں آیا ہو تنکا تیزی سے گھومتا ہوا بھنور کی آنکھ میں اندر جاتا ہے اور یہ اندر ویسا ہی ہے جیسا کائنات کا اندر! سو وہ دم بدم صورتوں کو عبور کر کے اس مقام تک جا پہنچتا ہے جسے طبیعیات نے Disorder کہا ہے اور جو مجسم رقص ہے۔ ایک ایسا رقص جو رقص کے قوانین سے بھی بالا ہے صوفی تو "می رقصم" کا ورد کرتا ہے اس رقص کے اندر داخل ہو کر اپنی محدود یا Finite حیثیت کو لامحدود یا Infinite حیثیت میں منتقل کر لیتا ہے مگر فن کار اسے چھو کر اپنی قلبِ ماہیت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اس رقص کی بے نام اور بے صورت "صورت" کو چھوتے ہی خود فنکار کے اندر کے جملہ عصری اور نسلی عناصر بھی رقص کرنے لگتے ہیں اور رقص کرتے کرتے بے ہیئت ہو جاتے ہیں یعنی نراج یا Chaos میں ڈھل جاتے ہیں اس نراج سے تخلیق اُسی طرح وجود میں آتی ہے جیسے زماں نے مکاں کی پسلی سے جنم لیا تھا۔ ہندوؤں کی امرت منتھن والی اسطورہ میں اسے بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔"

یہ کتاب ویسے بھی ہمیں ایک نئی دنیا کی سیر کرواتی ہے۔ ایک ایسی دنیا جو ہم میں موجود ہونے کے باوجود ہم میں سے بیشتر کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے! قاری اور تخلیق کاری کے درمیان اٹوٹ رشتے کی وضاحت کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے اُن کے یہ الفاظ بھی بھرپور معنویت کے حامل ہیں اور خود اپنی تصریح آپ کرتے ہیں۔

"فرض کرو سورج نصف النہار پر ہے اور تم باہر دھوپ میں جا کر کھڑے ہو جاتے ہو تو تم دیکھو گے کہ تمہارا جسم کا سایہ غائب ہو گیا ہے جسم کے سائے کا غائب ہو جانا ایسے ہی ہے جیسے تخلیق سے اس کی علامتی معنی کا چھن جانا۔ اب فرض کرو کہ تم ایسے وقت میں باہر نکل جاتے ہو جب سورج تازہ تازہ طلوع ہوا ہے یا غروب ہونے کے قریب ہے تو تم دیکھو گے کہ تمہارے جسم کے ساتھ نہ صرف ایک سایہ نتھی ہو گیا ہے بلکہ ترچھی روشنی کی مناسبت سے لمبا بھی ہے۔ اسی طرح اگر تم متن کو عمودی زاویے سے دیکھو گے تو تمہیں اس کا علامتی معنی دکھائی نہ دے گا لیکن اگر ترچھے زاویے سے دیکھو گے تو متن کا علامتی روپ ابھرا ہوا نظر آئے گا۔ ایک اچھا قاری ہمیشہ ترچھے زاویے سے روشنی ڈالتا ہے اور یوں متن سے پھوٹنے والے سائے کا منظر دیکھتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ قرأت کا وظیفہ محض "ایک ترچھے زاویے" تک محدود ہونا چاہیے۔ ہرگز نہیں! ایک اچھا قاری کئی زاویوں سے، کئی سرچ لائٹوں کی مدد سے متن پر نظر ڈالتا ہے۔ چنانچہ وہ جتنے زاویوں سے متن پر روشنی ڈالتا ہے متن کے اندر سے اتنے ہی معانی برآمد ہو جاتے ہیں۔ بعینہٖ جیسے تمہارے جسم پر اگر روشنی ایک سے زیادہ سرچشموں سے پڑے تو ان روشنی کے سرچشموں کی تعداد کے مطابق ہی تمہارے جسم سے بھی سائے پھوٹ کر باہر آ جائیں گے گویا متن کثیر المعنیاتی ہو جائے گا مار کسی یا نفسیاتی ناقدین کا یہی

باقی صفحہ ۳۹ پر ملاحظہ کیجیے

''اُفق کے اُس پار''

مہناز عنبرین

(کراچی)

فیروز عالم صاحب کے تراجم شدہ افسانوں کا مجموعہ ''اُفق کے اُس پار'' پڑھنے کا موقع ملا اور کیا خوب ملا۔ پڑھنے کے بعد کچھ یوں لگا کہ جیسے عالمی ادب کے ان شاہکار افسانوں کا ترجمہ شاید میری ہی خاطر کیا گیا ہے اور میرا پختہ خیال ہے کہ ان افسانوں کے ہر قاری کو یہ تراجم پڑھنے کے بعد ایسا ہی احساس شدومد سے ہوگا۔

ادب سے دلچسپی کے باعث کچھ نہ کچھ پڑھنے کا سلسلہ عرصۂ دراز سے جاری ہے۔ کب سے؟ یہ یاد نہیں۔ بہرحال مطالعہ کرنے کی عادت ایک ایسی آتش ہے جو بجھائے سے نہیں بجھتی۔ لیکن ایک تشنگی ہمیشہ باقی رہتی تھی کہ عالمی ادب کے چنیدہ اور مشہور و معروف ادب پارے شاملِ مطالعہ ہوں۔ لیکن معدودے چند ایک کے یہ خواہش سیراب ہونے کی حد تک پوری نہ ہو سکی۔ لیکن بالآخر یہ خواہش کسی حد تک بلکہ کافی حد تک پوری ہونے کا موقع مل ہی گیا اور وجہ بنی جناب فیروز عالم صاحب کی عالمی ادبی شہ پاروں کے تراجم پر مبنی کتاب ''اُفق کے اُس پار''۔

میری رائے میں یہ کتاب اردو کے عام قاری کے لیے بیش بہا تحفہ ہے۔ اس کتاب میں موجود تمام افسانے جی ہاں تمام افسانے عالمی ادب کے مسلمہ شاہکار تسلیم کیے جاتے ہیں اور عالمی ادب میں ان کے بلند مقام کی مسلمہ حیثیت ہے۔

یہ کتاب فیروز عالم صاحب کی نہایت مخلصانہ ادبی کوشش ہے۔ آپ نے اعلیٰ ادب کے دریا کو کوزے میں بند کرنے کا مشکل اور دلچسپ ترین کام سرانجام دیا ہے۔ آپ کے تراجم کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ تراجم لگتے ہی نہیں یعنی ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ افسانے اس انداز میں ترجمہ کیے گئے ہیں کہ اُن پر اصل ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

آپ کا انتخاب بامعنی، بامقصد اور معیاری ہے۔ آپ نے بھاری بھرکم، تجریدی اور حقیقت سے دُور موضوعات کو اپنے انتخاب میں شامل نہ کر کے ہم جیسے قارئین پر گویا احسان کیا ہے۔ کیونکہ ان موضوعات پر مبنی افسانے پڑھ کر قاری اس کش مکش میں مبتلا رہتا ہے کہ آخر ان افسانوں میں کیا کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فیروز عالم صاحب آپ نے قاری کو اس کشمکش سے بچا لیا ہے۔

آپ نے خالص جنسی موضوعات اور صرف تلذذ کا غالب عنصر رکھنے والے افسانوں کو بھی دائرہ انتخاب میں شامل نہیں کیا۔ یہ اس کتاب کا بہت منفرد پہلو اور فیروز عالم صاحب کا نہایت بولڈ اسٹیپ تھا کیونکہ قارئین کی ایک بڑی تعداد کو اپنی کتاب کی طرف راغب کرنے کا یہ نہایت آسان اور پُرکشش طریقہ بلکہ حربہ ہے۔ تاہم نہایت لطیف رومانوی موضوعات کو اپنے انتخاب میں شامل کرنے کا قدم ضرور اٹھایا مثلاً ''گیندے کے پھول'' نامی افسانے میں مختصر لحاتی ملاقات میں ایک اجنبی سے لگاؤ پیدا ہو جانا، ناممکنات میں سے نہیں۔ لیکن عمومی طور پر ہم کو اردو افسانہ نگار میں اتنی جرأت نظر نہیں آتی کہ ایسے لطیف لیکن بے باک موضوع کو بیان کر سکے۔

آپ نے خالصتاً متضاد یعنی مغربی ماحول اور علاقوں کے تناظر میں لکھے گئے افسانوں کو اردو میں اس چابک دستی کے ساتھ قلمبند کیا ہے کہ افسانہ پڑھتے ہوئے قطعی اجنبیت یا غیریت کا احساس نہیں ہوتا جیسے آپ نے نہایت سبک روی سے ''ماریا'' نامی افسانے میں لکھا کہ ''روزا سانچیز نہایت پُرکشش انداز سے مسکرائی جس میں ہوآن کے لیے آمادگی چھپی ہوئی تھی۔'' یہاں الفاظ کا چناؤ اس خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے کہ عام اردو قاری کھو سا جاتا ہے۔ آپ نے شعوری یا لاشعوری طور پر نہایت بامقصد افسانوں کا چناؤ کیا جو زندگی کی الجھنیں اور پھر سُلجھنیں بھی دکھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''ہچکیاں'' نامی افسانے میں مسز ہملین بالآخر فانی زندگی کی حقیقت جان کر اپنے شوہر کو اس کی محبوبہ سے شادی کی اجازت دے دیتی ہے۔ یا جیسے ''اوورکوٹ'' نامی افسانے میں مسز بشپ کو احساس ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے رفیقِ زندگی کے ساتھ اغماض برت کر کچھ اچھا نہیں کر رہی اور نتیجتاً وہ بہتر تعلقات بنانے کا سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

آپ کے منتخب کردہ افسانے زندگی کے تلخ حقائق کو نہایت بے رحمی لیکن فطری انداز میں عیاں کرتے ہیں۔ جیسے ''پھانسی'' نامی افسانے میں پھانسی دینے جیسے سخت قدم کے بعد پولیس اہلکاروں کو جس طرح بتدریج نارمل ہوتے ہوئے جس عمدگی سے دکھایا بلکہ بیان کیا گیا ہے، وہ نہایت اثرانگیز ہے۔

آپ نے ''سیاہ عقاب کی گمشدگی'' جیسے اچھوتے اور ''سرخ لباس'' جیسے لطیف موضوعات منتخب کر کے قاری کے سامنے پیش کیے جسے سراہے بنا نہیں رہا جا سکتا۔

آخر میں آپ کی منظر نگاری کی بھرپور صلاحیت کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ بحیثیت قاری میں ببانگِ دہل کہنا چاہوں گی کہ منظر نگاری پر جتنی گرفت آپ رکھتے ہیں وہ کم کم لکھاریوں کے نصیب میں آتی ہے۔ کاش منظر نگاری کے لیے آپ کو سو میں سے دو سو نمبر دیے جا سکتے۔ میں خود کو آپ کے ترجمہ شدہ تمام افسانوں کے مختلف مناظر کا حصہ بنا دیکھتی تھی۔

بہرحال میں کہنا چاہوں گی کہ ''اُفق کے اُس پار'' اردو کے ان قارئین کے لیے انمول تحفہ ہے کہ جن کی براہِ راست پہنچ عالمی ادب تک نہ تھی۔

☆

ذوالفقار عادِل کی اُردُو غزل

ازور شیرازی
(لاہور)

اکیسویں صدی کا اُردُو شعری ماحول اگرچہ اِظہار کی متعدد جہتوں سے مملو ہے لیکن ابھی تک شعری روایت کے پالن کے لیے غزل سے درخورِ اِعتنا نہیں برت سکا؛ جس کی وجہ اِس صنفِ سخن کا ثقافتی خدوخال اور مشرقی شعری مزاج سے مضبوط اِنسلاک ہے۔ سابقہ تین چار صدیوں سے غزل شناخت کے جن مراحل سے گزری ہے اُس نے اِسے مقبول ترین شعری صنف منوانے کے ساتھ اِس کے ادبی معیارات کو بھی سنگلاخ بنا دیا ہے۔ تاہم اِس میدان کے تخلیق کاروں کی بھیڑ میں جونہی کوئی منفرد اور توانا آواز سنائی دیتی ہے تو وہ جلد ہی سنجیدہ قارئین اور ناقدین کے دل کو لُبھا لیتی ہے؛ انہی مختصر اسماء میں سے ایک اہم نام ذوالفقار عادل کا ہے؛ جس کی ابتدائی پہچان بیسویں صدی کی نویں دہائی سے متعدد ادبی رسائل میں متواتر کلام کی اشاعت سے بننا شروع ہوئی۔ بعد ازاں جسے منضبط تشخص جولائی ۲۰۱۶ء میں منظرِ عام پر آنے والے اُن کے اولین شعری مجموعے " شرق میرے شمال میں" سے حاصل ہوا۔

ذوالفقار عادل کی غزل کا موضوعاتی وجود رواں صدی کے ساجی رویوں ،نفسیاتی عوامل، وجودی محرکات، طبیعاتی وحیاتیاتی مسائل اور بے یقینی و لایعنیت کے خمیر سے گندھا ہوا ہے۔ تبھی وہ اِنسانی روابط کو مضبوط بنانے کے بجائے اپنے داخلی منظرنامے کو بے جان اشیاء سے مربوط کر کے اپنی تنہائی کا ازالہ تلاش کرتا ہے۔ چابی، الماری، میز، دفتر، بینچ، گھر اور کمرا جیسے کلیدی الفاظ اُس کے شخصی اور تخلیقی رویوں سے ہم آہنگ ہو کر جاندار شعری مضمون کو جنم دیتے ہیں جو موجودہ انسان کی عدم برداشت ،نفسیاتی الجھاؤ اور مبہم افعال کا مشاہداتی محاکمہ پیش کرتا ہے:

دیر سے قفل پڑا دروازہ اِک دیوار ہی لگتا تھا
اُس پر ایک کھلے دروازے کی تصویر لگا لی ہے
اپنے آپ کو گالی دے کر گھور رہا ہوں تالے کو
الماری میں بھول گیا ہوں پھر چابی الماری کی
ہر منظر کو مجمع میں سے یوں اُٹھ اُٹھ کر دیکھتے ہیں
ہو سکتا ہے شہرت پالیں ہم اپنی دلچسپی سے
سوچا یہ تھا وقت ملا تو ٹوٹی چیزیں جوڑیں گے
اب کونے میں ڈھیر لگا ہے باقی کمرا خالی ہے
بیٹھے بیٹھے پھینک دیا ہے آتش دان میں کیا کیا کچھ
موسم اتنا سرد نہیں تھا جتنی آگ جلالی ہے

اُس کی غزل کا دھیما لب ولہجہ نشاط وغم کی معتدل کسک کا زائیدہ ہے ؛اِسی وجہ سے ذوالفقار عادل کے اشعار غیرمحسوس طریقے سے قاری پر اپنے اثرات مرتسم کرتے ہیں؛ جن سے رفتہ رفتہ اُنسیت شعر کی تہہ داری اور معاصر قدروقیمت کی گرہیں کھلتی جاتی ہے۔ کیونکہ اُس کے موضوعی ڈھانچے میں دقیق علمی موضوعات کا دخول نہیں بلکہ ذاتی تجربات و مشاہدات کا رس موجود ہے۔ ایسے تمام اشعار روایت کے شعور وانجذاب کے باوجود بین المتونیت کے چھان سے کم ہی متحد الخیال معلوم ہوتے ہیں۔ موضوع کا اِنفرادی اور دلکش بیان ہی اُسے جدید غزل کی صف میں سربرآوردگی عطا کرتا ہے۔ نیز وہ روائتی موضوع کو بھی ایسے عمدگی کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالتا ہے کہ اُس کی شمولیت غزل کے باقی اشعار سے ذرا بھی کم صورت معلوم نہیں ہوتی اور نہ ہی اُس میں سپاٹ پن نظر آتا ہے:

میں آسماں کی طرف دیکھ کر ہنسوں تو یہ لوگ
یہ پوچھتے ہیں کہ اے بھائی کیا دکھائی دیا ؟
صاحب تمہیں خبر ہی کہاں تھی کہ ہم بھی ہیں
ویسے تو اب بھی ہیں کوئی مر بھی نہیں گئے
ہجرتیں سب پہ فرض تھیں لیکن
سب سے پہلے مجھے خیال آیا
اک ذرا روشنی میں لاؤ اِسے
دیکھتے ہیں دیا بجھا کیوں ہے
بند کمروں کی خبر لو کہ بہت ممکن ہے
آنے والے ہمیں مہمان سمجھنے لگ جائیں

عہدِ حاضر کے مادی دھندلکوں نے اُس کے باطنی کینوس سے اولین تشخص کے نقوش مخدوش کر دیے ہیں؛ جن کی تلاش میں وہ ماحول سے بے اِعتنائی برت کر بچپن بالخصوص ازل کی طرف مراجعت کرنے کی سعی کرتا ہے۔ جہاں اُس کے شعری متن میں بچنے کی خواہشاتی تصاویر اُبھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں وہیں عرفانِ ذات کا کم زور تسلسل بھی پختگی سے آراستہ ہوتا ہوا دِکھتا ہے۔ وہ اپنے انجام سے آشنا ہونے کے باوجود ابتدا کی کھوج کو مقصدِ حیات گردانتا ہے لیکن اِس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ وہ ناسٹلجیا کا شکار ہے؛ وہ لمحہءِ موجود کو شاعری کی غذا بنانے کے ساتھ اِس سے ہم رشتگی کے لیے ماضی سے صرف اِستفادہ چاہتا ہے:

واپس پلٹ رہے ہیں ازل کی تلاش میں
منسوخ آپ اپنا لکھا کر رہے ہیں ہم
یہ جو بھی لوگ ہیں اِن کشتیوں میں
ہمیں دریافت ہونے کی خوشی ہے
اپنے آغاز کی تلاش میں ہوں

اپنے انجام کا پتہ ہے مجھے
اپنے دل میں کینہ چھپا کر اِن میں شامل ہو جاتا ہوں
دیکھتے دیکھتے سارے بچے میرے اندر آجاتے ہیں
گھٹتے بڑھتے سائے سے عادل لطف اُٹھایا سارا دن
آنگن کی دیوار پہ بیٹھے ہم نے خوب سواری کی

تخلیق کار سماج کا فرد ہونے کے ناطے اپنی حساس طبیعت کے مرہونِ منّت سماجی خلفشار کو بھی اپنے ادبی اظہاریے کا ماخذ سمجھتا ہے؛ لیکن عصری کوائف نامے کا براہِ راست بیان اپنی فنی کم مائیگی کا اعتراف یا ادبی قرینوں کو راندہء درگاہ سمجھنے کے مترادف ہے۔ذوالفقار عادل کی غزل میں اپنے گردوپیش کی ریشہ دوانیاں تخلیقی عمل سے منسلک ہونے کے بعد ادبی رموز وآلائم سے متمسک ہوکر غیر ترقی پسندانہ طرزِ اظہار میں ڈھلتی ہیں۔سماجی سطوح کے متعلق اُس کا تجزیاتی بیانیہ خارجی واقعات کو داخلی محسوسات سے وہ حرارت بخشتا ہے جو شعری پیرہن کے خالص احساساتی سنگھار کا فریضہ سرانجام دینے کے ساتھ حسن عسکری کے تصورِ فسادات پر بھی صادق اُترتا ہے:

اِسے یہ گھر سمجھنے لگ گئے ہیں رفتہ رفتہ
پرندوں سے قفس آزاد کروانا پڑے گا
اوپر سب کچھ جل جائے گا کون مدد کو آئے گا
جس منزل پر آگ لگی ہے سب سے نیچے والی ہے
ایسے روٹی،سالن سے تو چولہا ٹھنڈا اچھا ہے
اُس بالن کا کیا کرنا جو گھر کو آگ لگائے نی
شاخوں کا نام دے کے تماشا بنا دیا
جیسے کسی درخت پہ اُگتے ہوئے درخت

ذوالفقار عادل کا تخیلی ظرف شاعری کے ساتھ داستان،افسانہ اور ڈراما کی عملی پیش کش سے بھی مہمیز حاصل کرتا ہے۔یہ عناصر اُس کی ادبی زندگی کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی اولین ترجیحات کے حامل ہیں؛اِنہی وجوہات کے کارن اُس کی غزل میں افسانہ طرازی،داستانوی ماحول اور تھیٹر کی منظر کشی ظاہری مفاہیم کے ساتھ عصری رویوں میں مضمر جہات کی عقدہ کشائی کرتی ہے:

سبھی اپنی کہانی کہہ رہے ہیں
الاؤ جل رہا ہے خامشی سے
یہ آدمی مری نظروں میں پست کیسے ہوا
کسے بتاؤں کہ میں سگ پرست کیسے ہوا
ایک کردار کی اُمید میں بیٹھے ہیں یہ لوگ
جو کہانی میں ہنسانے کے لیے آتا ہے
ناٹک کے کرداروں میں کچھ سچے ہیں کچھ جھوٹے ہیں
پردے کے پیچھے کوئی اِن کو سمجھاتا رہتا ہے
ہر کردار کے پیچھے پیچھے چل دیتا ہے قصہ گو
یونہی بیٹھے بیٹھے اپنا کام بڑھاتا رہتا ہے

اُس کی غزل کا ایک اور اِنفرادی وصف تشکیکی اور اِستفہامی فضا کی تشکیل ہے۔عموماً اِس تشکیکی اور اِستفہامی ماحول میں خود کلامی بھی در آتی ہے لیکن ذوالفقار عادل کا یہ دعویٰ ہے کہ خود کلامی کا عمل کیسے ممکن ہو؟جب ہم اپنی ذات سے ہم کلام ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو جاودانی قوت اپنے لامحدود اِختیارات کے باعث سُن لیتی ہے؛جس سے حقیقتِ انسان کی کھوج کا اِبتدائیہ شروع ہوتا ہے۔عادل شعری پیرائے میں اُٹھائے گئے سوالات کا جواب ازخود دیتا ہے؛اِس سے جہاں اُس کی تخلیقی اور مشاہداتی قوت معلوم ہوتی ہے وہیں شعر "مرابعہ" کے قالب میں بھی ڈھل جاتا ہے:

یہ کس نے ہاتھ پیشانی پہ رکھا
ہماری نیند پوری ہوگئی ہے
خود سے جو بات بھی کرتے ہیں خدا سنتا ہے
خود کلامی کہاں ممکن ہے کلیمی کہیے
اِک ایسے شہر میں ہیں جہاں کچھ نہیں بچا
لیکن اِک شہر میں کیا کر رہے ہیں ہم
اپنی نہ کہوں تو کیا کہوں میں
ہر بات کی ابتدا میں ہوں میں

اَسالیبی حوالے سے ذوالفقار عادل کی غزل نوکلاسیکی بانکپن کی وارث ہے؛جو تین طرح کے تحریری خدوخال سے اُسلوبی پرداخت کا سفر مکمل کرکے ایک شناختی طرزِ نگارش میں ڈھلتی ہے۔اِبتدا میں یہ شعری تحریر نثر کے ترتیبی وصف سے مطابقت پیدا کرکے موزونیت کے دھارے میں بہتی ہے۔دوسری سطح پر یہ اُسلوب قدم کلاسیکی تراکیب کے بناؤسنگھار سے شروع ہوکر اُن کی عصری معنویت میں منقلب ہو جاتا ہے۔بعد ازاں ذوالفقار عادل کا تیسرا اِنفرادی اور فی الوقت کا مستقل اُسلوبی رویہ سامنے آتا ہے؛جس کی شناخت امرِ واقعہ کے مطابق مصرعے کی بُنت اور وقفے کی علامت سے ٹھہراؤ پیدا کرنا ہے تاکہ قاری شعر کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ توقف کے عمل سے شعری لطافت اور موضوعاتی وسعت سمجھنے کا اہل ہو جائے۔مزید برآں اُس کا اندازِ تحریر زبان کے قدیم ذائقوں سے لفظی تاثیر مستعار لینے کے علاوہ اِس کے ارتقائی سفر سے بھی اِستفادہ کرتا ہے:

وہیل چیئر پہ بیٹھ کے چڑھتا ہے کون سیڑھیاں
آکے مجھے ملے جسے شک ہو مرے کمال میں
باغ اپنی طرف کھینچتا تھا مجھے خواب اپنی طرف
بینچ پر سو رہا ہوں میں دونوں کا جھگڑا چکاتا ہوا
جتنی تنہائی ہے عادل،اتنی ہی گہرائی ہے
بس کہ سطحِ زندگی پر تیرتا رہتا ہوں میں

ذوالفقار عادل کی اِستعاری عمارت کشتی، دل، دریا، باغ اور دیوار پر کھڑی ہے۔اُس نے اِن استعاروں کو ادبی تدبر سے کلاسیکی مطالب سے الگ معنی فراہم کیے ہیں۔جن کا خاصا یہ ہے کہ اِن استعاروں کے برتاؤ میں یکسر اشترا کی دہراؤ نہیں پایا جاتا۔کشتی کا استعارہ جسے وسیلہ،نجات،آرام گاہ اور مضبوط سہارے کے طور پر عموماً استعمال کیا جاتا ہے۔اِس کی غزل میں ایک غیر محفوظ پناہ گاہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔دراصل یہ استعارہ ہر انسان کے احساسِ ذمہ داری کو جلا بخشنے کے لیے وضع کیا گیا ہے کہ وہ صرف مسیحا کی آس لگائے نہ بیٹھا رہے بلکہ اپنی تفویض کردہ ذمہ داریوں سے احسن انداز میں عہدہ برآ ہو سکے۔مزید برآں اِسے سیاسی وڈیروں اور غیر مفید پیر بابوں کی عمومی صورتِ حال پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے۔یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ وہ کشتی کو بادی النظر میں ہی غیر مستحکم وسیلہ نہیں سمجھتا بلکہ آزمائش کے بعد کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے اگرچہ اِس معاملے میں وہ نتائج سے قبل بھی عدم استحکام کی فکر ضرور کرتا ہے:

کشتی کو کشتی کہہ دینا ممکن تھا آسان نہ تھا
دریاؤں کی خاک اڑائی ملاحوں سے یاری کی
کشتی تو بن گئی مگر
کشتی سے کچھ بنا نہیں
کس کشتی کی عمر ہے کتنی ملاحوں سے پوچھنے دو
تم سے بھی پوچھیں گے اِک دن دریاؤ چپ ہو جاؤ
ہونٹ ٹکرا رہے ہیں کشتی سے
کون پانی پلا رہا ہے مجھے

"دیوار" کے استعارے کو زیادہ تر رکاوٹ اور بے حسی کے تناظر میں برتا گیا ہے۔ذوالفقار عادل کی شعری دنیا میں دیوار ذی روح ہے جو باہمی رابطے کے فقدان کی وجہ سے اِنسان سے خائف رہتی ہے اور انسان اِس سے روایتی شناخت کے باعث دور ہے جبکہ دیوار گفتگو کرنے کے ساتھ اعلیٰ ظرف رکھنے والا نفس ہے۔تبھی یہ اپنی زبان پر تعلقات کی بحالی قائم رکھنے کی غرض سے حرفِ شکایت تک نہیں لاتی:

چیونٹیاں رینگ رہی ہیں کہیں اندر عادل
ہم ہیں دیوار کے مانند بظاہر خاموش
اِک عمر اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہے
اِک دوسرے کے خوف سے دیوار اور میں
گفت گو سے نکل آتے ہیں ہزاروں رستے
ذرا دیوار کی سنیے ذرا اپنی کہیے
جانے کیا باتیں کرتی ہیں دن بھر آپس میں دیواریں
دروازے پر قفل لگا کر ہم تو دفتر آ جاتے ہیں

"دل" کے استعارے کو ہمیشہ رنج وآلام کا مرکز، ٹوٹا ہوا یا مکمل طور پر تصوف کے نقطۂ نظر سے آئینہ قرار دیا گیا ہے جبکہ عادل کی غزل میں دل کئی مفاہیم کی وسعت پذیری کے لیے نمو کا کام سرانجام دیتا ہے۔یہاں دل مصائب کی آماجگاہ نہیں کیونکہ اس میں تیر پیوست ہونے کے بعد بھی ترازو یعنی برابری کی شکل اختیار نہیں کرتا؛جس کی وجہ دل کی ظاہری موجودگی کا غیر مناسب ٹھہراؤ ہے۔جب کبھی دل بانجھ پن کا شکار ہو جاتا ہے تو ہم اِسے اپنی ظاہری نمود و نمائش سے زندہ و توانا رکھنے کی منافقانہ سعی کرتے ہیں۔کبھی یہ محرومیوں،حسرتوں سے عبارت ہے جسے محبت کی موجودگی متحرک کر دیتی ہے۔اُس کے نزدیک آئینے کی طرح صفا قلب خودشناسی اور خداشناسی کا ذریعہ نہیں بلکہ دکھوں اور غموں کی چوٹوں سے لبریز دل معرفتِ خداوندی کے دریچے وا کرتا ہے؛جن کے حصول میں سماجی عوامل کا عمل دخل شامل ہے نہ کہ فرار کا؛نیز اِسی معتدل فضا کے باعث دل اطمینان کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے:

اب تک کوئی بھی تیر ترازو نہیں ہوا
تبدیل اپنے دل کی جگہ کر رہے ہیں ہم
روز نکل جاتے ہیں خالی گھر سے خالی دل کو لے کر
اور اپنی خالی تربت پر پھول سجا کر آ جاتے ہیں
ہر حسرت پر ایک گرہ سی پڑ جاتی ہے سینے میں
رفتہ رفتہ سب نے مل کر دل سی شکل بنا لی ہے
یہ ایک داغ ہے دل پر کہ ایک روزن ہے
اِسی سے خواب اِسی سے خدا دکھائی دیا
دل میں رہتا ہے کوئی دل ہی کی خاطر خاموش
جیسے تصویر میں بیٹھا ہو مصور خاموش

دل کے ساتھ ہی منسلک ہو کر شناخت پانے والا ایک استعارہ "دریا" بھی ہے؛جس کا ظاہری سکوت اقرار نامے کی سند ہے اور اِس سے نسبت رکھنے والوں کی آنکھیں صحرا میں بھی خشک نہیں ہوتیں۔اُس کے نزدیک دریا سے پہلے دل سے محبت کی کہانی کا آغاز ہوا تھا کیونکہ دریا تو دل سے کہیں بعد میں جا کر دریافت ہوئے ہیں۔دل و دریا کے تقابلی انداز میں وہ دریا کو غیر مستقل جبکہ دل کو مستقل مزاج گردانتا ہے۔جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے ہاں دریا کا استعارہ کبھی ظاہری دریا کبھی محبوب کبھی اِس سے کرداری مناسبت رکھنے والے افراد کی خاطر استعمال ہوا ہے:

دریا تو اپنی موج میں جانے کہاں گیا
دل میں جو پھول ہے وہ کناروں پہ عام تھا
دریا تو کہیں بعد میں دریافت ہوئے ہیں
آغاز ہوئی دل سے روانی کی کہانی
صحرا میں بھی آنکھیں خشک نہیں ہوتیں
دریاؤں سے نسبت زندہ رکھتی ہے۔

باقی صفحہ ۹۷ پر ملاحظہ کیجیے

انگریزی الفاظ اردو میں

(مشاہدہ اور مطالعہ)

حسن منظر
(کراچی)

کولکتا (کلکتہ) جس زمانے میں برطانوی سامراج کا مرکز تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور سے لے کر ۱۹۱۲ء تک، انگریزی الفاظ ہندوستان کی سب ہی زبانوں میں آہستہ آہستہ سماتے جارہے تھے اور ہر زبان میں ان کا اپنا علیحدہ ہی روپ ہوتا تھا۔ مگر اردو میں جو لفظ کلکتہ سے ایجنٹ بن کر نکلتا تھا دلّی یا لاہور پہنچتے پہنچتے ''ایجنٹ'' بن جاتا تھا اور ایڈجوٹینٹ ''اجٹین'' پھر جب بینک قائم ہوئے تو وہ ''بنک'' کہلائے (ایران میں ''بانک''!)۔

وجہ الفاظ کے اس تغیر کی وہ مقامی لوگ انگریزی میں بات کرنے والوں سے قرب کا نہ ہونا تھا اور جو قربت تھی وہ فورٹ کولج جیسے تعلیمی اداروں میں وہاں کے اردو اساتذہ کی جن میں بیشتر ترجمے کے کام پر مامور تھے، اپنے سفید آجروں سے ان کے دیسی خدمت گاروں کے سبیل تھی۔ یہ خدمت گار (''کمیٹگار'' صاحب اور میم صاحب کی زبان میں) دن رات ان کے نزدیک بھی ہوتے تھے اور منہ چڑھے۔ کچھ اسی طرح یہ رابطہ میرٹھ، دلّی، لاہور وغیرہ میں ہوگا۔

جنہیں ہماشما کہا جاتا ہے دنیا بھر میں ان کا اپنا ہی طریقہ دوسروں کی زبان کیا، خود اپنی زبان کو برتنے کا ہے۔ وہ جہاں کنہیا کو ''کندھیّا'' اور کنیا کو ''کنمیا'' بنا سکتا ہے وہاں جسمیں کو ''جے مس'' اور زوئل کو ''دائیل'' بھی پورے اعتماد سے کہتا ہے۔

یوں الفاظ اور زبان کی ادائیگی کا فرق علاقائی خصوصیت بھی ہوتی ہے۔ باہر کے الفاظ کسی زبان میں داخل ہو کر آسانی اس کے صوتی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ کہیں الف والے حروف ''اَوْ'' کی آواز پیدا کرتے ہیں۔ عبدالرحمٰن ''اَوبڈ ررَوحمون'' اور گنبد رناتھ، ''گونیندرنوتھ'' بن جاتا ہے کہیں ''اَوْ'' کی صوت کو اٹھا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے جو فارسی کے ساتھ ایران چھوڑ کر ہندوستان آنے پر بیتی: الف حقیقت میں ''الف'' بن گیا جو صوتی اعتبار سے گورتھا اسے اردو نے ہجے سے وفاداری میں ''کار'' کر دیا۔

ذرا دور جائیں تو اُوسٹریلیا، نیوزی لینڈ میں خود اُوسٹریلیا ''اُوسٹرائی لیا'' سنائی دیتا ہے، ۸ کا ہندسہ Eight، ''Ite'' اور انفلے میشن ''انفلائی میشن'' (سوزش، ورم) جزائرغرب الہند، امریکہ کینیڈا بولتے انگریزی ہیں لیکن اپنی انگریزی! ہوسکتا ہے یہ آب وہوا، مختلف مٹی اور ان جگہوں کی پچھلی بولنے کی زبان کی ملاوٹ کی دین ہو۔

اب یہ حضرات جنہیں فورٹ ولیم کولج میں مترجم کا درجہ دیا گیا تھا جتنی انگریزی جانتے تھے پڑھنے کی حد تک تھی۔ انگریزی میں بات چیت ان کی زندگی کا حصہ نہ تھی۔ نہ اُن دنوں کسی نئی زبان کے سننے سمجھنے اور بولنے کا کام ریڈیو، سینما اور ٹیلی ویژن انجام دے رہے تھے۔

میرے ذہن میں فورٹ ولیم کولج کا وہ بڑا کمرہ یا تالار ہے جس میں جانچ پڑتال کے بعد یہ حضرات ہفتے میں پانچ یا چھ دن صبح پہنچا دیے جاتے تھے اور ان کے حوالے وہ کتاب یا کتابچے کر دیے جاتے جن کا انگریزی سے اردو ترجمہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کی ضرورت تھی۔۔۔اور ہندوستانی عوام کو نئی تعلیم سے آگاہ کرنا بھی۔

یہ حضرات دوسرے عالموں کے ساتھ مل کر اردو سے انگریزی، انگریزی سے اردو ڈکشنریاں بھی ترتیب دے رہے تھے اور آسان اردو میں الف لیلوی انداز کے رومانس تصنیف کرنے کا کام بھی کر رہے تھے جنہیں برطانوی سول سروس (اور ان سے پہلے کمپنی بہادر کے) حکام پڑھ سکیں، سمجھ سکیں کیوں کہ آنے والے زمانے میں انہیں ہی اس کولونی (نوآبادی) پر حکومت کرنی تھی جو اگر چشم پوشی سے کام نہ لیا جائے تو پہلے سے آباد تھی۔ یہ ان کی ٹیکسٹ بکس تھیں۔

وہاں بیٹھنے کا انتظام کیا تھا؟ لگتا یہی ہے قالین یا دریاں، ٹیک لگانے کے لیے گول تکیے اور نیم جی ٹائپ ڈھلواں فرشی میزیں جو ڈیسک ہی کہلاتی ہوں گی۔ عادت نہ ہونے کی وجہ سے میز کرسی نہ یہ لیتے ہوں گے نہ دی جاتی ہوں گی۔ پتہ نہیں اگالدان کا انتظام بھی اس تالار میں ہوتا تھا یا نہیں۔ ممکن ہے صاحب کے سامنے پان کھانے کی اجازت ہی نہ ہو۔ کچھ تمباکو کے فراق میں اونگھتے بھی ہوں گے۔

وہاں سب ڈیسکوں پر جھکے یا ایک گھٹنا موڑے اس پر تختے پر کاغذ جمائے لکھنے میں مصروف ہوتے ہوں گے۔ کبھی کبھی ایک دوسرے سے مشورے کی ضرورت بھی پڑ جاتی ہوگی کہ حضرت اس لفظ Furlough ''فرلوغ'' کا تلفظ اردو میں کیسے لکھا جائے گا؟ ''فرنچ'' صحیح رہے گا یا نہیں؟ لفظ ''فیٹن'' ہے یا ''فٹن''؟

وہاں اُن کے مددگار جن سے وہ کھُل کر بات کر سکتے ہوں گے انگریزوں کے خدّام تھے جو بتاتے ہوں گے۔ یہ لفظ ''کان سَرٹ'' ہے (Concert) ہم خود میم صاحب کے منہ سے سنا ہے اور صاحب اس وقت ''پاٹ'' (Pot) پر بیٹھا ہے۔ یعنی رفع حاجت کر رہا ہے۔ گنگا اور جمنا کا پاٹ کتنا ہے اس سے ہر خدمت گار پہلے ہی سے واقف ہوتا تھا۔ اس طرح ''کانفیڈینشل''، ''واٹ''، ''کانگر یجولیٹ''، ''اسٹاپ'' وجود میں آئے اور باوجود گورے آجر سے فورٹ ولیم کولج سننے کے اس کا معیار کالج سے بلند نہ ہو سکا۔ ''کون سی

کانفرینس؟'' کہنے اور لکھنے کی نوبت بعد میں آئی۔ تعجب ہے یوم، کونین، مَوج در موج، حوض اور گھر میں بیوی کی اے ئو ج کی صوتی ادائیگی سے واقف ہونے کے باوجود ان عالم حضرات نے اور ان سے بعد والوں نے کیا اَوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے، کو بھی کان نہ دیئے، خط میں ادائیگی کے لیے اپنی زبان کے روزمرہ کو بھی بھول گئے اور راہنمائی قبول کی تو کس سے جو صاحب کے Litter John کو ''جان'' کہتا تھا اور Volley Ball کو ''والی بال''۔

ایک موقع پر امریکی سفارت خانے کی کار کا ڈرائیور میرے ساتھی امریکی ڈوکٹر کے پوچھنے پر کہ یہ کون سی سڑک ہے؟ بولا ''لارنس روڈ'' وہ جس کی زبان کا یہ لفظ تھا اسے سمجھ نہیں سکا اور مجھے بتانا پڑا ''لورینس روڈ''۔

پچھلے ڈیڑھ دوسو سال میں اردو نوشت، جیسا کہ ہونا چاہیے تھا ترقی پذیر رہی ہے جو پہلے یہہ اور بھہ لکھا جاتا تھا اب یہ بن گیا ہے۔ گولی (چھوٹی) ۃ نے ضرورت کے مطابق کئی شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ مثلاً ہہ، ھ، ہ۔ چھوٹی اور بڑی ے کا فرق بھی آہستہ آہستہ رونما ہو گیا ہے ورنہ خود مرزا غالب ایک جگہ لکھتے ہیں:

تمہاری خط کی دیکھنی سے آنکھین روشن ہوگئین

گ اب پابندی سے گ لکھا جاتا ہے یہ نہیں کہ بچت سے کام لے کر بجائے دو کے ایک کشش سے کام چلا لیا۔ یہ شعر بھی مرزا نوشہ ہی کا ہے:

بزم داغ طرب و باغ کشادہ پر رنک
شمع و کل تا کے وپروانہ و بلبل تاچند

اب وہ خواتین ہی نہیں رہیں جو شوہر کو خط میں عمداً القاب لکھنا بھول جاتی تھیں لیکن پورے خط میں بڑی ے کے نیچے کہیں بھی دو نقطے لگانا نہیں بھولتی تھیں۔ ''لڑکیے، آپ کے بیٹے''

وقت کے ساتھ نہ صرف یہ کہ کتنے ہی لفظ اور کتنی ہی کہاوتیں بولنے اور لکھنے میں زبان سے غیر ضروری سامان کی طرح پھینک گئے ہیں اور اردو نے دوسری زندہ زبانوں کی طرح، بہت کچھ نیا سامان سفر ساتھ لے لیا ہے۔ غالبؔ کے منگلوڈ بہادر بعد میں پتہ چلا کوئی صاحب Mcleod ''میکلاوڈ'' تھے جنھیں اب میکلوڈ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور وہ بھی انگریزوں کے دور میں بس سڑکوں کے نام رکھے جانے کے کام کے رہ گئے تھے۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے ضرورت اردو کے رسم الخط کو مزید بہتر بنانے کی ہے تا کہ صوت اور نوشت میں ایسا بُعد نہ رہے کہ جیسے غیر کی زبان کے ساتھ اردو میں ناانصافی ہوئی ہے وہ اپنے گھائل شدہ الفاظ اور ناموں کو خود نہ پہچان سکے، لفظ ایک دوسرے میں اتنے مدغم نہ ہو جائیں کہ معنی کچھ کے کچھ بن جائیں۔ توپ خانہ، توپ خانہ ہی رہے تو بہتر ہے۔

دوسری ضرورت اس تبدیلی کی اس سے زیادہ اہم ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ انٹرویو میں وظیفے یا نوکری کے امیدوار سے اگر پوچھا جائے کہاں کے پڑھے ہوئے ہو؟ اور وہ جواب دے: ''مسلم کالج کا''، کن اسپورٹس میں حصہ لیا ہے؟ کا جواب ہو: ''فٹ بالی'' تو بھانڈا پھوٹ جاتا ہے کہ کس طبقے سے ہے۔

لیکن ''لینس ڈاؤن کولج'' اور ''وولی بال'' (Volley Ball) کہنے سے اس کے لیے زمین پر جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

مولوی سید احمد دہلوی مرحوم کی فرہنگ آصفیہ کی جلد چہارم میں ایک اندراج قابل توجہ ہے:

نُوِل انگلش Novel، اسم مذکر۔ عشق آمیز قصہ یا کہانی۔ (جلد چہارم، ص ۶۱۷) یہ فرہنگ ۱۹۱۹ء میں مکمل ہوئی تھی۔

(مضمون کے دوسرے حصے میں میں نے ان یورپی زبانوں کے الفاظ کے اردو نوشت میں آنے کا ذکر کیا ہے جو لسانی گروپس کے مابین وجہ نزاع بن گئے ہیں)

''دلِ مسلم''

امریکہ کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے دورۂ سعودی عرب کے موقع پر نہ صرف اُن کا شاندار استقبال کیا گیا بلکہ شاہ سلمان نے ڈونلڈ ٹرمپ کو سعودی عرب کی تاریخ کے مہنگے ترین تحائف پیش کر کے ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ غیر ملکی خبر رساں ادارے کے مطابق ٹرمپ کو پیش کیے جانے والے تحائف میں انتہائی قیمتی اور نایاب ہیرا، خالص سونے سے تیار کردہ بندوق جس پر شاہ سلمان کی تصویر کندہ ہے، پچیس کلو وزنی خالص سونے سے تیار کردہ تلوار جس پر ہیرے اور دیگر نادر اقسام کے پتھر اور جواہرات نصب ہیں جس کی قیمت کا اندازہ بیس کروڑ ڈالر لگایا گیا ہے۔ سونے اور ہیروں سے تیار کردہ پچیس گھڑیاں جن کی مالیت کا اندازہ بھی بیس کروڑ ڈالر ہے۔ ہیرے اور جواہرات سے سجے ایک سو پچاس سے زائد عبایہ، آزادی کا ہم شکل مجسمہ جو ہیرے اور جواہرات سے تیار شدہ ہے جس کی مالیت کا اندازہ اسّی (۸۰) کروڑ بتایا گیا ہے۔ ایک قیمتی کشتی جس کی لمبائی ایک سو پچیس میٹر ہے جسے دنیا کی سب سے لمبی ذاتی کشتی سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ اس کشتی میں اسّی (۸۰) عام کمرے، بیس شاہی کمرے جن کے اندر سونے کا جڑاؤ کام ہے اس کے علاوہ سعودی دارالحکومت ریاض کی سب سے بڑی شاہراہ کا نام ڈونلڈ ٹرمپ سے منسوب کیا گیا ہے جس کے شروع میں ٹرمپ کا مجسمہ بھی نصب کیا جائے گا۔ یاد رہے سعودی فرمانروا نے تحریری طور پر بیان حلفی بھی ساتھ دیا ہے کہ یہ تمام تحائف ٹرمپ کے ذاتی اثاثے میں شمار کیے جائیں۔

☆

حیدرآباد کے ادبی اڈّے

رؤف خیر
(حیدرآباد، دکن)

مشرق سے مغرب تک ہر شہر میں کوئی نہ کوئی ایسا ''ادبی اڈّہ'' ہوتا تھا جہاں شاعر ادیب عموماً شام جمع ہوا کرتے تھے اور اپنی اپنی تازہ تخلیقات پیش کرکے داد طلب ہوا کرتے تھے۔مخلص احباب کے مشورے ان تخلیقات کو نکھارنے سوارنے میں مددگار ہوتے تھے اس قسم کے مخلصانہ مشورے قبول کرتے ہوئے ادیب شاعر عار محسوس نہیں کرتا تھا کیوں کہ اخلاص ہر دو جانب ہوا کرتا تھا۔ایسے خوش ظرف مخلص شاعر ادیب ہر شہر میں ہوا کرتے تھے۔پٹنہ ہو کہ لاہور ،رانچی ہو کہ کراچی، لکھنو ہو کہ دہلی ہر چھوٹے بڑے شہر میں ادبی اڈے شعر وادب کی ترویج واشاعت کے مراکز شمار ہوتے تھے۔

بھوپال کا ادبی اڈہ احد ہوٹل تھا جس کے منیجر محمد علی تاؔج بھوپالی تھے جو بجائے خود بڑے اچھے شاعر تھے۔ان کے دو شعری مجموعے ''خیمۂ گل'' اور ''سورج نما'' ان کی یادگار ہیں ان کے کئی شعر ضرب المثل کی طرح مشہور ہیں۔ان کا ایک شعر ہے:

پھول کیا ہے شبنم کیا شمع کیا ستارہ کیا
حُسن حُسن ہے تیرا اس میں استعارہ کیا!

حیدرآباد میں بھی شاعروں ادیبوں کے کچھ ٹھکانے تھے جہاں وہ بلا ناغہ جمع ہوتے تھے۔ان سے ملنے کے مشتاق حضرات ان کے گھروں سے بھلے ہی ناواقف ہوں ان ٹھکانوں پر ہی ان سے رابطہ قائم کیا کرتے تھے۔ہر شہر دو حصوں پر مشتمل ہوا کرتا ہے جیسے نئی دہلی پرانی دہلی ، کلکتہ کا ہوڑہ پل خانہ اور Splendid Area۔اسی طرح حیدرآباد بھی پرانے شہر اور نئے شہر میں سانس لیتا ہے۔پرانے شہر کے بعض ادیب وشاعر مدینہ ہوٹل محلہ پتھر گٹی میں پائے جاتے تھے جیسے استاد شاعر اوج تعقوبی ،خواجہ شوق صلاح الدین نیر، فیض الحسن خیال رئیس اختر وغیرہ۔استاد شاعر اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاح وہیں دیا کرتے تھے۔اس طرح وہاں ان کے شاگردان کی خدمت بھی کیا کرتے تھے۔

تاریخی عمارت چار مینار کے دامن میں ایک کیفے فراشا بھی ہے جہاں بعض شاعر آدھی پیالی چائے پلاکر پوری پوری سالم غزلیں ایک دوسرے کو سنایا کرتے تھے۔اس کیفے میں جمع ہونے والوں میں روحی قادری، رضا وصفی، الطاف صمدانی، غیاث متین وغیرہ تھے۔فراشا کیفے کو ارباب ذوق نے ''غیبت کدہ'' کا نام دے رکھا تھا پرانے شہر اور نئے شہر میں خطِ فاصل کھینچنے والی موسیٰ ندی ہے۔جنوبی حصے میں جو شاعر ادیب تھے وہ بڑے قلندر مزاج واقع ہوئے تھے۔وہ اپنی دنیا میں مست رہتے تھے۔چوں کہ عصری تعلیم سے بھی کم کم ہی آشنا تھے اس لیے وہ زیادہ تعلیم یافتہ ادیبوں شاعروں کے لیے اجنبی سے تھے۔وہ روایتی شاعری کو گلے لگا کے جیتے تھے۔رات رات بھر روایتی مشاعرے برپا کرتے تھے۔ان کی تخلیقات بہت کم شائع ہوتی تھیں۔اس کے برخلاف شمالی حصے میں واقع نئے شہر کے قلم کاروں کی تخلیقات ہندوپاک کے رسائل وجرائد میں جگہ پاتی تھیں اور ان کی خوب شہرت تھی۔نئے شہر میں ترقی پسندی اور جدیدیت کے علم بردار پائے جاتے تھے۔ان کی محفلوں میں نئے نئے مباحث اٹھائے جاتے تھے اور ان کی محفلیں زیادہ تر دن کے اوقات میں ہوتی تھیں یا زیادہ سے زیادہ آٹھ نو بجے رات کو اختتام پذیر ہوتی تھیں۔کیوں کہ اس کے بعد ان کی ''فضیلت کا وقت'' شروع ہوجاتا تھا۔

پرانے شہر کے شاعروں کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ان کو موسیٰ ندی کے آگے کوئی نہیں جانتا مگر پرانے شہر کے شاعر نئے شہر کے شعرا کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے قابل ذکر مشاعروں میں ترقی پسند اور جدید شاعروں کو مدعو کیا کرتے تھے جیسے مخدوم ،سلیمان اریب ،وحید اختر ،شاذ تمکنت، ابن احمد تاب، عزیز قیسی وغیرہ جب کہ نئے شہر کی محفلوں میں پرانے شہر کے شاعر حصہ لیتے شرماتے تھے۔جدیدیت اور ترقی پسندی کے بارے میں پرانے شہر کے شاعروں کی رائے کچھ اچھی نہیں تھی وہ اسے گمراہی سمجھتے تھے۔

پرانے شہر میں ادیبوں شاعروں کے دو مشہور اڈے تھے۔جیسے مدینہ ہوٹل اور تاریخی عمارت چار مینار کے دامن میں فراشا کیفے۔نئے شہر کے پڑھے لکھے سیاست دانوں، ادیبوں شاعروں کا مرکز اورینٹ ہوٹل تھا جو قلبِ شہر میں عابدس کے مقام پر واقع ہوا تھا۔مدینہ ہوٹل اور فراشا کیفے میں بیٹھنے والے کبھی اورینٹ ہوٹل کا رُخ نہیں کرتے تھے۔اسی طرح اورینٹ ہوٹل میں اڈّہ جمانے والے پرانے شہر کے شاعروں کو چشم کم سے دیکھتے تھے جو زیادہ تر سیندھی خانوں اور خانہ ساز شراب پر گزارا کرلیا کرتے تھے۔پرانے شہر کے ایک شاعر رضا وصفی کہتے تھے:

نظر کو آرزو ہے نیم زرد پھولوں کی
زباں کو ذائقہ بگڑی ہوئی شراب کا ہے

ہم نے اُن سے جب پوچھا کہ اچھی کمپنی کی اچھی شراب کے بجائے وہ بگڑی شراب کو کیوں پسند کرتے ہیں تو فرمانے لگے خانہ ساز شراب کی بھٹی جب بگڑ جاتی ہے تو شراب اور بھی تیز اور زیادہ نشہ آور ہوجاتی ہے۔بگڑی ہوئی شراب کا ذائقہ رکھنے والا کسی اچھی سے اچھی شراب کو خاطر میں نہیں لاتا۔دراصل پرانے شہر کے شاعر اپنی اوقات کے مطابق نشہ کرتے تھے۔جب کہ اورینٹ میں بیٹھنے والوں کا معیارِ زندگی قدرے بلند تھا۔شاعرِ موصوف سے ہماری گفتگو 1970 کے آس پاس ہوئی تھی گویا تقریباً پینتالیس سال پہلے۔ہم اس وقت منہ پھٹ نوجوان تھے۔''نیم زرد پھولوں'' کی جو انھوں نے شرح فرمائی تھی وہ بھی خاصے کی تھی۔فرمایا کہ میاں تم کیا جانو ادھیڑ عمر کی محبوباؤں سے جو پذیرائی حاصل ہوتی ہے اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اورینٹ ہوٹل میں بیٹھنے والے وہاں سے اٹھتے بھی تھے تو رستم فرام بار

میں زیر بار ہو کر ولایتی شراب کے مزے لوٹتے تھے۔مشہور ترقی پسند مگر متمول شاعر راشد آزر کے گھر پر ہی باضابطہ بار بنا ہوا تھا۔ بیشتر ادیب وشاعران کے اطراف منڈلاتے رہتے تھے۔جب کہ صفی اورنگ آبادی کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی ساری زندگی سیندھی خانوں میں گزری۔ان کے شاگرد اور چاہنے والے انھیں اس سے آگے بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ریڈیو سٹیشن سے صفی اورنگ آبادی کو کنٹراکٹ بھیجا گیا کہ وہ آ کر اپنا کلام ریکارڈ کروائیں۔وہ اپنا کلام ریکارڈ کروانے پر آمادہ بھی ہو گئے تھے مگران کے نادان ساتھیوں نے صفی سے کہا۔''صفی صاحب آپ اور ریڈیو سٹیشن جائیں! ریڈیو والوں کو چاہیئے کہ آپ کے پاس آئیں !!''اس زمانے میں چوں کہ ٹیپ ریکارڈر ایجاد نہیں ہوا تھا لہذا صفی کا کلام نشر ہی نہیں کیا جاسکا۔ریڈیو سٹیشن میں ریکارڈنگ ساؤنڈ پروف روم میں ہوا کرتی ہے۔اس میں شک نہیں صفی کی غزلیں سیندھی خانوں میں،طوائفوں کے کوٹھوں پر اور قوالوں کے ذریعے کافی مقبول ہوئیں ۔گلی گلی ان کی سیدھی سادی غزلوں کی دھوم تھی مگر یہ ریڈیو جیسے طاقتور میڈیا سے محروم رہیں۔ان کی غزلیں کہیں چھپتی بھی نہیں تھیں الا ماشاء اللہ۔یہی سبب ہے کہ صفی کا واحد مجموعہء کلام''پراگندہ'' ان کے انتقال کے برسوں بعد 1965 کے آس پاس شائع ہوا۔پاکستان میں''فردوس صفی'' چھپا مگر اس میں الحاقی کلام بار پا گیا ہے

پرانے شہر کے شاعر جوزیادہ تر فراشا کیفے میں بیٹھتے تھے آپس میں الجھا بھی کرتے تھے۔گروہ بندیاں بہت تھیں۔بعض استاد شاعروں کا ذریعہء روزگار شاعری ہی تھا۔ضرورت مند ہر قسم کا مال اُن سے لے کر اپنے نام سے پڑھتے پھرتے تھے۔

ایک شاعر علی افسر تھے۔وہ اکثر مشاعروں میں اپنی مسدس''محمد نامہ '' کے کچھ بند سنایا کرتے تھے۔پرانے شہر کے ایک اور استاد شاعر روحی قادری نے Loose Talk میں کہیں کہہ دیا کہ محمد نامہ ان کا کہا ہوا ہے۔اب کیا تھا علی افسر نے روحی قادری کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا دعوا Defamation Suit دائر کر دیا۔اتفاق سے ہم اس زمانے میں رینٹ کنٹرول کورٹ میں سٹینو گرافر تھے۔ہمارے کورٹ کے بازو میٹروپولیٹن مجسٹریٹ کے اجلاس (کریمنل کورٹ) میں ان کا مقدمہ چل رہا تھا۔وہیں ہم علی افسر کو ہر پیشی پر دیکھا کرتے تھے۔مہینوں بعد مجسٹریٹ نے علی افسر اور روحی قادری کو مصالحت کر لینے کا مشورہ دیا۔اس طرح وہ مقدمہ داخل دفتر ہو گیا۔

فراشا کیفے میں پابندی سے اڈہ جمانے والے ایک نوجوان شاعر الطاف صمدانی کلین شیو،بش شرٹ پینٹ میں ملبوس اکثر ان شرٹ کیا کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں کا ایک حلقہ بھی تھا۔وہ غالباً کسی مرہم کی تیاری اور فروخت میں مصروف تھے۔صاحبِ ذوجبین تھے۔اسی زمانے میں ہمارا ایک تحقیقی مقالہ ''حیدرآباد کی خانقاہیں''(1994 میں) منظر عام پر آیا تھا۔جس میں ہم نے بتایا ہے کہ قادریہ، چشتیہ،سہروردیہ اور نقش بندیہ سلسلے کے اصل بانی کون ہیں اور حیدرآباد میں یہ سلسلے کن صوفیہ کے ذریعے پھیلے اور ان کی خانقاہیں کہاں کہاں موجود ہیں۔اس وقت تک الطاف صمدانی محض ایک اپ ٹو ڈیٹ شاعر تھے۔مگر اچانک انھوں نے اپنا رنگ ڈھنگ بدلا،حلیہ بدلا،ڈاڑھی چھوڑ لی اور اب سید شاہ الطاف صمدانی ہو گئے اور کسی سلسلے میں بیعت بھی لینے لگے تھے۔اب سنا ہے ان کی بھی کوئی خانقاہ ہے جہاں ان کا بھی عرس منایا جاتا ہے۔ان کا ایک شعر مشہور ہے:

ان کے صدقے میں جی رہا ہوں میں
جن کو صدقہ دیا نہیں جاتا

ہم نے اپنی کتاب میں الطاف صمدانی کا ذکر نہیں کیا تھا کیوں کہ اس وقت تک وہ ہماری طرح کے ایک عام آدمی ہی تھے ورنہ ہم اپنی کتاب میں ان کی ترقی کا ذکر ضرور کرتے۔بعض دیگر کتابوں کے ساتھ ہماری یہ کتاب''حیدرآباد کی خانقاہیں'' آج بھی گوگل ویب سائٹ پر ہمارا نام Raoof Khair ٹائپ کر کے اور اس پر کلک کر کے پڑھی جاسکتی ہے۔

فراشا کیفے میں بیٹھنے والے مُجو معاش ادیب شاعر نئے شہر کے ادیبوں شاعروں کے ادبی اڈے اور رینٹ ہوٹل کی طرف کبھی نہیں جا پاتے تھے۔البتہ مدینہ ہوٹل کی بیٹھک والے بعض شاعر شام میں اور رینٹ ہوٹل کی طرف جانکلتے تھے جیسے خورشید احمد جامی، خیرات ندیم،ستار چشتی وغیرہ۔خیرات ندیم ایک نہایت زندہ دل شاعر تھے ۔ان کے قریبی دوست ستار چشتی تھے۔یہ دونوں ٹیچر تھے اور غالباً ایک ہی سرکاری سکول میں تعینات تھے۔ظاہر ہے دونوں کا رات دن کا ساتھ تھا۔دونوں ہم مشرب بھی تھے ۔حیدرآباد کے مشہور وممتاز ترقی پسند افسانہ نگار عاتق شاہ کی لڑکی عائشہ جبین کی شادی کی محفل میں ہمیں خیرات ندیم اکیلے دکھائی دیے۔ہم نے اُن سے پوچھ لیا کہ آپ کے ساتھ آپ کے کونٹر پارٹ Counterpart دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔خیرات ندیم صاحب نے ہمیں بتایا کہ ایک زمین کے معاملے میں اُن کا ستار چشتی سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ہم نے پوچھا کیا زمین مشترکہ طور پر خریدی گئی تھی؟اگر ایسا تھا تو آدھی آدھی بانٹ لیتے۔خیرات صاحب نے انکشاف کیا کہ''غزل کی زمین'' کے معاملے میں جھگڑا ہو گیا تھا۔وہ زمین انھوں نے پہلے نکالی تھی پھر اس میں ستار چشتی نے غزل کہہ ڈالی اور اسے اپنی اختراع قرار دیا تھا۔تب سے دونوں میں بول چال بند ہے۔

''زمیں'' کھا گئی آساں کیسے کیسے

خیرات ندیم صاحب زندہ دل واقع ہوئے تھے۔وہ سگریٹ بھی کثرت سے پیا کرتے تھے۔چنانچہ گینگرین مرض کی پاداش میں ان کا ایک پاؤں آخری آخری عمر میں گھٹنے کے نیچے سے کاٹ دیا گیا تھا۔ وہ بیسا کھیوں کے سہارے چلا کرتے تھے۔ایک سرکاری مشاعرے میں (جس میں ہم بھی مدعو تھے) اس وقت کے چیف منسٹر این ٹی راما راؤ سے شاعروں کا تعارف کرایا جا رہا تھا ۔ان کی باری آئی تو خیرات ندیم نے چیف منسٹر کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا '' کچھ کم خیرات ندیم سے ملیے''ایسے زندہ دلوں سے حیدرآباد خالی ہو گیا۔

اٹھ گئے دنیا سے فانی اہل ذوق
ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے

جیسا کہ کہا جا چکا ہے حیدرآباد کے نئے شہر میں پڑھے لکھے ادیبوں شاعروں، سیاست دانوں کا مرکز اورینٹ ہوٹل تھا جو قلب شہر عابد س جیسے پر رونق مقام پر واقع ہوا تھا۔ یہاں مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، خورشید احمد جامی ،شاذ تمکنت ، مغنی تبسم ،عوض سعید، اقبال متین ، وحید اختر ،مجتبیٰ حسین ،عزیز قیسی وغیرہ وغیرہ بلاناغہ جمع ہوتے تھے ۔ترقی پسند ادیب کا گروپ اپنے مسائل کے لیے ایک میز پر جمع ہوتا جہاں مخدوم مرکزی حیثیت رکھتے ۔سیاسی امور طے پا جاتے تو پھر ادبی معاملات کے لیے وہ دوسری میزوں کا رخ کرتے۔

ٹی انجیا (سابق چیف منسٹر آندھرا پردیش) چنا ریڈی (سابق چیف منسٹر آندھرا پردیش) وینکیٹ سوامی (مرکزی وزیر) گوسوامی (مشہور سوشلسٹ سیاسی پارٹی لیڈر) ایم ایم ہاشم (سابق وزیر داخلہ آندھرا پردیش) سید رحمت علی (ایم پی) وغیرہ وغیرہ جیسے سیاست دانوں کا آپس میں ملنے کا مقام بھی یہی اورینٹ ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ خاطر تواضع کرنے والے اہل عرض بھی وہیں آجاتے تھے۔ اورینٹ ہوٹل میں کھانے پینے اور پینے کھانے کا سب انتظام تھا۔

عموماً ادیب شاعر کی جیبیں خالی ہوتی تھیں ۔یہاں کے بیرے بھی بڑے باذوق اور زندہ دل واقع ہوئے تھے۔ اورینٹ ہوٹل کے کئی لطیفے مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ مخدوم محی الدین کے پاس ایک غزل ہوگئی اور وہ غزل سنانے کی خاطر اورینٹ ہوٹل پہنچ گئے ۔اتفاق سے اس رات کوئی ادیب شاعر وہاں نہیں آپایا۔ اب مخدوم بے چین تو تھے ہی ایک بیرے قاسم کو تازہ غزل سنانے لگے۔ وہ کچھ دیر تو سنتا رہا پھر کہنے لگا

''صاب آج آپ کو زیادہ چڑھ گئی ہے ۔چلیئے میں رکشہ دلا دیتا ہوں گھر جایئے آرام کیجئے''۔

خورشید احمد جامی کبھی کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوتے تھے مگر ان کا کلام ہندو پاک کے معیاری رسائل میں کثرت سے شائع ہوا کرتا تھا۔ وہ کہتے تھے شاعری کوئی ایسی چیز نہیں کہ چھپا کر رکھی جائے صرف گناہ چھپا کر کرنے کی چیز ہے ۔یہاں گناہ کی جگہ انھوں نے ایک لفظ استعمال کیا تھا جس (گناہ) کے بارے میں وہ مشہور تھے۔ جب کبھی ہندو پاک کے کسی رسالے میں جامی کی غزل شائع ہوتی تو وہ رسالہ بغل میں دابے وہ اورینٹ ہوٹل پہنچ جاتے ۔احباب کو چائے پلاتے اور اپنی غزل پڑھواتے۔

صفی اورنگ آبادی کی موت کے برسوں بعد صفی کے واحد شعری مجموعے ''پراگندہ'' کی اشاعت کے موقع پر حیدرآباد کے کمال یار جنگ پیالیس میں کل ہند مشاعرہ ہوا تھا جس میں فراق گورکھپوری بھی شریک ہوئے تھے۔ شاذ تمکنت فراق پر جان دیتے تھے اور فراق بھی شاذ پر۔ دوسرے دن فراق گورکھپوری کے ساتھ شاذ تمکنت اورینٹ آئے۔ وہاں جامی صاحب تشریف فرماتے تھے۔ فراق گورکھپوری سے تعارف کراتے ہوئے شاذ نے کہا کہ فراق صاحب ان سے ملیئے یہ خورشید احمد جامی ہیں۔ فراق نے سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنکھیں گھمائیں۔ جامی بہت تیز آدمی تھے انھوں نے شاذ سے کہا ''میاں تعارف یک طرف ہوگیا۔ یہ بھی تو بتاؤ کہ یہ صاحب کون ہیں؟''۔ اب فراق کا رنگ دیکھنے کے قابل تھا۔!

اس زمانے میں سلیمان اریب کا رسالہ ''صبا'' اور اعظم راہی کا ماہ نامہ ''پیکر'' ادبی دنیا میں تہلکہ مچائے ہوئے تھے۔ ان رسالوں کی مقبولیت دیکھتے ہوئے ایک صاحب کو پرچہ نکالنے کا شوق چرایا۔ انھوں نے اورینٹ ہوٹل پہنچ کر مخدوم، جامی، خیرات ندیم، ابن احمد تاب وغیرہ سے کہا کہ وہ صبا اور پیکر سے بھی زیادہ معیاری رسالہ نکالنے جارہے ہیں لہذا آپ حضرات سے کلام کی درخواست ہے۔ خیرات ندیم اور ابن احمد تاب نے اپنی اپنی غزلیں انھیں دے دیں۔ جامی صاحب نے اُن سے کہا کہ فی الوقت غزل نہیں ہے دو روز بعد آیئے۔ وہ دو دن بعد پہنچ گئے۔ جامی صاحب نے اُن سے پوچھا کہ وہ کس قسم کا منفرد رسالہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مدیر موصوف نے فرمایا کہ وہ آرٹ پیپر پر تخلیقات شائع کرنے والے ہیں اور شاعروں ادیبوں کے نام بھی آرٹسٹک (فنکارانہ) انوکھے انداز میں لکھوائیں گے جیسے آپ کا نام خورشید ہے ۔ہم آپ کی غزل کے اوپر سورج اتاریں گے اور اس کے بازو جامی لکھیں گے۔ جامی صاحب نے اُن سے پوچھا تو کیا خیرات ندیم کی غزل پر ایک بھکاری کو چتے (کاسے) کے ساتھ دکھائیں گے اور بازو ندیم لکھ دیں گے؟۔ اس پر زندہ دل خیرات ندیم اور ابن احمد تاب بھی قہقہے لگانے لگے۔ پھر یہ لطیفہ کئی دنوں تک ادبی حلقوں میں گردش کرتا رہا۔

1968 کے آس پاس کراچی کے احمد ہمیش حیدرآباد میں ہوا کرتے تھے جدیدیت کے حوالے سے ان کی بحثیں وحید اختر سلیمان اریب مخدوم وغیرہ کے ساتھ خوب ہوا کرتی تھیں۔ وہ ان کے ''ہم مشرب'' بھی تھے۔ یہ مباحث اورینٹ ہوٹل سے ''صبا'' کے دفتر (مجردگاہ) تک پھیل جاتی تھیں۔ حیدرآباد کے ایک جدید شاعر تاج مہجور شراب کی کمپنی میں منیجر تھے اور بقول غالب

مفت کی پیتے تھے مئے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ان کے بے تکلف دوستوں میں احمد ہمیش بھی تھے جنھیں اختر شیرانی کی طرح کی خیالی محبوبہ کے بجائے گوشت پوست کی حقیقی سلمیٰ میسر آگئی تھی تاہم احمد ہمیش کے دن کس مپرسی میں کبھی یہاں کبھی وہاں گزرتے تھے۔ ایک دن وہ سرِ شام تاج مہجور کے گھر پہنچ گئے۔ تاج بھائی جام و مینا سے شغل فرما رہے تھے۔ احمد ہمیش کو دروازے پر دیکھا تو خوش ہوگئے ۔اندر بلایا اور گھر والوں سے ایک اور گلاس منگوالیا اور جام تیار کرنے لگے۔ احمد ہمیش نے کہا ''تاج بھائی بھوک لگی ہے ۔'' تاج مہجور نے احمد ہمیش کی طرف جام بڑھاتے ہوئے کہا۔'' کھانا تو کتا بھی کھاتا ہے۔ لے شراب پی''

اورینٹ شعر و ادب کا ہی نہیں لطیفوں کا بھی اڈہ تھا۔ مجتبیٰ حسین اپنے دوست احباب کے ساتھ الگ میز پر قہقہے لٹاتے تھے۔ ان کی بذلہ سنجی اتنی شہرت پا گئی کہ سیاست کے مستقل کالم نگار شاہد صدیقی کی موت کے بعد طنز و مزاح کا

مقبول خاص وعام کالم شیشہ و تیشہ لکھنے کی ذمہ داری ان کے بھائی محبوب حسین جگر جیسے صحافی نے مجتبیٰ پر ڈالی۔ پھر تو کالم اتنا مقبول ہوا کہ اس نے مجتبیٰ حسین کو مزاح نگاری کے آسمان پر پہنچا کے دم لیا۔ اب تو مجتبیٰ حسین مخدوم، اریب، شاذ، عزیز قیسی، وحید اختر، مغنی تبسم، اقبال متین وغیرہ کے ہم مشرب ہو گئے۔ ان کی قربتوں کے بعد جب وہ دہلی پہنچے تو مخمور سعیدی، بلراج کومل۔ کے ایل نارنگ ساقی، اندر کمار گجرال، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر وغیرہ کے قریب ہو گئے۔

اورینٹ میں مجتبیٰ حسین سے رونق آجاتی تھی۔ سلیمان اریب اپنی بیوی صفیہ کی علمیت کا ہر جگہ ڈھنڈورا پیٹتے تھے۔ چاہے کوئی سیاسی مسئلہ ہو، سماجی معاملہ ہو یا ادبی بحث ہو ہر معاملے میں اریب کہتے کہ ''صفیہ کا بھی یہی خیال ہے''۔ ایک دوست نے زچ ہو کر اُن سے کہا یار یہ کیا ہر معاملہ میں صفیہ کا بھی یہی خیال ہے صفیہ کا بھی یہی خیال ہے کہے جاتے ہو ''تم بڑے بے وقوف ہو''۔ دوسری طرف سے ایک بے تکلف دوست نے لقمہ دیا ''صفیہ کا بھی یہی خیال ہے''۔ اریب اس لطیفے کا خود بھی لطف لیا کرتے تھے۔

اورینٹ کا ایک اور دل چسپ لطیفہ بہت مشہور ہے۔ پہلی بار شاذ تمکنت کو کشمیر میں کل ہند مشاعرہ پڑھنے کی دعوت آئی ساتھ ہی ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی انھیں بھیجا گیا۔ وہ دعوت نامہ اور ٹکٹ لے کر اورینٹ ہوٹل پہنچے تاکہ احباب پر رعب جمائیں۔ ادھر احباب نے نظر انداز کرنے کی سازش رچی۔ شاذ آئے اور احباب کی ایک میز پر کشمیری مشاعرے کا دعوت نامہ اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی رکھا۔ چائے منگائی۔ بیرا جب پانی کے گلاس رکھ رہا تھا تو شاذ کہنے لگے۔ ذرا سنبھل کے ہوائی جہاز کا ٹکٹ رکھا ہوا ہے۔ چائے آئی تو پھر شاذ کہنے لگے۔ میاں ذرا سنبھال کے ہوائی جہاز کا ٹکٹ کہیں زد میں نہ آئے۔ پھر بھی احباب نے چپ سادھے رکھی۔ بازو والی میز پر کسی نے زبردست قہقہہ لگایا۔ مجتبیٰ نے کہا یارو ذرا سنبھل کے یہاں ہوائی جہاز کا ٹکٹ رکھا ہوا ہے کہیں اُڑ نہ جائے۔ اس پر پھر جو چاروں طرف قہقہے ابل پڑے دیکھنے کے تھے۔ شاذ تمکنت بُرا سا منہ بنا کر اُٹھ کر چل دیئے۔ مذکورہ دونوں لطیفے مجتبیٰ حسین کے خاکوں میں موجود ہیں۔

غرض اورینٹ ہوٹل حیدرآباد میں گنگا جمنی تہذیب کا ایک انمول دل نواز مرکز تھا۔ جہاں کمیونسٹ اور ترقی پسند جمع ہوتے تھے جیسے مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ، سلیمان اریب، اقبال متین، عزیز قیسی وغیرہ کانگریسی رہنما جیسے ٹی انجیا، وینکٹ سوامی، ایم ایم ہاشم، رحمت علی وغیرہ جدید لب ولہجہ کے شاعروں میں خورشید احمد جامی جو حیدرآباد میں جدید غزل کے بنیاد گزاروں میں سے تھے۔ وحید اختر، شاذ تمکنت وغیرہ۔ نئی نسل کے ابھرتے لکھنے والوں میں تاج مہجور، رؤف خلش، حسن فرخ ساجد اعظم محمود انصاری، اعظم راہی وغیرہ آیا کرتے تھے۔

شکیل بدایونی کے شاگرد کہلائے جانے والے اکمل حیدرآبادی بھی تھے جو کبھی ترقی پسندوں کی میز پر ہوتے تو کبھی جدید شاعروں کے ساتھ ہو جاتے۔ تمام ادیب شاعر ایک دوسرے سے بے تکلف بھی تھے مگر حد وادب بھی ملحوظ رکھتے تھے۔ کوئی شخص کسی کی دل آزاری نہیں کرتا تھا بلکہ لطیفوں کا ہدف بھی لطیفے سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ سلیمان اریب تو ان کے تعلق سے پیش آنے والا لطیفہ خود ہی مزے لے لے کر سناتے تھے اور مجتبیٰ حسین سے کہتے تھے کہ وہ احباب کو سنائیں۔

آج تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ادیب شاعر منہ پھلائے بیٹھتے ہیں بلکہ معمولی سی تنقید بھی برداشت کرنے کی صلاحیت کسی میں نہیں۔

اورینٹ ہوٹل، مدینہ ہوٹل، فراشا کیفے کے حوالے سے ہم اور بھی لطائف وواقعات بیان کر سکتے ہیں مگر

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوف فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

''چلو دلدار چلو''

اسٹیو وزنیک جنہوں نے اسٹیو جوبز کے ساتھ مل کر ۱۹۷۶ء میں ''ایپل'' نامی کمپنی کی بنیاد رکھی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ ۲۰۷۵ء کی دنیا میں ایپل، فیس بک اور گوگل اتنے بڑے ہوں گے کہ ہم صحراؤں میں رہ رہے ہوں گے۔ اسٹیو وزنیک اگلے ہفتے سین جوز میں تین روزہ کانفرنس کا انعقاد کر رہے ہیں جس کا عنوان ہے ''انسانیت کا مستقبل، ہم ۲۰۷۵ء میں کہاں ہوں گے؟'' واضح رہے کہ اسٹیو درست پیش گوئی کرنے کی وجہ سے معروف ہیں انہوں نے ۱۹۸۲ء میں کہا تھا کہ پورٹیبل لیپ ٹاپ بنانا ممکن ہے اور آج واقعی ایسا ہے۔ ۲۰۷۵ء کے حوالے سے ان کا مزید کہنا ہے کہ مستقبل میں نئے شہروں کے قیام کے لیے صحرا بہترین جگہ ہیں۔ مستقبل میں صارفین اسمارٹ والٹ کے ذریعے دکاندار سے رابطہ کر کے خریداری کر لیا کریں گے۔ اسی طرح ایسے طبی آلات بنا لیے جائیں گے جو اپنے آپ ہی بیماریوں کی تشخیص کر کے ادویات تجویز کر دیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ مستقبل میں مریخ پر بھی آبادی ہوگی تاہم انسان زمین کو رہائش کے مقصد کے لیے استعمال کریں گے جب کہ مریخ پر صرف صنعتی زون قائم کیے جائیں گے۔ تاہم خلائی مخلوق کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ایسا ممکن نظر نہیں آ رہا کہ زمین کے باسی کسی دوسرے سیارے کی کسی مخلوق سے کبھی رابطہ کر پائیں۔

☆

نہ جانے کیوں؟

(اپنے نواسے فہد ٹوانہ کی حادثاتی موت پر)

آپا جمیلہ شبنم (اسلام آباد)

پیارے فہد جی،

میں تمہارے گھر گئی۔لیکن تم مجھے کہیں نظر نہیں آئے۔تمہارے سکول کے پاس سے جب کار گزری تو میرا دل زور زور سے دھڑکا۔ابھی اچھلتا کودتا فہد آ کر کہے گا۔

''نانی اماں میں آپ کے ساتھ گھر جاؤں۔''

آج سے دو ماہ پیشتر آرمی پبلک سکول کے اسی موڑ پر میری اور تمہاری ملاقات ہوئی لیکن اسی دن سکول سنسان،اداس،چپ چاپ تھا۔نہ جانے کیوں۔۔۔؟

تمہاری امی کے چہرے پر وہ پیاری سی مسکراہٹ نظر نہ آئی وہ مجھ سے لپٹ کر ملی میں نے اس کی خوبصورت آنکھوں کو پیار کیا۔دل نے بے ساختہ کہا۔

''یہ تو میرے شہزادے فہد کی آنکھیں ہیں۔تمہاری امی کی آنکھوں سے شفاف موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

نہ جانے کیوں۔۔۔؟

روحی اور ناہید خالہ بھی آئی ہوئی تھیں۔تمہارے خالدی ماموں، رومی مامی، سیما اور ذیشان تھے۔دوپہر کو تمہارے بابا بھی دفتر سے آ گئے۔میں دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ابھی فہد آ کر اپنے پیارے بابا سے لپٹ جائے گا۔

بابا کے ہاتھوں میں تمہاری باہنوں کی بجائے خطوط کا ایک بنڈل تھا ایک فائل میں بہت سی ٹیلیگرامز تھیں۔ہر خط میں تمہارا نام تھا ہر تار میں تمہارا ذکر تھا۔ہم سب تمہیں پیار کرنے کی بجائے تمہاری تصویروں کو بار بار چوم رہے تھے۔آزاد کشمیر والی تصویر مجھے بہت ہی پیاری لگی۔اس میں تم مجھے بہت بڑے لگے تھے۔

عمران کی منگنی کے بعد میں نے تمہیں اس تصویر میں دیکھا تم مجھے ایک دم جواں سال لگے۔کشادہ کندھے،بھرے بھرے بازو،گھنے بال اور بڑی پیاری سی مسکراہٹ والا چہرہ۔

تمہیں دیکھ کر میں مخصوص دعائیہ کلمات کہا کرتی تھی۔

''یا اللہ نیلو کے بیٹے کو نظرِ بد سے بچانا''

تصویر دیکھ کر وہ دعا میرے لبوں پر اٹک گئی۔

نہ جانے کیوں۔۔۔؟

کھانے کی میز پر بھی تم نظر نہ آئے۔نہ اماں سے اپنی پسند کی کوئی چیز مانگی نہ خان زمان چاچا کو آواز دی۔نہ اپنی بہن سیمین کو تنگ کیا۔نہ کارٹون دیکھنے آئے۔

گھر میں بہت لوگ تھے۔لیکن تمہارا گھر بہت اداس لگ رہا تھا۔ایسا لگتا تھا گھر کی ہر چیز رو رہی ہے۔

نہ جانے کیوں۔۔۔؟

شام ڈھلی تو تمہارے بابا نے کہا۔

''اندر بہت گرمی ہے۔باہر لان میں آ کر بیٹھیں۔''

ہم سب باہر آ گئے۔سیمی سرکل میں کرسیاں لگی تھیں۔پنکھے چل رہے تھے۔

تمہارے پپی کریٹ میں بند تھے۔اور چیخ رہے تھے۔

نہ جانے کیوں۔۔۔؟

تمہارے بابا اور اماں کے پاس لوگ آ رہے تھے، جا رہے تھے ہر زبان پر تمہارا نام تھا۔ان کے بچے تمہیں آوازیں دے رہے تھے۔وہ حیران تھے کہ آج فہد اتنی جلدی کیوں سو گیا۔

میں رات گئے تمہارا انتظار کرتی رہی۔تمہیں پتہ ہے میں تمہارے بستر پر سوتی تھی۔

میں جاگتی رہی۔ابھی فہد آ کر مجھے گدگدیاں کرے گا۔

''نانی اماں میں آ گیا''

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔سامنے تمہاری رائٹنگ ٹیبل اور کرسی نظر آئی۔

مجھے ایسا لگا کہ تم اپنی کرسی پر بیٹھے اپنا ہوم ورک کر رہے ہو۔میں تمہیں پیار کرنے لگی۔پھر میں نے تمہاری سرخ رنگ کی چھوٹی کرسی اور میز کو دیکھا۔مدہم سی روشنی میں مجھے دو شرارتی اور چمکیلی سی آنکھیں نظر آئیں۔

پھر میں نے دیوار پر لگے کلاک کو دیکھا۔تمہاری امی نے یہ باڑے سے خریدا تھا جو کر کے بازو دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے پنڈولم ہل ہل کر کہہ رہا تھا۔

''میں تو ابھی زندہ ہوں۔فہد سو کر اٹھتا تھا تو سب سے پہلے مجھے دیکھتا تھا۔''

آج کتنے دن ہو گئے اس نے مجھ پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔

نہ جانے کیوں۔۔۔؟

سالار کی امی نے مجھے بتایا کہ سالار فہد کو بہت یاد کرتا ہے۔رات کو سوتے سوتے بلاتا ہے۔تم دونوں سیر کو اکٹھے نکلے تھے۔وہ کہتا ہے میں نے اسے آواز دی تھی۔

''فہد اب واپس چلتے ہیں۔''

فہد نے کہا۔

''سالار۔رکو۔رکو میں آتا ہوں۔''

اسے اب بھی ہر طرف یہی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔لیکن تم ابھی

تک واپس نہیں آئے۔

نہ جانے کیوں۔۔۔؟

فہد جی سین نے مجھے بتایا کہ تم اپنے ماموں عمران کی شادی میں خوب رونق لگاؤ گے۔تم اپنے بابا کے ساتھ مل کر ڈانس کرو گے۔ کتنے شوق سے اپنے بابا کو ڈانس کے Steps سکھاتے تھے۔ کتنے پیارے انداز سے اپنا ہاتھ ماتھے پر مار کر کہتے۔

''بابا آپ کیا کر رہے ہیں۔''

بابا جان کر ایسا کرتے۔ کیوں کہ تم ڈانس کرتے ہوئے انہیں بہت پیارے لگتے تھے۔

میرے ننھے شہزادے تم اپنی بدقسمت نانو کے بیٹے کی شادی پر رونق لگانے کب آؤ گے؟

ذیشان، سرفراز اور اعزاز تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ جادو، فادو اور طلحہ تمہارے بغیر اداس ہیں۔ان کی خوشیوں میں ایک بہت بڑا دکھ شامل ہو گیا ہے۔

نہ جانے کیوں۔۔۔؟

میرے بچے آج ہفتہ ہے۔تم ایک پل کے لیے اپنی اماں اور بابا سے دور نہیں ہوتے تھے۔ یہ تم کدھر جا چھپے ہو۔ میرے چھوٹے سے جرنیل پوری یونٹ تمہاری راہ دیکھ رہی ہے سفید گھوڑے کے شاہ سوار آ کر اپنے گھوڑے کی باگیں سنبھالو۔''سوئمنگ پول'' کی لہریں تمہیں پکار رہی ہیں۔تمہاری پولو اسٹک کھونٹی سے لٹک رہی ہے۔تم کتنے پیارے انداز سے پولو اسٹک اپنی پنڈلی پر مارتے تھے۔تمہاری یہ ادا تمہاری رائیٹر نانو کو بہت ہی پسند ہے۔

تمہاری ہر ادا بہت انوکھی اور نرالی تھی۔

چھاؤنی میں اب لوڈ شیڈنگ نہیں ہوتی۔لیکن ہمارے دلوں پر ایک مستقل اندھیرا اور غبار چھا گیا ہے۔

میرے چاند تم آ کر ملنا تا کہ ہماری آنکھیں روشن ہو جائیں تمہیں ڈھونڈتے آج پندرہ دن ہو گئے۔نیند بالکل نہیں آ رہی اس لیے تمہیں خط لکھنے بیٹھ گئی۔

تمہارے نام یہ میرا پہلا خط ہے۔

پیاری پیاری آنکھوں پہ بہت سے پیار۔

''رہے نام اللہ کا۔''

تمہاری بہت ہی دکھی

نانو۔ پیاری نانو۔

آپ کا خط ملا۔ میں بابا کے دفتر میں تھا۔خط پر میرا نام دیکھ کر بابا کی آنکھوں میں بہت سے آنسو آ گئے۔ پھر انہوں نے خط پڑھنا شروع کیا۔مگر ایک صفحہ سے زیادہ نہ پڑھ سکے۔خط بند کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا۔اور بھرّائی آواز میں کسی انکل کو کہا۔

''پندرہ منٹ تک کسی کو دفتر میں نہ آنے دیں۔''

بابا مت روئیں۔ میں آپ کے پاس کھڑا ہوں۔آپ کا چھوٹا سا جرنیل فہد ٹوانہ۔سفید گھوڑے کا شہہ سوار۔سوئمنگ پول کا تیراک یہ سب کچھ آپ نے ہی مجھے سکھایا تھا۔آٹھ سال کی عمر میں آپ نے مجھے آئیڈیل بنا لیا تھا میں آپ کے ساتھ شکار پر جاتا تھا۔

کچھ دن پہلے آپ کے ساتھ ایکسر سائز ایریا میں بھی گیا۔آپ نے میرا ہاتھ ایک کیپٹن انکل کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔

''اسے سنبھالو میں ذرا جنرل مقبول سے بات کر لوں۔''

اچانک مجھے خیال آیا میں آپ سے پوچھوں:

''میدانِ جنگ میں ٹینک آگے ہوتے ہیں یا پیچھے؟''

میں بھاگا بھاگا آپ کے پاس گیا۔آپ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا مگر آپ جنرل مقبول سے باتوں میں مگن تھے۔ میری بات نہیں سن رہے تھے۔ میں نے آپ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔اور جنرل صاحب کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

''پلیز انکل آپ ذرا خاموش ہو جائیں میں بابا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

جنرل انکل نے فوراً کہا۔

''اچھا ٹوانہ صاحب پہلے آپ بات کر لیں۔''

کھاریاں کینٹ کے سب انکل سب آنٹی مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔

''بابا پلیز اب چپ ہو جائیں۔آپ کے آنسو مجھ سے دیکھے نہیں جاتے۔''

نانو۔آپ کا وہ خط جو میرے نام تھا بابا نے اماں کو لا کر دیا۔اماں نے دروازہ بند کر کے وہ خط پڑھا۔ پھر سسکیاں لے لے کر رونے لگیں۔اماں کو روتا دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔مگر میرے آنسو کوئی دیکھ نہیں رہا تھا۔بابا بھی اماں کو پیار کر رہے تھے۔

یہ کیا بات ہے میں سب کو دیکھ رہا ہوں۔مگر مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا۔

رات کو رائیٹر نانو آپ کا خط جو میرے نام تھا۔اپنے کمرے میں لے آئیں۔مجھے آپ کا خط کوئی دے ہی نہیں رہا تھا۔سب پڑھتے جاتے روتے جاتے۔

نانو آپ میری امی کی خالہ بی بی تھیں۔اور رائیٹر نانو میری اماں کی امی تھیں۔اماں کی شکل نانو سے بہت ملتی ہے۔آپ کو یاد ہے نا جب بابا ''تبوک'' گئے تھے تو میں صرف ڈیڑھ سال کا تھا۔ نانو تین سال ہمارے پاس لاہور فلیٹ میں رہی تھیں۔ انہوں نے میری چوسنی چھڑائی۔ مجھے فیڈر کی بجائے گلاس سے دودھ پینا سکھایا۔وہاں لاہور میں اماں کی ایک اور خالہ محمودہ بھی آئیں تھیں۔ میں کبھی نانو کے ہاتھ سے چوری کھاتا کبھی دوسری نانو کے ہاتھ سے۔ پھر اماں بھی بابا کے ساتھ لندن، جرمنی، فرانس، بنکاک کی سیر کو چلی گئیں۔تب میں اور سبین اکیلے نانو کے پاس رہے تھے۔

ہمیں کیلے اور چوریاں کھلا کر انہوں نے موٹا کر دیا۔ بابا ''تبوک'' سے آ گئے۔ہم نانو کو اکیلا چھوڑ کر گوجرانوالہ کینٹ میں چلے گئے۔میرے لیے نانو

اتنی اداس ہوگئیں۔ بیمار ہوگئی تھیں۔ ڈاکٹر کہتے انہیں ''ڈپریشن'' ہوگیا تھا۔ پھر جب بھی نانو ہمارے گھر آتیں میں انہیں اپنے کمرے میں رکھتا۔ بابا کہتے:

''یہ نانو کا روم میٹ ہے۔''

آج بھی نانو میرے کمرہ میں میرے ہی پلنگ پر بیٹھی آپ کا خط پڑھ رہی تھیں جو میرے نام تھا۔ نہ جانے آپ کے خط میں کیا لکھا تھا جو پڑھتا رو تا جاتا۔

نانو تو یہ خط پڑھ کر بہت ہی روئیں۔ پھر چیخ کر کہا۔

''فہد میرے چاند کہاں ہو۔''

میں جلدی سے آگے بڑھا۔

''نانو میں یہ آپ کے پاس ہوں۔''

مگر نانو نے مجھے گلے نہیں لگایا۔ میری رائٹنگ ٹیبل پر رکھی میری تصویر اٹھالی۔

اسے کبھی سینے سے لگاتیں۔ کبھی پیار کرتیں۔ کبھی میری چھوٹی سی کرسی کو چومتیں۔

کبھی میری کپڑوں والی الماری سے سر ٹکراتیں۔

میں ڈر گیا۔ نانو پہلے کی طرح پھر بیمار نہ ہو جائیں۔ میں بھاگ کر نانو سے لپٹ گیا۔ مگر نانو کو معلوم بھی نہ ہوا کہ ان کا فہد ان کے پاس کھڑا ہے۔

جب نانو روتے روتے سو گئیں تو میں نے آپ کا خط ان کے تکیہ کے نیچے سے نکالا۔ اپنی رائٹنگ ٹیبل کے پاس کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ یہ آپ کا میری جانب پہلا خط ہے اور آخری بھی۔

اس خط کو پڑھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ آپ سب میری وجہ سے اتنے دکھی ہیں۔

نانو جی میں کوئی اپنی خوشی سے تو آپ سب کو چھوڑ کر نہیں آیا۔

اس شام میں بہت خوش تھا۔ اماں نے مجھے خود تیار کیا تھا۔ کیونکہ سات بجے لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے ہماری کالونی کے سب لوگ سیر کرنے چل پڑتے ہیں۔

جولائی میں میری آٹھویں سالگرہ ہوئی تھی۔ بابا نے مجھے نئی سائیکل خرید کر دی تھی۔ پہلے لان میں بابا کے ساتھ بیڈمنٹن کھیل میں جیت گیا۔ اماں بہت خوش تھیں۔

''دیکھا۔ میرا بیٹا اب فائنل میں بھی آپ کو ہرا دے گا۔''

پھر اماں، بابا، سبین سیر کرنے پیدل چل پڑے۔ میں سائیکل پر اپنے دوست کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

پھر میں نے اماں سے پوچھا۔

''اماں میں سائیکل آگے کرلوں''

اماں نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ میں آگے چلا گیا۔ اچانک سالار نے کہا۔

''فہد واپس چلو۔''

وہ واپس چلا گیا۔ میں نے کہا۔

''رکو۔ رکو۔ سالار۔''

پھر میں اپنی سائیکل کی چین ٹھیک کرنے لگا اور جب سائیکل پر سوار ہوا۔ ایک دھکا لگا۔ میں اچھل کر سڑک پر گرا۔ ایک بار آنکھیں کھولیں تو ڈرائیور کی گود میں جیپ میں تھا۔ ایک میجر انکل جیپ چلا رہے تھے۔

پھر میں نے دیکھا۔ سی۔ ایم۔ ایچ میں ہوں۔ اماں بابا گھبرائے ہوئے آئے۔ اسی وقت میرا سینہ پھڑکا۔ میری روح جسم سے نکل گئی میری آنکھیں کھلی تھیں۔ میری یہ آنکھیں اماں کو بہت پسند تھیں۔ اماں کہا کرتی تھیں:

''یہ میری آنکھیں ہیں واپس لے لوں گی۔''

سب کہتے تھے۔ میری شکل اماں سے ملتی ہے اور سبین کی بابا سے۔

اماں مجھے بہت محنت سے پڑھاتی تھیں۔ اسی لیے میں کلاس میں کبھی فرسٹ آتا، کبھی سیکنڈ۔

ان چھٹیوں میں ہم آزاد کشمیر بھی گئے پہلے بابا کے ایک دوست کے گھر ٹھہرے۔ ''وادی نیلم'' میں۔

آنٹی یاسمین مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ بابا اپنا کیمرہ گھر بھول گئے تھے۔ دریائے نیلم میں جب میں سبین کے ساتھ کھڑا تھا تو انکل نے میری تصویر لی۔

یہ تصویر میری آخری تصویر ہے جو ایکسیڈنٹ سے تین ہفتہ قبل کی ہے۔

سب کہتے ہیں اگر میجر انکل تیز جیپ نہ چلا رہے ہوتے تو میں بچ جاتا۔ ان کے ساتھ بیٹھے ڈرائیور نے جب مجھے اپنی گود میں اٹھایا تو میں نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اماں بابا کو دیکھنے کے لیے مگر میں انہیں نہ دیکھ سکا۔

''وادی نیلم'' سے ہم ''باغ'' خالد ماموں کے گھر گئے۔ تو میں بھاگا۔ نانو سے ملنے کے لیے۔ نانو اور سیما ٹی۔ وی دیکھ رہے تھے شام کا وقت تھا۔

میں نے آہستہ سے نانو کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے جب پلٹ کر دیکھا تو ''فہد جی'' کہہ کر اپنے سینے سے لگا لیا بہت پیار کیا۔ خاص کر میری آنکھوں پر نانو کہا کرتیں۔

''یہ تو میری نیلو کی آنکھیں ہیں جو تم نے چرالیں۔''

مجھے بھی نہیں معلوم تھا۔ اور نانو کو بھی نہیں معلوم تھا۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ صبح سات بجے سی۔ ایم۔ ایچ سے مجھے تابوت میں ڈال کر میرے گھر لایا گیا۔ تو میں حیران تھا۔

''اللہ۔ شام سات بجے میں اپنے گھر سے سائیکل پر سوار نکلا تھا۔ بابا کے حکم پر ''کیپ لفٹ'' ''کیپ لفٹ'' کے نعرے لگاتا ہوا۔ اب میں خاموش پڑا ہوں۔ سب رو رہے ہیں۔ ناہید خالہ، روحی خالہ، رومی مامی اماں کو چپ کرا رہی ہیں۔ ذیشان سہا ہوا رو رہا ہے۔ سبین سیما کے ساتھ اپنے کمرہ میں خاموش بیٹھی کبھی کبھی ٹھنڈا سانس لے کر کہتی ہے۔

''فہد میرا اکلوتا بھائی تھا۔''

باقی صفحہ ۱۱۷ پر ملاحظہ کیجیے

ایک روشن دِماغ تھا، نہ رہا

(کشمیری لال ذاکر: ایک خوش کردار انسان، ایک مستند نثر نگار اور ایک کامیاب شاعر)

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

۳۱۔اگست ۲۰۱۶ء کو آسمانِ ادب کا ایک درخشاں ستارہ ٹوٹ کر خلاؤں میں گم ہو گیا۔ جس شاہ اور بانکپن سے یہ خوش لباس، خوش گفتار اور خوش اطوار شخص اپنی زندگی جی رہا تھا اس سے لگتا تھا کہ یہ اپنی زندگی کے سو سال ضرور پورے کرے گا۔ لیکن افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور یہ اپنے ۹۸ ویں سال ہی میں اپنی بساطِ سخن سمیٹ کر اپنے مالکِ حقیقی سے جاملا اور اپنے پیچھے علم و ادب کے کئی بیش قیمت خزانے اپنی یادگار کے طور پر چھوڑ گیا۔

اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی میں لگ بھگ 140 کتابوں کے کثیر الجہت مصنف/مرتّب پدم شری کشمیری لال ذاکر کا شمار ہریانہ ہی نہیں بلکہ بھارت اور پاکستان کے صفِ اوّل کے اُدباء میں ہوتا ہے۔

ذاکر صاحب کی ولادت مورخہ ۷۔اپریل ۱۹۱۹ء کو شری گورداس رام جی کے یہاں موضع بیگا بانیاں (گجرات، حال پاکستان) میں ہوئی تھی۔ ان کے والد جموں کشمیر کی پونچھ ریاست کے راجہ کے ساتھ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ لہٰذا بچپن ہی میں انہوں نے ایک ایسے نظام کو دیکھا تھا جہاں ایک طرف حکم چلانے والے آقا تھا اور دوسری طرف معصوم اور بے زبان اکثریت جنہیں آئے دن کسی نہ کسی پاداش کے طور پر ظلم اور استبداد کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لہٰذا ان کے حسّاس اور دردمند دل کو یہ ناانصافی دیکھ کر بہت دھکا لگتا تھا۔ اور یہ خلش، یہ ذہنی اضطراب مستقل طور پر ان کے دل میں گڑ گیا اور ان کے اندر کے ادیب کو تحریک دینے لگا۔ لہٰذا اسی دور سے ہی انہوں نے اپنے مجروح جذبات و تاثرات کو نثر اور نظم میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔ یہ اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتے تھے یا اپنی ذات پر بھوگتے تھے اسی کو اپنے افسانے یا اشعار کے روپ میں ڈھال لیتے تھے۔ اپنے ایک شعر میں وہ خود کہتے ہیں کہ:

میں واقعات کو اتنا تراش دیتا ہوں
فسانے ہوتے نہیں ہیں فسانے لگتے ہیں

یوں تو ذاکر صاحب کے خزانۂ ادب میں نثری کتابیں زیادہ ہیں جن میں افسانے، ناول، ناولٹ، ڈرامے، خاکے، سفرنامے، اور کچھ دوسری زبانوں کے ترجمے ہی ہیں۔ لیکن اپنے ادبی سفر کا آغاز انہوں نے شاعری سے کیا تھا۔ ۲۴ سال کی عمر میں جب یہ جموں کے پرنس آف ویلز کالج میں طالب علم تھے اور کالج کے میگزین ''توی'' کے ایڈیٹر تھے ان کی پہلی غزل ''ادبی دنیا'' (لاہور) میں شائع ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۴۳ء کی بات ہے جب اُس وقت ریاست کے وزیر ترقیات نواب مرزا جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی جیسے اعلیٰ مرتبت شاعر اور جموں کشمیر سرکار میں سیکرٹری کے عہدے پر تعینات خواجہ غلام السیدین جیسے عالم اور دانش ور ان کے تخلیقی سفر کے رہنما تھے اور انہیں اپنے مفید مشوروں سے نوازا کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ ''کچھ اور چاہیے وسعت ترے بیاں کے لیے'' یعنی جو باتیں وہ کہنا چاہتے ہیں وہ اختصار میں نہیں کہہ سکتے۔ لہٰذا انہوں نے اُسی برس ایک کہانی لکھی ''الگ الگ راستے'' جب یہ ''ہمایوں'' (لاہور) میں شائع ہوئی تو انہیں بہت سے تعریفی خطوط موصول ہوئے جس سے انکی ہمت بڑھی اور پھر انہوں نے اپنی زیادہ تر توجہ نثر کی طرف دینا شروع کر دی اور عمر کے آخری حصے تک ان کا قلم رواں دواں رہا جس کے نتیجہ کے طور پر انہوں نے آٹھ افسانوی مجموعے، اٹھائیس ناول، دو ناولٹ، تین ڈراموں کے مجموعے، پانچ خاکوں کے مجموعے، تین شخصی افسانوں کے مجموعے اپنی یادگار کے طور پر اپنے قارئین اور مداحین کے لیے چھوڑے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے اکیس ناول، سات افسانوی مجموعے اور دو ڈرامے، ہندی میں اور دو ناول پنجابی رسم الخط میں بھی ڈھالے جاچکے ہیں اور دو درجن سے زائد کتابیں کچھ دیگر اہم موضوعات پر بھی دستیاب ہیں۔

ذاکر صاحب کی ان سب تصانیف کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان سب کے موضوعات واقعاتی اور تاثراتی ہیں جیسے تقسیم ملک، ہندو پاک دوستی، نوجوانوں کے مسائل، خواتین کے مسائل، بوڑھوں کے مسائل، خشک سالی، نشہ بندی، بے روزگاری اور قومی یک جہتی وغیرہ۔ ان کی ہر تخلیق میں جہاں ہمارے معاشرے کی تلخ و شیریں جھلکیاں نظر آتی ہیں وہیں امن و آشتی اور صلح و دوستی کا پیغام بھی نمایاں ہے۔

ان سبھی تخلیقات کی بھرپور پذیرائی کی گئی اور ذاکر صاحب کو متعدد قومی و بین الاقوامی انعامات و اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ با ایں ہمہ انہوں نے نثر کے ساتھ ساتھ اپنا شعری سفر بھی برقرار رکھا اور ان کی حیات ہی میں ان کے تین شعری مجموعے ''الفاظ بولتے ہیں''، ''شیشہ بدن خواب'' اور ''عکسِ رخِ گلبدن'' ہی شائع ہو چکے تھے۔ قطعات کا ایک اور مجموعہ بھی انہوں نے تیار کر لیا تھا جسے بعد از مرگ اب ان کی دختر نیک اختر ڈاکٹر مس کملیش موہن یقیناً منظرِ عام پر لائیں گی۔

دراصل میدانِ ادب ہو یا کھیل کا میدان، اکثر اوقات کوئی کھلاڑی یا قلم کار کوئی اور فنکار اپنے اپنے فن کی ایک سے زیادہ اصناف میں اپنے ہنر دکھاتا ہے اور ان میں مہارت بھی حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن جس شعبے میں وہ نسبتاً زیادہ ماہر ثابت ہوا اس کی پہچان اسی کے ساتھ منسلک ہو جاتی ہے اور دوسری اصناف میں اس کی حصول یابیاں دب کر رہ جاتی ہیں۔ ذاکر صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ چونکہ ان کا زیادہ تر ادبی سرمایہ نثر ہی میں ہے اس لیے بہت سے مشاہیر کو تو خوشگوار حیرت بھی ہوئی تھی جب پہلی بار ان کا کلام سن کر یا پڑھ کر انہیں معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب ایک کامیاب شاعر بھی ہیں۔ گو حقیقت تو یہ بھی ہے کہ ان کی کہانیوں میں

بھی بلا کی شعریت موجود ہے۔انہوں نے خود بھی اس کا دعویٰ کیا ہے:

جب غزل پر گفتگو ہو گی تو اک نقّادِ فن
میرے افسانوں کی کچھ آب و ہوا لے جائے گا

اپنے شعری سرمایے میں انہوں نے خصوصی طور پر غزل اور قطعہ پر طبع آزمائی کی ہے۔

ذاکر صاحب کے اشعار کے موضوعات ان کے شدید ذاتی تاثرات پر مبنی ہیں جن میں ان کے بے چین دل اور عمیق ذہن کا ردِعمل اور ان میں گونا گوں واقعاتی کیفیات کی جلوہ گری صاف نظر آتی ہے جسے انہوں نے نئے شعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان میں ان کے فکری اور ذاتی انکشافات کی تازگی ہمیشہ موجود رہتی ہے۔غرضیکہ ان میں زمانۂ حال کی جذباتی، ذہنی، عملی وفکری زندگی اور عصری حسیّت کے کم وبیش تمام پہلوؤں کی ترجمانی کے نقوش ملتے ہیں۔ان کی نثر کی طرح ذاکر صاحب کی شاعری میں بھی احساس کی شدت، جذبے کا خلوص اور شعور کی بلندی ہے۔کئی جگہوں پر ان کے دھیمے لہجے، سادگی اور نشریت سے جو فضا ابھرتی ہے وہ قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ان کے مزاج میں ایک ٹھہراؤ، توازن اور جذبۂ ہمدردی کے ساتھ ساتھ دردمندی اور خیر سگالی کا احساس بھی قومی ہے۔

ذاکر صاحب صرف حسنِ اظہار کے لیے ہی نہیں بلکہ حسنِ فکر کے معاملے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔عصرِ حاضر کے تقاضوں کی ترجمانی کرتے ہوئے انہوں نے نہ صرف اپنی شاعری کو رفعتوں سے آشنا کیا ہے بلکہ اردو شاعری کو نئی سمت بھی دی ہے۔ان کی اہمیت، ان کی فکر کی صداقت اور لہجے کی انفرادیت سے عبارت ہے۔اسی لیے ان کے فن میں جو رچاؤ اور تہہ داری ہے وہ بھی خاصے کی چیز ہے۔

ان کے اشعار میں ایک نیا آہنگ ملتا ہے جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔خود فرماتے ہیں:

میں جس خیال سے سنورا ہوں۔کون سنورے گا؟
میں جس خلوص سے نکھرا ہوں۔کون نکھرے گا؟
کسی کو ہے بھی سلیقہ چمن میں جینے کا؟
میں جس خلوص سے بکھرا ہوں۔کون بکھرے گا؟

دراصل ان کی نگارشات میں ان کے ذاتی کردار کا بہت دخل ہے۔ایک بار میرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا کہ ''اگر انسان خود اچھا نہیں ہے تو وہ اچھا ادب بھی پیدا نہیں کرسکتا۔''

ذاکر صاحب ایک وفا شعار خاوند، ایک شفیق باپ اور ایک پُرخلوص اور پرتپاک دوست تھے۔۱۹۴۲ء میں ان کی شادی ہوئی۔یہ اپنی شریکِ حیات (محترمہ شیلا موہن) سے والہانہ عشق کرتے تھے۔لیکن کچھ سالوں کے بعد ہی وہ انہیں داغِ مفارقت دے گئیں تو اپنے مجروح جذبات اور شدید دلی کرب کو انہوں نے اپنے تاثراتی ناولٹ ''سیندور کی راکھ'' میں اُنڈیل دیا۔(اس ناولٹ کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے تھے) اُس وقت یہ خود ابھی چالیس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے اور ان کی سب سے چھوٹی بیٹی ابھی کچھ ماہ کی ہوئی تھی۔لیکن اپنی والدہ کی مسلسل تلقین کے باوجود انہوں نے دوبارہ شادی نہ کی اور عمر بھر اپنے درد کو اپنی تخلیقات میں ڈھال کر ایک طرف لوح وقلم کی اور دوسری طرف اپنے بچوں کی پرورش اور پرداخت کرنے میں منہمک رہے۔

ان کے حسنِ اخلاق کی ایک اہم اور لائقِ تحسین بات یہ بھی ہے کہ گو انہوں نے کئی رومانی افسانے اور ناول بھی لکھے جن میں عورتوں اور لڑکیوں کے مختلف مسائل پر مبنی کئی کردار بھی پیش کیے ہیں۔لیکن کہیں بھی انہوں نے کوئی ایسا ایک بھی جملہ تحریر نہیں کیا اور نہ ہی کوئی ایسا منظر پیش کیا جس سے قاری کے جنسی جذبات مشتعل ہوتے ہوں۔ان کی زبان نہایت شستہ، شائستہ اور پاکیزہ ہے۔یہ ایک صالح ذہن رکھتے تھے اور عورت کے ہر کردار میں اُسے عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ان حقائق کی روشنی میں آیئے ذرا ان کی شاعری کی پُرکیف وادیوں کی سیر کریں اور آپ خود جائزہ لیں کہ وہ اپنی ذاتِ صفات کو کسی حد تک اپنے اشعار میں ڈھالنے میں کامیاب ہوئے ہیں:

تاریک مکانوں سے ابھرتے ہوئے سائے
سورج کو بھی آنگن میں اُترنے نہیں دیتے
احباب کی خاطر تو میں سولی پہ چڑھا ہوں
احباب ہی سُولی سے اُترنے نہیں دیتے

اے لکھنے والے! اور بھی کوئی کتاب لکھ
اس میں زمانے بھر کے دُکھوں کا حساب لکھ
لمحوں سے کچھ سوال کیے ہیں عوام نے
ان پر ذرا سا سوچ اور ان کے جواب لکھ

جب نہ دو وقت کی روٹی کو کوئی ترسے گا
کیسی ہوں گی وہ رُتیں؟ کیسے زمانے ہوں گے!!

یہ اور بات کہ آگے ہوا کے رکھے ہیں
چراغ رکھے ہیں جتنے، جَلا کے رکھے ہیں
نظر اٹھا کے انہیں ایک بار دیکھ تو لو
ستارے پلکوں پہ ہم نے سجا کے رکھے ہیں

غم کسی یُگ کی، کسی دین کی میراث نہیں
غم تو خوشبو ہے اسے دل میں بساتے رہیے
دشت میں پھول کھلیں گے تو بہار آئے گی
آرزوؤں کی نئی فصل اُگاتے رہیے
ہم کوئی چاند کہیں بھی اُٹھالائیں گے
آپ دیواروں کو بس اونچا اُٹھاتے رہیے!

میری خوشبو، میرا غم، میری دعا لے جائے گا
سوچتا ہوں میرے گھر سے کوئی کیا لے جائے گا!

مجھ سے رخصت ہوگا تو اپنی حفاظت کے لیے
باندھ کر آنچل میں وہ میری وفا لے جائے گا
جئیں گے تازہ گلاب بن کر۔ یہ طے ہُوا تھا
مریں گے خوشبو کا خواب بن کر۔ یہ طے ہُوا تھا
نہ تم سے کوئی سوال ہوگا عنایتوں کا
سُنوں گا سب کچھ جواب بن کر۔ یہ طے ہُوا تھا
جو راستے میں طویل صحرا پڑا تو ہم بھی
سفر کریں گے سراب بن کر۔ یہ طے ہُوا تھا
یہ فیصلہ تھا، پڑھوں گا تُم کو، لکھوں گا تم کو
رہوگے میری کتاب بن کر۔ یہ طے ہُوا تھا

قطعات

میرے کچھ حادثوں کی بنیادیں
میرے احساس کے کچوکے ہیں
یہ ہیں وہ وار جو کبھی میں نے
رُوح کے آئینے پہ روکے ہیں

روشنی کی کرن ، کرن کے لیے
غم کی تاریک رات دیتی ہے
زندگی ایک قہقہہ دے کر
آنسوؤں سے حساب لیتی ہے

بڑی شفیق، بڑی غم شناس لگتی ہیں
تمہارے شہر کی گلیاں اداس لگتی ہیں
وہ دردمند نگاہیں جو چھین گئیں مجھ سے
کبھی کبھی تو مجھے آس پاس لگتی ہیں

مرے عزیزو! مرے دوستو! مرے یارو!
قلم کا رشتہ بہت ہی عظیم رشتہ ہے
یہ رشتہ جو کہ امانت ہے اپنے کلچر کی
بڑا ہی پاک، بڑا ہی قدیم رشتہ ہے

بڑی اُداسے، بڑے بانکپن سے آئے ہیں
حسین چہروں کی ایک انجمن سے آئے ہیں
ہمارے پاس ہیں شبنم کے، چاندی کے پیام
ہمیں ملو کہ ہم اُس کے وطن سے آئے ہیں

میں نے ذاکر! ساٹھ برس سے اس گلشن کو سینچا ہے
قطرہ قطرہ خون دیا ہے، سرو سمن کو سینچا ہے
یارو! مجھ سے میری حکایت کیا پوچھو ہو، رہنے دو
میں نے قلم کے دریاؤں سے وادیٔ فن کو سینچا ہے

کبھی جو ہم نے جلائے تھے دوستی کے چراغ
وہی چراغ میں پھر سے جلانے آیا ہوں
تمہارے دوست تمہیں اب بھی پیار کرتے ہیں
مرے عزیزو! تمہیں یہ بتانے آیا ہوں

دو گھڑی دن میں چھپ تو جاتے ہیں
چاند تارے فنا نہیں ہوتے
جن کے سینے میں درد جلتا ہے
وہ کبھی بے وفا نہیں ہوتے

ذاکر صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور مختلف اوقات پر وہ کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اپنی عمر کی دسویں دہائی میں بھی یہ ہریانہ اُردو اکادمی کے سیکرٹری اور پھر ڈپٹی چیئرمین بھی رہے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اپنی منصبی اور خانگی مصروفیات اور فرائض کو بخوبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ یہ آخری دم تک اپنے ادبی سفر میں کس طرح اس قدر فعال اور رواں دواں رہے! اس راز کو انہوں نے اپنے ایک افسانوی مجموعہ ''اے ماؤ! بہنو! بیٹیو!'' کے آخری صفحہ پر کسی حد تک افشاں کیا ہے:

''اب تو میں اتنی زیادہ کتابوں کو جنم دے چکا ہوں کہ اب کسی بڑی کتاب کو جنم دینا کٹھن لگتا ہے۔ لیکن جب تخلیق کا درد اُٹھتا ہے جس کی کیفیت دردِ زہ کی سی ہوتی ہے تو جسم و ذہن اذیت سے شل ہونے لگتے ہیں۔۔۔''

اور یہ ''دردِ زہ'' آخری وقت تک ان سے لپٹا رہا۔ دراصل ہمیشہ ایک صحت مند نظریہ کے قائل رہے جو عمر کو ذہن پر حاوی نہیں ہونے دیتا تھا لیکن ''موت سے کس کو رستگاری ہے؟'' اور آخرِ کار مےخانۂ علم و ادب کا یہ دیرینہ بادہ کش بھی ہم سے بچھڑ گیا اور خدا جانے کہ اب:

''دِگر دانائے راز آید کہ ناید!''

''ہوس کے بندے''

فی زمانہ کرۂ ارض پر جتنی خوراک پیدا ہو رہی ہے وہ دس ارب انسانوں کی بھوک مٹانے کے لیے کافی ہے جبکہ دنیا کی آبادی صرف سات ارب نفوس پر مشتمل ہے۔ اس کے باوجود کروڑوں لوگ غذائی قلت کا شکار ہیں۔ اس کی وجہ اور جواز کو کھل کر بیان کرنا ضروری نہیں۔ بس اتنا سمجھ لیجیے کہ چند لوگوں کے اجارے نے جس طرح انسانی زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے عین اُسی طرح خوراک کے قابضین نے بھی انسانی بھوک کو کمائی کا ذریعہ بنا کر لاکھوں کروڑوں نہیں اربوں انسانوں کو حرص و ہوس کا شکار بنائے ہوئے ہیں۔

☆

''دھرتی دامان''

مظلوماں دی واج

بیاء جی
(لاہور)

اج آ کھاں وارث شاہ نوں، سُن مظلوماں دی واج
دن دیوں ڈاکے وجدے، اتے کرن لٹیرے راج

سُن ماں بولی دیا وارثا، گونگا تیرا پنجاب
تیری رہتل جیُوندی مرگئی، سانوں بھُل گئی ہیر کتاب

رانجھے دی ٹُٹی ونجھلی، بھُل گئے عشق دے گیت
اج باراں بیلے سُنج نیں، کوئی میت ملے نہ پریت

اج ہوئی اُجاڑ ترنجنیں، سب سکھیاں نیں بے چین
لُوں لُوں وچ ڈیرے ہجرے دے، لہو سُٹن میرے نین

سُن حُسن عشق دیا وارثا، اج عشق ہوس داناں
لائی بیٹھے تھاں تھاں پھاہیاں، چڑیاں دے ویری کاں

میرے وارث اج وی ہیر دا، نہیں چلدا کوئی وس
لے بیٹھا کیدو لنگڑا، کی کرے بیاء جی دس

○

اوہ تھاہنہ

حنیف باوا
(جھنگ)

اوہ تھاہنہ جتھے
سنگھنے رکھاں کولوں
ٹھنڈیاں چھاواں کھوہ کے
دھپ وچھائی جاوے
جتھے سُکھ دے آہلنیاں چوں
تنکے کھس کے
پیراں ہیٹھ مدھولے جاون
جتھے ٹھنڈی وا دے بُلے
بھنگڑا پاون لگیاں ڈولن
مورناں جتھے
کھل کے پیلاں پاواں
نان نچن
جیہڑی تھانویں
بھولیاں چڑیاں
آپ ہدریاں وانگوں چہکن ناں
طوطے جتھے
گُٹکن لگیاں
تھر تھر کمبن
گھگی جتھے
آزادی دے گیت الاون لگیاں
ڈور بھوریاں وانگوں
ایدھر اودھر تکی جاوے
جتھے
پانی وی
اپنی پکی ریت نوں چھڈ کے
اُلٹے رخ نوں وگدا جاوے
گل کی جتھے
ونجلی دے مٹھے سُر وی
کوڑے لگن
اوتھے سمجھو
سُچے آدم ذات دی تھانویں
بندیاں ورگی
کالیاں روحاں والی
کسے ہور مخلوق دا پیرا اے

111

باس زندہ، ذلت باقی

ایس۔ایم۔معین قریشی
(کراچی)

آپ مٹی کی ایک مورتی بنائیں، بن جائے گی۔آپ اسے''باس'' کا نام دیں، اس کی گردن فوراً اکڑ جائے گی۔حالات کا تیار کردہ باس ایسا''پِیس'' ہوتا ہے جو منجملہ دیگر خبائث کے اپنی زبان کو آرام اور کانوں کو کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔اُس کے سر میں دماغ کی جگہ بھیجا ہوتا ہے جسے وہ سوچنے کے بجائے ماتحتوں کو نوچنے میں لگا دیتا ہے۔یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے کہ باس جیسی مخلوق کی کھوپڑی میں ہوتا کیا ہے__ بھیجا، بُھس یا بھکسا (سڑا ہوا آٹا)؟ یہ سب کچھ ہم اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ رہے ہیں اس لیے کہ سرکاری نوکری میں ہم 36 سال باس کی تہمت سر پہ لیے پھرے لیکن چونکہ ہر باس کا ایک باس ہوتا ہے اس لیے ماتحتی کی ہزیمت بھی بخوشی برداشت کرتے رہے۔اگر اپنے باس کے سامنے اپنی خودی کو ایک انچ بھی بلند کرنے کی کوشش کرتے تو۔۔۔ہماری داستاں تک بھی نہ ہوتی داستانوں میں۔

ہم نے ملازمت (بلکہ زندگی) کا بڑا حصہ تعلقات عامہ میں گزارا اور اسی لیے باس کے لیے تقریریں، رپورٹیں، پیغامات وغیرہ لکھنا ہمارے فرائض منصبی اور ان کی ذاتی تشہیر کا خاطر خواہ بندوبست کرنا فرائض غیر منصبی میں شامل تھا۔ایک روز خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ باس نے ایک سیمینار میں کلیدی خطاب (Key-note address) کے لیے ہمیں بیس منٹ کی تقریر لکھنے کا حکم عنایت کیا۔ہم نے حسبِ توفیق بڑی محنت سے ایسی تقریر لکھی جس میں بار بار اُن سے''میری رائے میں''، ''میرے نزدیک''، ''میں سمجھتا ہوں'' کہلوایا تا کہ سامعین پر ان کے علم و دانش کی دھاک ایسی بیٹھے کہ اٹھنے کا نام نہ لے۔ہم نے احتیاطاً تقریر کی تین کاپیاں تیار کر کے انہیں دے دیں کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ سیمینار کے شرکا میں سے چند ایک قدر دان ضرور ایسے پُر مغز خطاب کی نقل ان سے لینی چاہیں گے۔

تاہم جب وہ سیمینار سے واپس لوٹے تو آتے ہی ہماری پیشی ہوگئی۔ہم نے دیکھا کہ موصوف بھنّائے ہوئے تھے۔ہم نے ڈرتے ڈرتے، تھوک نگلتے ہوئے ان سے پوچھا''سر، آپ کا خطاب لوگوں کو پسند آیا؟''ہم پر آنکھیں نکالتے ہوئے گرجے''آپ کو کس گدھے نے ڈائریکٹر تعلقات عامہ بنایا تھا؟''ہم جواب دیتے تو ان کا راز فاش ہوتا لہٰذا اپنا پہلا سوال دہرایا۔اب وہ چنگھاڑے''آدھے نالائق میرے خطاب کے دوران اونگھ رہے تھے۔جو بدبخت جاگ رہے تھے وہ ایک ایک کر کے باہر نکلتے رہے۔خطاب کے دوران مجھے اسٹیج پر سے تین پرچیاں ملیں۔پہلی میں ڈائس چھوڑنے کی التجا، دوسری میں نصیحت اور تیسری میں دوٹوک ہدایت کی گئی تھی۔ پھر چوتھی پرچی سامعین کی طرف سے آئی جس میں ایک ایسا مصرع لکھا ہوا تھا جس کا کوئی جواز نہ تھا۔''ہم نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے سوال کیا''سر، وہ مصرع کیا تھا؟'' کہنے لگے''کسی احمق نے لکھا تھا ع سنگ ہر شخص نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے۔بھلا اس کی وہاں کیا تُک تھی؟لیکن آپ نے اپنی تحریر کے اتنے ڈنکے پیٹ دیے تھے کہ پرچیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں اسے پوری پڑھے بغیر وہاں سے نہیں ہٹا۔'''' پھر کیا ہوا، سر؟'' ہماری آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ہم پوچھنا یہ چاہ رہے تھے کہ''یہ کیوں ہوا، سر؟'' انہوں نے اندھا دھند فائرنگ جاری رکھتے ہوئے جواب دیا''پھر یہ ہوا کہ اُن ناہنجاروں نے میرے بیٹھنے کے بعد سیمینار ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔'' ہم ہارے یعنی مار کھائے ہوئے باکسر کی طرح باس کے سامنے سے اٹھنے لگے تو انہوں نے پانی حلق سے اتارتے ہوئے ہمیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔پانی پی کر وہ کچھ ٹھنڈے پڑے تو ہماری مخدوش حالت کے پیش نظر اپنے غصے میں ایک درجہ کمی کرتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں گویا ہوئے''آپ نے ایک گھنٹے کی تقریر کیوں لکھی تھی؟ میں نے آپ کو واضح طور پر بتایا تھا کہ منتظمین نے مجھے صرف بیس منٹ دیے تھے۔'' یہ سن کر تو ہم بوکھلا گئے لیکن چونکہ بلاوجہ عزت پر حرف آ رہا تھا اس لیے جان کی امان پاتے ہوئے ان سے عرض کیا''سر، میں نے تو بیس منٹ ہی کی تقریر لکھی تھی۔آپ کو دو اضافی کاپیاں اس لیے دی تھیں کہ مبادا ان کی ضرورت پڑ جائے لیکن معلوم ہوتا ہے آپ نے وہ تینوں کاپیاں پڑھ دیں۔'' ہماری وضاحت نے ان کی طبیعت کو مزید مکدّر کر دیا۔نتیجہ: ہمارے مقدر کی ایک اور ناحق معذرت جو ہم نے کلیجے پر پتھر رکھ کر کی اور ان سے جان چھڑائی۔

نامور امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ (Robert Frost) نے کہا تھا''روزانہ آٹھ گھنٹے پوری جانفشانی کے ساتھ کام کریں تو ایک نہ ایک دن آپ باس بن جائیں گے...پھر آپ کو بارہ گھنٹے روزانہ کام کرنا ہوگا۔'' اس دقیانوسی مشورے پر ہم یہی تبصرہ کریں گے کہ ع اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔آج کا باس کام سے زیادہ''جام'' پر توجہ مرکوز رکھتا ہے۔کام کرنے کے لیے اس کے ماتحت کیا کم ہیں۔ نیویارک شہر کی''پرندہ مارکیٹ'' میں ایک دکان میں بڑے سے پنجرے میں آہنی سلاخ پر تین طوطے برابر برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ایک گاہک نے دکاندار سے پوچھا''بھائی جان، یہ دائیں ہاتھ والا طوطا کتنے کا ہے؟''
''پانچ سو ڈالر کا۔'' گاہک قیمت سن کر اچھل گیا اور یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ آخر اس میں ایسی کیا خوبی ہے جو یہ اتنا مہنگا ہے۔دکاندار نے بتایا کہ اسے شیکسپیئر کے پانچ ڈرامے ازبر ہیں۔آپ اپنا خالی وقت اس کے ساتھ آسانی سے گزار سکتے ہیں۔''اوکے'' گاہک نے اگلا سوال کیا''اور یہ جو بائیں طرف بیٹھا ہے، اس کی کیا قیمت ہے؟''''سات سو ڈالر'' گاہک کو دوسرا جھٹکا لگا۔اس طوطے کے اوصاف پوچھنے پر دکاندار نے بتایا''یہ ورڈز ورتھ کا حافظ ہے۔اس کی صحبت میں آپ اپنے شعری ذوق کی نہ صرف تکمیل کر سکتے ہیں بلکہ اسے جلا بھی بخش سکتے ہیں۔'' گاہک کی دلچسپی سودے میں بڑھتی جا رہی تھی۔اس نے دکاندار سے کہا''لگے ہاتھوں اس بیچ والے گُم صُم کے دام بھی بتا دو تا کہ میں کوئی فیصلہ کر سکوں۔ یہ کیا کرتا ہے اور کن

اوصاف کا مالک ہے؟'' دکاندار نے مطلع کیا'' یہ آپ کو ہزار ڈالر کا پڑے گا ۔جہاں تک اس کے کام اور اوصاف کا تعلق ہے، سچی بات یہ ہے کہ میں نے اسے کبھی کچھ کرتے نہیں دیکھا لیکن یہ خود کو ان دونوں کا باس قرار دیتا ہے۔'' آسکر وائلڈ(Oscar Wilde) نے بڑے پتے کی بات کہی تھی'' کام تو وہ لوگ کریں جن کے پاس کچھ اور کرنے کو نہ ہو۔''

ایک دن ہمارے صاحب بہادر اچھے موڈ میں تھے ۔ہم نے بڑے ارمانوں سے انہیں اپنی ایک پورٹریٹ دکھائی جو شہر کے سب سے مشہور اور سب سے مہنگے فوٹو گرافر سے بنوائی گئی تھی۔'' کیا کہنے!'' باس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور ہماری آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔انہوں نے اپنی بات آگے بڑھائی'' بعض لوگ دیکھنے میں بہت خوبصورت ہوتے ہیں مگر ان کی تصویر نحوست زدہ آتی ہے۔ ماشاءاللہ آپ کے ساتھ اس کا اُلٹ ہوا ہے۔'' ایسی سچوایشن کے لیے سلمیٰ آغا ایک برمحل نغمہ گا چکی ہیں۔۔۔دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے۔ہم بھی زیرِ لب یہی گنگناتے ہوئے واپس آئے اور اپنی سیٹ میں ڈھے گئے۔کامیاب باس بننے کے لیے ازحد ضروری ہے کہ آپ کی زبان شائستگی سے عاری ہو۔جتنی تیزی سے آپ کی زبان اخلاق اور تمیز سے دور ہوگی اتنی ہی آپ کی ترقی کی منزل قریب تر ہوتی جائے گی۔زبان بگاڑنے کے لیے ازحد ضروری ہے کہ آپ ٹی وی کے ٹاک شوز باقاعدگی سے دیکھنے کا اہتمام کریں۔ایک دفعہ آپ کی بدزبانی کا سکہ جم گیا تو آپ کے پو بارہ ہو جائیں گے۔پھر آپ کو پارلیمنٹ سے خصوصی خطاب اور دھرنوں میں مقررین کی تربیت کے لیے مدعو کیا جانے لگے گا۔ بگ باس بننے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ کی حماقت پر ذہانت کی چھاپ لگانے والوں کا ایک جتھہ اور آپ کے بے ہنگم لطیفوں پر قہقہے لگانے والوں کا ایک''طائفہ'' ہر وقت آپ کو حاضر اسٹاک میں دستیاب ہوگا لیکن اچھی طرح سمجھ لیں کہ جب آپ ریٹائر ہو جائیں گے تو یہی قوال صفت لوگ آپ کو آپ کے منصب جلیلہ سے گرا کر''منصب ذلیلہ'' پر لے آئیں گے۔عالی جناب، سر، جناب والا، عالی مرتبت کہنے اور لکھنے والے آپ کو صہبا اختر کے الفاظ میں یوں یاد کیا کریں گے۔

سخت بے توقیر تھے وہ لوگ میں صہبا جنہیں
مرشدی، مولائی، آقا، محترم لکھتا رہا

بعض چنٹ قسم کے ملازمین اپنے باس کی''چاپنا چھاپ''، یعنی دو نمبر کی فہم و فراست سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ 2012ء کی بات ہے۔ایسے ہی ایک چکر باز نے اپنے باس سے تنخواہ میں اضافے کی درخواست کی۔''تنخواہ میں اضافہ؟'' باس بدک اٹھا''تم پورے سال آفس میں نظر نہیں آئے اور تنخواہ میں اضافہ چاہتے ہو؟''

''سر، میری عرض تو سنیے'' اہل کار نے اظہار عاجزی کیا۔

''ہاں بکو۔''

''سر، سال میں 365 دن ہوتے ہیں نا؟''

۔۔۔پھر؟''

''سر، یہ لیپ کا سال تھا اور آج سال کا آخری دن ہے اس لیے کُل دن ہو گئے 366، ٹھیک؟''

''آگے چلو۔''

''سر، ہم آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں یعنی ایک تہائی دن۔ یہ بنے سال میں 122 دن۔''

''کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''سر، اتوار کو آفس بند رہتا ہے اس لیے 122 میں سے 52 دن نکال دیجیے۔اب بچے 70 دن۔''

''چلو بچ گئے۔''

''سر، ہم عید، بقر عید اور محرم کی دو دو جبکہ یوم میلاد النبیؐ، یوم پاکستان، یوم آزادی، یوم مئی، کرسمس/قائداعظم کا یوم پیدائش کی ایک ایک چھٹی کرتے ہیں۔یہ ہوئیں کل 11 چھٹیاں لیکن ہماری بدقسمتی کہ سال میں کم از کم تین عام تعطیلات اتوار کے دن ضرور آ جاتی ہیں لہٰذا اصل غیر حاضری ہوئی 8 دن کی۔ 70 میں سے 8 نکال دیجیے رہ گئے 62۔''

''میں نے مانا'' باس نے ملازم کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''سر، ہم سنیچر کو آدھے دن کام کرتے ہیں۔ سال میں 52 سنیچر ہوتے ہیں لہٰذا 62 میں سے 26 دن منہا کر دیجیے۔باقی رہے 36۔''

''اچھا'' باس ملازم کے گورکھ دھندے میں بری طرح پھنس چکے تھے۔

''سر ہم سال میں 20 اتفاقی(Casual) اور 15 استحقاقی (Earned) چھٹیوں کے مستحق ہیں۔یہ ہوئیں کل 35 چھٹیاں۔ 36 میں سے 35 گھٹا دیجیے اب بچا صرف ایک دن۔سر، میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں نا؟

باس نے دانشورانہ انداز میں اپنا چشمہ آنکھوں پر سے اتارتے ہوئے کہا''تم تحریری درخواست دو، میں غور کروں گا۔''

کوئی تو ہے

کوئی تو ہے جو زندگی کو خوشگوار رکھتا ہے
کوئی تو ہے جو اِس کو کبھی ناگوار رکھتا ہے
اور جب کبھی مصائب و آلام گھیر لیتے ہیں
کوئی تو ہے جو حوصلے کو برقرار رکھتا ہے

حافظ محمد احمد
(راولپنڈی)

ایک صدی کا قصّہ

وحیدہ رحمان

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

وہ چار بہنیں تھیں۔باپ ایک آئی ایس آفسر تھا۔تین ایک دم موٹی تازہ تھیں، جب کہ چوتھی ایک دم کگڑی سی تھی۔وہ تینوں اسکول جایا کرتی تھیں جب کہ چوتھی کو وہ اپنے ساتھ لے کے نہیں جاتی تھیں۔وہ گھر میں ہی پڑی رہتی تھی۔بیٹھا بنیا کیا کرے۔اس کوٹھی کے دھان اُس کوٹھی میں دھرے۔اس مثل کے مصداق وہ بھی اپنی بوریت مٹانے کے لئے آئینے کے سامنے جاکر کھڑی ہو جاتی تھی اور پھر آڑے ٹیڑھے منہ بنالیتی تھی۔ایک دن اُسکے باپ نے اُسے آئینے کے سامنے منہ بناتے دیکھا تو اُس نے فکرمند ہو کے اپنی بیوی سے کہا کہ میری بات یاد رکھنا ایک دن یہ لڑکی پاگل ہو جائے گی۔صبح سے شام تک وہ گھر میں پڑی رہتی ہے۔میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ آئینے کے سامنے آڑے ٹیڑھے منہ کیوں بنالیتی ہے؟ اُسکی بیوی اس لڑکی کی حرکتوں سے خود حیران و پریشان تھی۔وہ بھی نہیں جانتی تھی کہ یہ لڑکی ایسی حرکتیں کیوں کرتی ہے۔اس کا جواب ایک دن خود اس لڑکی نے اپنے باپ کو دیا۔اُسنے اپنے باپ سے کہا۔''ڈیڈی میں فلمی ادا کار بننا چاہتی ہوں۔آپ دیکھ لینا ایک دن میں لوگوں کو اپنی اداؤں سے کسطرح ہنساؤں گی اور رلاؤں گی۔آپ دیکھتے رہ جائیں گے۔میں دعوے کے ساتھ کہتی ہوں کہ ایک دن میری تصویریں یہاں کے تمام اخباروں اور میگزینوں میں چھپ جایا کریں گی۔''

اُسکا باپ آزاد خیال اور ترقی پسند آدمی تھا۔اُسنے اُس زمانے میں اپنی چاروں بیٹیوں کو بھارت ناٹیم ڈانس سیکھنے کی تحریک دی جب کہ ہندو بھی اپنی لڑکیوں کو گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ایک دن کیا ہوا کہ جب اُسکا باپ جو کہ ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائض تھا اور وشا کھا پٹنم میں طعینات تھا، ہندوستان کے پہلے وائسرائے سی گوپال آچاریہ وشا کھا پٹنم کے دورے پر آگئے۔اتنی بڑی ہستی کے اعزاز میں ایک کلچرل پروگرام کا انعقاد کیا گیا جسمیں ایم ایس شوبھ لکشمی اور کملا لکشمی کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی درخواست کی گئی۔اسی بیچ اُنہیں سی گوپال آچاریہ کا ایک تار ملا جسمیں اُنہوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اسٹیج پر مقامی فنکاروں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔سرکاری عملے میں کھلبلی مچ گئی۔اُنہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لوکل ٹیلنٹ کہاں سے لائیں۔اس ہڑبڑاہٹ میں رحمان صاحب کے سینئر نے اُن سے کہا کہ آپ کی لڑکی بھارت ناٹیم ڈانس جانتی ہے نا۔آپ اُسے کیوں نہیں بلاتے۔رحمان صاحب نے کہا کہ وہ ابھی سیکھ رہی ہے اور وہ پیشہ ور ڈانسر نہیں ہے۔سینئر نے کہا تو کیا ہوا، وہ ڈانسر تو ہے نا۔وائسرائے صاحب مقامی کلاکاروں کو اسٹیج پر دیکھنا چاہتے ہیں۔اُسے بلائیں۔رحمان صاحب نے اپنی دو بیٹیوں کو بلا کر اُنہیں اسٹیج پر پروگرام پیش کرنے کے لئے کہا۔جب اُنہوں نے اپنا پروگرام پیش کیا تو ہال میں بیٹھے سبھی مدعوین ناچ دیکھ کے جھوم اُٹھے۔اناؤنسر نے جب اُنکا نام لے کر اُنہیں ناظرین سے متعارف کرایا تو وائسرائے حیران ہو کے بولے کہ نام سے تو یہ مسلم لڑکیاں لگتی ہیں۔تبھی کسی نے اُنکے والد کو اُنکے سامنے پیش کیا۔وائسرائے نے اُنکے والد کو مبارک باد دی اور تعجب سے بولے کہ اُنہیں یقین ہی نہیں آتا کہ مسلم لڑکیاں اس خوبی اور مہارت کے ساتھ بھارت ناٹیم پیش کریں گی۔اُسنے دونوں لڑکیوں کو انعام و اکرام سے نوازا۔اگلے روز لڑکیوں کی تصویر وائسرائے کے ساتھ چھپ گئی۔اُس دبلی پتلی سی لڑکی نے اپنے باپ سے کہی ہوئی بات سچ کر دکھائی۔یہ لڑکی کوئی اور نہیں بلکہ وحیدہ رحمان تھی۔

وحیدہ رحمان کا جنم 3 فروری 1938 کو چنگل پیٹھا (تامل ناڈو) کے ایک دکنی مسلم گھرانے میں ہوا۔والد رحمان صاحب ضلع کمشنر کے عہدے پر طعینات تھے اسلئے چاروں بیٹیوں کا پالن پوشن اچھے ڈھنگ سے ہوا۔سعیدہ اور وحیدہ نے گورو مینا کشی سندرم سے بھارت ناٹیم سیکھا۔جب وائسرائے کے اعزاز میں اپنا ڈانس پیش کرنے کے بعد اُسکے فوٹو اخباروں میں چھپے تو کئی تیلگو فلم سازوں کی نظر اُس پر پڑی۔اُسے پہلا بریک تیلگو فلم ''روجلیو ماری'' میں ملا۔اُسکے بعد اُسنے کئی تیلگو فلموں میں کام کیا۔گورودت جو کہ نئے چہرے کی تلاش میں حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ایک دن ایک ڈسٹری بیوٹر گورودت سے ملا اور اُس سے وحیدہ رحمان کا ذکر کیا۔اُسنے گورودت سے کہا کہ وہ فلم ''روجیلو ماری'' میں اُسکا ناچ دیکھے جس نے فلمی شائقین کو اُس کا دیوانہ بنا دیا ہے۔گورودت کو جب یہ پتا چلا کہ وحیدہ اچھی اُردو بولتی ہے تو اُنہوں نے وحیدہ کو بلاوا بھیجا۔وحیدہ جب اُن سے ملی تو پہلی ہی ملاقات میں گورودت کو اس چھریری بدن والی لڑکی کے ناک نقش بھا گئے اور اُس نے اُسے بمبئی آنے کی دعوت دی۔وحیدہ بمبئی آگئی۔یہاں اُسکا اسکرین ٹسٹ لیا گیا۔وہ اسکرین ٹسٹ میں پاس ہوگئی۔گورودت کو اُسکے نام پر اعتراض تھا۔وہ چاہتے تھے کہ وحیدہ کے نام میں کوئی کشش نہیں ہے جیسے کہ نرگس مدھوبالا، نوتن یا مینا کماری کے نام میں تھی۔اُسنے وحیدہ سے کہا کہ وہ اپنا نام بدل لے۔وحیدہ اڑ گئی کہ وہ اپنا نام نہیں بدلے گی۔وہ اسی نام کے ساتھ کام کرے گی۔بالآخر گورودت کو جھکنا پڑا اور اُسے فلم سی آئی ڈی میں پہلی بار دیو آنند کے ساتھ پیش کیا گیا۔وہ دیو آنند کی زبردست مداح تھی۔اُسکی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا جب وہ پہلی بار دیو آنند سے روبرو ہوئی۔اس فلم میں اُسکا رول ویمپ کا تھا۔وحیدہ ہندی فلموں کے لئے نئی تھی۔دل میں گھبراہٹ تھی کہ پتا نہیں وہ دیو کے سامنے بول بھی پائے گی کہ نہیں۔دیو آنند نے جس طرح اُسکا حوصلہ بڑھایا اُس نے وحیدہ کو دیو آنند کا گرویدہ بنا ڈالا۔اُسنے اُسے محسوس ہی ہونے نہیں دیا کہ وہ اس انڈسٹری میں نئی ہے۔فلم جب ریلیز ہوئی تو خوب چلی۔اس کے ہدایت کار راج کھوسلہ تھے۔

گورودت وحیدہ کو کامیابی کی معراج پر دیکھنا چاہتے تھے۔اگلی فلم ''پیاسا''، تھی جسمیں دلیپ کمار کام کرنے والے تھے۔گلابو کے رول کے لئے مدھوبالا کا انتخاب کیا گیا تھا جب کہ مالا سنہا کے رول کے لئے وہ نرگس کو لینا چاہتے تھے۔بات

بنی نہیں اسلئے گورودت کو خود ہی فلم میں کام کرنا پڑا۔نرگس کی جگہ مالا سنہا آ گئی۔اس فلم میں مالا سنہا اور رحمان اہم رول میں تھے۔مدھو بالا کی جگہ وحیدہ رحمان نے لی۔اس فلم میں وحیدہ رحمان پر گورودت نے خوب محنت کی جس کا اعتراف وہ خود کرتی ہیں۔وہ کہتی ہیں کہ اُسے پتا ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے۔گورودت ایک ایک سین اُسے کر کے سمجھاتے تھے۔اُس نے اگر ایک ویشیا کا رول خوبی اور نفاست کے ساتھ ادا کیا تو اسکا سہرا گورودت کے سر بندھتا ہے۔اس فلم میں ایک جگہ اُسے چلاّ نا تھا۔بچپن میں اُسکے ٹانسلز کا آپریشن ہوا تھا۔کسی سہیلی نے اُسے یہ کہہ کر ڈرایا تھا کہ اُس نے آپریشن کرا کے اپنی آواز کا ستیا ناس کروا ڈالا۔اب وہ کبھی بول نہیں پائے گی۔یہ بات اُسکے دل میں ایسے گھر کر گئی کہ وہ بہت کم بولنے لگی۔اُسے لگتا تھا کہ اُسکی آواز بھدی ہے۔وہ جب اونچی آواز میں بولتی تھی تو اُسکی آواز پھٹ جاتی تھی۔''پیاسا ''میں جب گورودت کے مرنے کی خبر اُسے ملتی ہے تو اُسے چلاّ نا تھا۔وہ چلاّ نے سے احتراز کرتی رہی۔گورودت نے وحیدہ سے کہا کہ لڑکیاں ایک چھوٹا سا کیڑا دیکھ کر چلاّتی ہیں۔ایک تم ہو جو چلاّ نے سے انکار کر رہی ہو۔وحیدہ کچھ نہیں بولی پر گورودت نے اُسکی کمزوری کو بھانپ لیا اور چلاّنے کی جگہ اُس سے کہا کہ وہ اخبار ہاتھ میں لے کے نیچے بیٹھ جائے اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔یہ سین ایک یادگار سین بن کے رہ گیا۔
وحیدہ کا کہنا ہے کہ گورودت ایک ایسے ڈائرکٹر تھے جو آرٹسٹ کو کوئی بھی چیز کرنے پر مجبور نہیں کرتے تھے۔جہاں وہ دیکھتے تھے کہ آرٹسٹ کو ڈائیلاگ ادا کرنے میں دقت ہو رہی ہے یا شاٹ میں کسی قسم کی پریشانی ہو رہی ہے تو وہ ڈائیلاگ بدلوا لیتے تھے یا وہ شاٹ بدل دیتے تھے۔فلم نے باکس آفس پر کامیابی کے ڈنکے بجائے اور وحیدہ رحمان کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن گئی۔

گورودت ایکٹروں کا ڈائرکٹر تھا۔اُسنے اودے شنکر سے ڈانس سیکھا تھا اسلئے وہ وحیدہ کو ناچ کر کے دکھاتا تھا البتہ یہ بات ساتھ ہی کہہ دیتا تھا کہ وہ اُسے ایک ڈھانچہ بنا کے دے رہا ہے۔اُسے اس ڈھانچے میں خود روح پھونکنی ہوگی۔اُسکا کہنا ہے کہ اُن دنوں کوئی ایکٹنگ اسکول نہیں تھا اسلئے وہ ایکٹنگ کے لوازمات سے بے بہرہ تھی۔اُسے یہ پتا نہیں تھا کہ ڈائیلاگ کی ادائیگی کیسے ہوتی ہے۔آواز کو کیسے سدھارا جا سکتا ہے۔گورودت کو ایکٹروں سے کام لینا آتا تھا۔وہ تب تک بس نہیں کرتے تھے جب تک ادا کار کے شاٹ سے وہ مطمئن نہیں ہوتے تھے۔چاہے اُسے کتنے بھی ری ٹیک کیوں نہ دینے پڑیں۔اُسنے وحیدہ سے کہا تھا کہ وہ سیٹ پر تب بھی موجود رہے جب اُسکی ضرورت نہ ہو۔وہ ایسا ہی کرتی تھی۔وہ جب مالا سنہا اور رحمان کو پچاس پچپن ری ٹیک دیتے ہوئے دیکھتی تھی تو اُسکی خود اعتمادی بڑھنے لگتی۔اُسنے ان منجھے ہوئے کلاکاروں سے بہت کچھ سیکھا۔''پیاسا'' کی ریکارڈ توڑ کامیابی کے بعد وحیدہ کو باہر کی فلمیں ملنے لگی تھیں "12 o clock"اور''سولہواں سال''دو ایسی فلمیں ہیں جو''پیاسا'' کے بعد ریلیز ہوئیں۔''سولہواں سال''میں وحیدہ کا ہیرو دیو آنند تھا۔فلم اچھی چلی۔یہ دوسری فلم تھی جو وہ دیو آنند کے ساتھ کر رہی تھی اور اس کا ہدایت کار بھی راج کھوسلہ ہی تھا۔ادھر گورودت نئی فلم کی تیاری میں لگے تھے۔وحیدہ اُنکے دل و دماغ پر حاوی ہو چکی تھی اسلئے وہ رات دن وحیدہ کے بارے میں ہی سوچتے رہتے تھے۔اگلی فلم میں پھر اسے ایک دم دار رول میں پیش کیا گیا۔یہ فلم تھی''کاغذ کے پھول''۔اس فلم کی کہانی میں گورودت کی ذاتی زندگی کا اثر صاف دکھائی دے رہا تھا۔اس فلم میں ایک سین ایسا تھا جہاں بی بی ناز وحیدہ سے کہتی ہے کہ تم نے میری ماں کو میرے باپ سے الگ کر دیا جواب میں وحیدہ کہتی ہے کہ تمہارے ماں باپ تو ہیں بھلے ہی وہ الگ الگ رہتے ہوں۔میرا تو کوئی نہیں ہے۔نہ ماں نہ باپ۔یہ ڈائیلاگ ادا کرتے کرتے وہ اس قدر جذباتی ہو جاتی تھی کہ اُسکے آنسو نہیں رکتے تھے اور شاٹ ادھورا رہ جاتا تھا۔اسکی وجہ یہ تھی کہ کچھ دن پہلے وحیدہ کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔باپ کا انتقال تو برسوں پہلے ہوا تھا جب وہ محض تیرہ سال کی تھی۔کیمرہ مین نے یہ بات گورودت تک پہونچا دی۔گورودت بہت ہی حساس تھے۔وہ کسی کے دکھ و درد خوب محسوس کرتے تھے۔اُنہوں نے ایک اہم میٹنگ میں شریک ہونے کا بہانہ بنا کر شوٹنگ ملتوی کر دی اور وحیدہ کو سنبھلنے کا وقت دیا۔یہ فلم وقت سے پہلے بنی تھی اسلئے فلم چلی نہیں۔آج اس فلم کو کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔اس فلم کی ناکامی سے گورودت بری طرح ٹوٹ گیا۔اُسنے قسم کھائی کہ وہ اب کوئی بھی فلم ڈائرکٹ نہیں کرے گا۔

اُدھر دیو آنند نوکیتن کے بینر تلے''کالا بازار'' بنانے جا رہے تھے۔اس فلم کے لئے دیو آنند کے مدمقابل وحیدہ تھی۔اس فلم کے لئے جب ایس ڈی برمن نے گانے ریکارڈ کئے تو گیتا دت اُنکی پہلی پسند تھی۔گیتا دت نے وحیدہ رحمان کے لئے گانا گانے سے انکار کر دیا۔اتنی نفرت کرتی تھی وہ وحیدہ سے۔فلم ''کالا بازار'' بیحد کامیاب رہی۔اسکے بعد اُسنے ایک اور فلم کی جس کا نام''ایک پھول چار کانٹے''تھا۔یہ فلم خواجہ احمد عباس نے بنائی تھی۔ادھر گورودت وحیدہ کو شہرت کی معراج پر دیکھنا چاہتے تھے۔گیتا دت کی مخالفت کے باوجود اُنہوں نے اپنی اگلی فلم میں وحیدہ کو ایک نئے روپ میں پیش کیا۔یہ فلم تھی''چودھویں کا چاند'' یہ فلم ایم صادق کی ہدایت میں بنائی جا رہی تھی۔''چودھویں کا چاند''نے وحیدہ کے فلمی کیریر میں چار چاند لگا دئے۔یہ فلم زبردست کامیاب رہی۔

گورودت شادی شدہ تھے۔اُنکی بیوی گیتا دت ایک کامیاب گلوکارہ تھی۔وحیدہ سے نزدیکی نے اُنکی ازدواجی زندگی میں دراڑ پیدا کی تھی۔ایک طرف وہ وحیدہ کے عشق میں گرفتار تھے تو دوسری طرف وہ اپنی ازدواجی زندگی کو بھی بچانے کی سعی کر رہے تھے۔جب گیتا دت نے دیکھا کہ اُنکی قربت بڑھتی جا رہی ہے تو وہ گورودت کو سبق سکھانے کے لئے ایک نوجوان کے ساتھ کشمیر چلی گئی۔گورودت کو جب پتا چلا تو وہ اُسے لینے کشمیر گئے اور گیتا کو سمجھا بجھا کر واپس لے آئے۔اُنہوں نے گیتا دت سے وعدہ کیا کہ وہ وحیدہ کے ساتھ سارے رشتے توڑ لیں گے۔وہ جب واپس لوٹے تو اسٹاف کو ہدایت دی گئی کہ وحیدہ کو آفس کے اندر آنے نہ دے۔اس سے پہلے وہ بے روک ٹوک گورودت کے آفس میں آیا جایا کرتی تھی۔جب وہ گورودت سے ملنے آئی تو اُسے اندر آنے سے روکا گیا۔وہ بھونچکی رہ گئی۔

اُسے اتنا گہرا شاک لگا کہ وہ مہینوں تک گورودت کے آفس میں نہیں گئی۔

اُسنے ''چودھویں چاند'' کے بعد دو فلمیں کیں۔ فلم ''گرل فینڈ'' اور ''روپ کی رانی چوروں کا راجہ''۔ ''فلم ''گرل فرینڈ'' کے ہیرو کشور کمار تھے جب کہ ''روپ کی رانی چوروں کا راجہ'' میں دیو آنند ہیرو تھا۔ اس بار دیو آنند کے ساتھ اُسکی جوڑی کامیاب نہ رہی۔ فلم بری طرح پٹ گئی۔ یہ فلم ایچ ایس رویل نے بنائی تھی۔ اس فلم کی ناکامی نے وحیدہ کو بھی تفکر میں ڈال دیا۔ وہ ایک بار پھر گورودت کے شرن میں پہونچ گئی۔ گورودت فلم ''صاحب بی بی اور غلام'' بنانے کی تیاریوں میں جٹ گئے تھے۔ وحیدہ رحمان بضد تھی کہ وہ ٹھکرائن کا رول ادا کرے گی مگر گورودت نے اُسے سمجھایا کہ وہ کسی بھی زاویے سے ٹھکرائن نہیں لگے گی۔ وہ پہلے سے طے کر چکے تھے کہ یہ رول مینا کماری ہی کرے گی۔ کسی طرح وحیدہ کو سمجھا بجھا کر اُسے بھوت ناتھ کی محبوبہ جبا کا رول کرنے پر آمادہ کر لیا۔ بھوت ناتھ کے رول کے لئے ششی کپور کو لینے کا ارادہ تھا۔ گورودت ششی سے بہت سارے دن چاہتے تھے۔ ششی اُن دنوں کافی مصروف تھا۔ وہ گورودت کو مطلوبہ ڈیٹ نہ دے سکے۔ مجبوراً گورودت کو بھوت ناتھ کا رول خود ہی ادا کرنا پڑا۔ جب فلم ریلیز ہوئی تو اس فلم نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔ اس فلم میں مینا کماری کے رول کو کافی سراہا گیا۔ وہ ذاتی زندگی میں اسی کیفیت سے گزر رہی تھی اسلئے اُس نے اپنے کردار کو زندہ جاوید بنا دیا تھا۔ اس فلم کی ریلیز کے ٹھیک دو سال بعد گورودت نے خودکشی کر لی۔ وہ محض اُنتالیس سال کے تھے۔ وحیدہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ گورودت محض اُسکا محسن اور مربی نہیں بلکہ وہ اُسکا محبوب بھی تھا۔ جب اُسنے گورودت کی موت کی خبر سنی تو جنازے میں شریک ہونے چلی آئی۔ وہ دہاڑیں مار مار کر رونا چاہتی تھی پر اُسنے اپنے جذبات کو سینے میں ہی روک کے رکھا۔ گورودت چلا گیا تھا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد وحیدہ نے درجنوں فلمیں کیں جن میں چند ایک کامیاب رہیں جب کہ زیادہ تر ناکام رہیں۔ جیسے ''بیس سال بعد'' مجھے جینے دو'' ''ایک دل سو افسانے'' ''راکھی'' اور ''کہرا'' کامیاب رہیں جب کہ ''کون اپنا کون پرایا'' ''شگون'' اور ''مجبور'' باکس آفس پر ناکام رہیں۔ ''شگون'' میں اُسکا ہیرو (ششی ریکھی) کمل جیت تھا۔ کمل جیت دل ہی دل میں وحیدہ سے پیار کرنے لگا مگر اُسکی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اظہار محبت کرے کیونکہ وحیدہ رحمان ایک ٹاپ کی ہیروئن تھی۔ فلم کی ناکامی سے دل برداشتہ ہو کر وہ کینیڈا چلا گیا جہاں اُسنے اپنا کاروبار شروع کیا۔

دیو آنند ''گائیڈ'' کی تیاریوں میں لگا تھا۔ اُسکے ذہن میں روزی کے رول کے لئے وحیدہ رحمان تھی مگر ساتھ ہی یہ خدشہ بھی لگا تھا کہ کہیں ایسا رول کرکے وحیدہ کے کیریر پر منفی اثر نہ پڑے۔ جب اُسنے وحیدہ سے اپنے خدشات ظاہر کئے تو وحیدہ اُس سے بولی کہ یہ جو کردار ہیں یہ وحیدہ اور دیو نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ رول روزی اور راجیو گائڈ کر رہے ہیں۔ اُسکی سکھی سہلیوں اور شبھ چنتکوں نے اُسے یہ فلم کرنے سے منع کر دیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس میں ہیروئن کا رول منفی ہے۔ یہ رول کرنے سے اُسکی امیج خراب ہو سکتی ہے۔ مگر وہ طے کر کے بیٹھی تھی کہ وہ یہ فلم کرے گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اس طرح کے منفی رول اُسنے فلم سی آئی ڈی اور پیاسا میں کئے تھے اسلئے اُسنے کسی کی بات نہیں سنی اور فلم کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس فلم کو کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسمیں ہیروئن کے کئی ڈانس تھے۔ فلم جب 1965 میں ریلیز ہوئی تو اس فلم نے پورے ملک میں کامیابی کے ڈنکے بجا دئے۔ لوگوں نے وحیدہ رحمان کے رول کی بیحد تعریف کی۔ اسکے بعد کامیاب فلموں کی جھڑی لگ گئی۔ ''گائیڈ'' کے ریلیز کے ایک سال بعد گیت کار شیلندر کی فلم ''تیسری قسم'' ریلیز ہوئی۔ یہ فلم باکس آفس پر کامیاب تو نہیں رہی البتہ اس فلم کو انٹلیکچول طبقے نے بیحد پسند کیا۔ بنگال فلم جرنلسٹس ایسیوسیشن نے اس فلم کو اعزاز سے نوازا۔

اُسنے انڈسٹری کے بیشتر ہیروز کے ساتھ کام کیا۔ دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے کی حسرت اُسکی فلم ''دل دیا درد لیا'' سے پوری ہوئی۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوراں دلیپ کمار اور وحیدہ رحمان ایک دوسرے کے بیحد قریب آ گئے۔ دونوں غم کے مارے تھے۔ دلیپ صاحب نے مدھوبالا کو کھو دیا تھا جب کہ وحیدہ نے گورودت کو دونوں ایک دوسرے کے درد کا مداوا بننا چاہتے تھے۔ دلیپ صاحب نے وحیدہ سے کہا کہ وہ رات کو اُسکے یہاں ڈنر کریں گے۔ وحیدہ دلیپ صاحب کے انتظار میں بیٹھی رہی جب کہ دلیپ صاحب مدراس پہونچ گئے اور سائرہ بانو سے شادی کرنے کا اعلان کر دیا۔ قسمت کے اس مذاق کو وحیدہ نے چپ چاپ سہہ لیا۔ فلم ریلیز ہوئی پر اُتنی کامیابی حاصل نہ کر سکی جتنی اُمید کی جا رہی تھی۔ اسکے بعد جو فلم آئی اُسنے اگلی پچھلی ساری کسر پوری کر دی۔ وہ فلم تھی ''رام اور شیام''۔ اس فلم میں دلیپ کمار کا ڈبل رول تھا۔ رام کے مقابل ممتاز تھی جب کہ شیام کے مقابل وحیدہ رحمان تھی۔ یہ فلم 1967 میں ریلیز ہوئی۔

اسی سال وحیدہ کی تین اور فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''پتھر کے صنم''، ''پالکی'' اور ''گھر کا چراغ''۔ ''پتھر کے صنم'' میں اُسکا ہیرو منوج کمار تھا۔ یہ فلم بیحد کامیاب رہی۔ اس کی کہانی اُردو کے مشہور ناول نگار گلشن نندہ نے لکھی تھی۔ فلم ''پالکی'' میں ہیرو راجندر کمار تھا۔ اس فلم کی کہانی موسیقار نوشاد نے لکھی تھی۔ جب کہ سنگیت بھی اُن ہی کا تھا۔ یہ فلم ناکام رہی۔ اسکے بعد فلم ''گھر کا چراغ'' ریلیز ہوئی اس میں وحیدہ کا ہیرو دھرمیندر تھا۔ یہ فلم بھی خاص بزنس نہ کر سکی۔ 1968 میں وحیدہ کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''نیل کمل'' ''بازی'' اور ''آدمی''۔ ''نیل کمل'' میں راجکمار اور منوج کمار اُسکے مد مقابل تھے۔ اس فلم نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا۔ ''بازی'' میں اُسکا ہیرو دھرمیندر تھا۔ یہ فلم جانی واکر کے بھائی ٹانی واکر نے پرڈیوس کی تھی۔ فلم ٹھیک ٹھاک رہی۔ اسکے بعد ''آدمی'' ریلیز ہوئی۔ اسمیں دلیپ کمار کے ساتھ منوج کمار بھی تھا۔ اس ساؤتھ کے جانے مانے ہدایت کار نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ فلم میں دلیپ کمار کی اداکاری دیدنی تھی۔ اس فلم کو خاصی کامیابی ملی۔

1969 میں وحیدہ کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''خاموشی'' ''شطرنج'' اور ''میری بھابی''۔ ''خاموشی'' سب سے پہلے بنگالی زبان میں بنی تھی۔ جب وحیدہ نے یہ فلم دیکھی تو وہ اس فلم سے اسقدر متاثر ہوئی کہ اُسنے اپنے کئی ڈائرکٹرں سے بات کی اور اُنہیں اس فلم کو ہندی میں بنانے پر زور دیا۔ ان سب لوگوں کا کہنا

تھا کہ آپ نے اتنا Heavy سبجکٹ چنا ہے۔ یہ فلم ہندی میں نہیں چلے گی۔ انہی دنوں وہ ہیمنت کمار کے ساتھ فلم ''بیس سال بعد'' میں کام کر رہی تھی۔ ایک دن اُسنے ہیمنت دا سے کہا کہ کیا وہ ''خاموشی'' کو ہندی میں بنانا پسند کریں گے۔ ہیمنت دا نے جواب میں کہا کہ اگر تم اس فلم میں کام کروگی تو میں اوشیہ اسے بنالوں گا۔ ''بیس سال بعد'' کی ریلیز کے بعد اُنہوں نے اپنی اگلی فلم ''خاموشی'' کا اعلان کر دیا۔ اُنہوں نے اُسی ڈائرکٹر کے ہاتھ ہدایت کاری کی کمان سونپ دی جس نے بنگالی میں اس فلم کو بنایا تھا۔ وہ ہدایت کار تھے جانے مانے اسیت سین۔ اس فلم میں ہیرو کے رول میں دھرمیندر اور راجیش کھنہ تھے۔ اس فلم میں وحیدہ نے جس طرح کی جذباتی اداکاری کی تھی وہ قابل دید تھی۔ فلم میں اُس نے ایک نرس کا رول ادا کیا تھا۔ فلم بیحد کامیاب رہی اور فلمی پنڈتوں کی یہ پیشن گوئی غلط ثابت ہوئی کہ یہ فلم ہندی میں نہیں چلے گی۔ فلم ''شطرنج'' میں اُسکا ہیرو راجندر کمار تھا۔ اس فلم کو ایس ایس واسن نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب راجندر کمار کے ستارے گردش میں تھے۔ یہ فلم کچھ خاص نہ چلی۔ یہی حال میری ''بھابی'' کا بھی ہوا۔

1970 سے لے کے 1974 تک اُسکی ایک درجن کے قریب فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں سوائے ''دھرتی'' کے کوئی بھی فلم باکس آفس پر کامیاب نہیں رہی۔ اُسے اپنی ڈھلتی عمر کا احساس ہو چکا تھا 1974 میں ششی ریکھی جب ہندوستان لوٹا تو وہ وحیدہ سے ملا اور برجستہ اپنے پیار کا اظہار کیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا وہ اُس سے شادی کرے گی۔ وحیدہ نے حامی بھر لی۔ وحیدہ شادی کر کے بنگلور چلی گئی جہاں اُسکا اپنا فارم ہاؤس ہے۔ اُسنے دو بچوں کو جنم دیا۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ اسکے بعد وحیدہ کی درجنوں فلمیں آئیں مگر اُن میں کوئی بھی فلم دھوم نہیں مچا پائی۔ سچ تو یہ تھا کہ وحیدہ کا طلسم ٹوٹتا جا رہا تھا۔ عمر بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

1976 میں ریلیز ہونے والی فلم ''عدالت'' میں اُسنے ہیروئن کی جگہ کریکٹر رول سے اپنی دوسری باری کی شروعات کی۔ اسی سال اُسکی فلم ''کبھی کبھی'' ریلیز ہوئی۔ 1978 میں ''ترشول'' ریلیز ہوئی جسمیں وہ امیتابھ بچن کی ماں بنی تھی۔ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ''عدالت'' میں وہ اُسکی بیوی بنی تھی جب کہ فلم ''ترشول'' میں وہ اُسکی ماں بنی تھی۔ بطور کریکٹر آرٹسٹ وحیدہ کی فلموں میں ''مشعل''، ''چاندنی''، ''لمحے''، ''نمک حلال''، ''نمکین''، ''قلی''، ''اللہ رکھا''، ''رنگ دے بسنتی''، ''مقصد'' وغیرہ ایسی فلمیں ہیں جن میں وحیدہ کی اداکاری قابل داد ہے۔

سن 2000 میں ایک لمبی علالت کے بعد ششی ریکھی کا انتقال ہوا۔ وحیدہ نے ہندی کے علاوہ بنگالی، تیلگو اور ملیالم فلموں میں بھی کام کیا۔ نندہ اور سادھنا وحیدہ کی بہت ہی قریبی سہلیاں تھیں۔ دونوں اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ دیو آنند جب تک زندہ تھا وہ برابر اُس کے رابطے میں رہی۔ وہ دیو آنند کو اپنا بہترین دوست اور صلاح کار سمجھتی تھی۔ گورو دت کو وہ ہمیشہ یاد کرتی ہے۔ اُسکا کہنا ہے کہ گورو دت جیسا ڈائرکٹر پیدا ہونا مشکل ہے۔ وہ اداکار سے زیادہ اُسے بحیثیت ہدایت کار زیادہ برتر اور افضل سمجھتی ہے۔

وحیدہ آج بھی فال ہے۔ اُسکے دونوں بچے جوان ہو چکے ہیں اور دونوں رائٹر ہیں۔ آجکل وہ ممبئی میں ہی قیام کر رہی ہیں۔ ممبئی میں پالی ہل میں اُسکا اپنا بنگلہ ہے جہاں وہ اپنا زیادہ تر وقت گزارتی ہے۔ وحیدہ سلیم خان اور سلمان خان کے بیحد قریبی ہے۔ جب اُسنے ششی ریکھا سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو سب سے پہلے اُسنے سلیم خان سے صلاح لی تھی۔ ہیلن اُسکی بہترین سہلیوں میں سے ایک ہے۔

- بقیہ -

نہ جانے کیوں

جب روتی ہوئی نانو میرے چہرے پر جھکیں تو ان کے آنسو میری ادھ کھلی آنکھوں پر پڑے۔ انہوں نے روتے ہوئے کہا۔

''فہد جی۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ اکیلے قبر میں ڈر لگے گا۔ میرے روم میٹ۔''

پھر میں نے دیکھا۔ گاؤں میں دادا ابو کے گھر میرے نانا ابو کے گھر بہت سے لوگ ہیں۔ سب رو رہے ہیں۔

طلحہ کو میں نے بہت عرصہ بعد دیکھا تھا۔ میرا دل چاہا اسے لے کر باغ میں جاؤں۔ مگر وہ ذیشان کو لے کر باغ میں چلا گیا میں انہیں دیکھ رہا تھا مگر وہ مجھ سے بات نہیں کر رہے تھے۔

فراز مجھ سے دو سال چھوٹا تھا۔ مگر میرا پکا دوست تھا پھر مجھے دادا ابو کے پاس قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

شام کو اماں عدنان ماموں کے ساتھ میری قبر پر آئیں۔ وہ بہت رو رہی تھیں۔ ان کا دل تھا ان کے ''فہد شہزادے'' کو باغ میں دفن کرتے۔ اجاڑ قبرستان میں کیوں دفن کر دیا گیا۔ اماں، اماں مت رو میں تو نانا ابو کے باغ سے زیادہ خوبصورت باغ میں ہوں۔ اسے جنت کہتے ہیں۔ حوریں فرشتے مجھے کھلاتے ہیں۔ نانو جب میں بابا اماں کو اپنے لیے روتا دیکھتا ہوں تو بہت مچلتا ہوں۔ میں فرشتوں سے لڑتا ہوں۔ کیوں مجھے اماں بابا سے چھین کر لے آئے ہو۔ مجھے واپس جانے دو۔ وہ مجھے تسلی دیتے ہیں۔ تم انشاء اللہ اپنی ماں کی گود میں واپس جاؤ گے۔ مگر ایک چھوٹے بچے کے روپ میں۔

میں دعا کرتا ہوں۔ آپ بھی دعا کریں۔

''نانو میں ایک چھوٹا بچہ بن کر اماں کی گود میں آجاؤں۔''

آپ کا

فہد ٹوانہ

رس رابطے

جستجو،ترتیب،تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

آپ کے مؤقر جریدے کے شمارہ مئی جون ۲۰۱۷ء میں محترم پروفیسر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا خط شائع ہوا ہے جس میں بیان کی گئی باتوں میں سے تین کا سچائی کے ساتھ جواب دینا میرے لئے ضروری ہے:

اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل سے میری کتاب ’’لسانی مطالعے‘‘ ایک دنیا میں بہ نظرِ تحسین دیکھی گئی۔ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد نے اسے سب سے پہلے اپریل ۲۰۱۲ء میں شائع کیا۔ 2015ء میں دو نامور اشاعتی اداروں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی (بھارت) اور مثال پبلشرز فیصل آباد (پاکستان) نے اس کے ڈیلکس ایڈیشن شائع کیے بلکہ پاک وہند میں اس کتاب پر لکھے گئے مضامین نے بھی ایک کتابی شکل اختیار کر لی جسے ’’اردو: معیار اور استعمال‘‘ کے نام سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ترتیب دیا اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی (بھارت) نے ۲۰۱۴ء میں اس کا ڈیلکس ایڈیشن شائع کیا۔ اس سارے عمل میں بھی، میں اللہ کے فضل اور اس کے کرم ہی کو اساس جانتا ہوں۔ یونیورسٹی آف بلوچستان، کوئٹہ نے ۲۴ ستمبر ۲۰۱۲ء میں اپنے ایک نوٹیفیکیشن کے ذریعے، پی ایچ ڈی پشتو زبان وادب کے کورس کوڈ نمبر ۱۲۰۱ (پشتو زبان وادب کا لسانی پس منظر) کے نصاب میں ’’لسانی مطالعے‘‘ کو شامل کرنے کی منظوری صادر کی۔ یہ گراں قدر اعتراف اور توقیر بھی من جانب اللہ ہے۔

محترم ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کی باتیں، جن سے مجھے اتفاق نہیں ہے، مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ’’لسانی لغت‘‘ کا مسودہ غازی علم الدین صاحب کو بھیجا تو وہ اس قدر خوش ہوئے کہ انھوں نے اس لغت کو پہلے ہندوستان سے شائع کرانے کے لئے اصرار کیا۔

۲۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے یہ لغت شائع کی جس کی طباعت کا پورا خرچ غازی صاحب نے برداشت کیا۔

۳۔ ’’لسانی مطالعے‘‘ کے بطن سے میں نے ’’لسانی لغت‘‘ تیار کی۔ اس لغت میں کتاب کا ایک بھی مضمون شامل نہیں ہے بلکہ الفاظ کی صحت اور معانی کی تفصیل درج ہے۔

جناب! میرے دل میں ڈاکٹر مناظر صاحب کے لئے بہت احترام ہے۔ میرا مزاج اللہ کے فضل سے تکرار وتصادم کا نہیں۔ میں خاموشی ہی کو افضل جانتا ہوں مگر ہوں تو آدمی۔ ڈاکٹر صاحب کے خط میں بیان کی گئی ناقابلِ اتفاق باتوں کا جواب، نہایت اختصار سے، اس طرح ہے:

۱۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے مجھے ’’لسانی لغت‘‘ کا مسودہ نہیں بھیجا بلکہ مجھے تو ان کے اس منصوبے کا علم ہی نہیں تھا۔ اس صورتِ حال میں، میں بھلا کیوں کر اور کس طرح ’’لسانی لغت‘‘ کو ہندوستان سے شائع کرانے کے لئے اصرار کرتا۔ ’’لسانی لغت‘‘ کے چھپ جانے کے بعد مجھے تو پونے (بھارت) سے محترم نذیر فتح پوری نے فون پر بتایا کہ ’’لسانی مطالعے‘‘ کے حوالے سے ڈاکٹر مناظر صاحب نے ’’لسانی لغت‘‘ شائع کی ہے۔ پھر میں نے ڈاکٹر صاحب سے رابطہ کر کے استفسار کیا تو انھوں نے بتایا کہ ہاں، میں نے شائع کی ہے۔

۲۔ مجھے تو ’’لسانی لغت‘‘ کی اشاعت کے اس منصوبے کا علم ہی نہیں تھا، بھلا میں کس طرح اس کے مصارف برداشت کرتا۔ ہاں ’’لسانی لغت‘‘ کی جتنی تعداد میں نے دہلی سے منگوائی، اس کی قیمت ادا کی۔

۳۔ پاکستان اور ہندوستان کے وہ اہلِ علم جو ’’لسانی مطالعے‘‘ پڑھ چکے تھے، انھیں ’’لسانی لغت‘‘ دستیاب ہوئی تو ان میں سے متعدد اہلِ علم نے ان دونوں کا تقابل کیا اور پھر اس معاملے پر لکھا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا کہ ’’لسانی مطالعے‘‘ کے بطن سے ’’لسانی لغت‘‘ تیار ہوئی ہے، اس ضمن میں حقیقت یہ ہے کہ ’’لسانی مطالعے‘‘ کے پورے کے پورے مضامین تو اس میں شامل نہیں البتہ الفاظ کی صحت اور معانی کے حوالے سے جو حصے اور مباحث ’’لسانی مطالعے‘‘ سے لیے گئے ہیں وہ من وعن ’’لسانی مطالعے‘‘ ہی کے ہیں بغیر کسی بھی فرق کے۔

پروفیسر غازی علم الدین (میرپور، آزاد کشمیر)

میرے گلزار، ساری دعائیں تمہارے لیے۔

ہمارے پاس وہ تمام الفاظ کا ذخیرہ قریب الختم ہے جو کسی کی تعریف، توصیف یا حوصلہ افزائی کے لیے درج کیے جاتے ہیں۔ تم ہو کہ ہر بار کوئی نہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دے کر ہمیں پھر سے مشکل میں ڈال دیتے ہو۔ پروفیسر شمیم حنفی جیسے پڑھے لکھے، متین اور سنجیدہ نقاد اور دانشور کو چہارسو کے صفحات پر جس سلیقے اور قرینے سے تم نے پیش کیا ہے اس سے پہلے اس طرح کی اشاعت پروفیسر صاحب کی نسبت میری نظر سے نہیں گزری۔ بے شک کچھ لوگ اس بات پر معترض ہوں گے کہ پروفیسر صاحب نے تمہارے سوالات کے جواب کسی قدر مختصر دیے ہیں مگر ہر سوال کا جواب اپنی جگہ قاری کی تسلی اور تشفی کر رہا ہے۔ پروفیسر صاحب کا پچاس سال پرانا ڈرامہ اور قریب اتنا ہی پرانا افسانہ اور کلام کو تلاشنا اور شاملِ اشاعت کرنا بھی ایک کارنامہ ہے۔ اس کے لیے بھی مبارک باد قبول کرو۔

اس بار افسانے اُس معیار کے نہیں جس کا تقاضا چہارسو جیسے معیاری پرچے کی نسبت قاری بجا طور پر کرتا ہے۔ پھر بھی ڈھائی افسانے مجھے بہت متاثر کن لگے۔ سب سے پہلے تو شموئل صاحب کی ’’لنگی‘‘ نے کچھ ایسا سماں باندھا کہ بہت سے لوگوں کا لباس تار تار ہوتا نظر آیا۔ پھر تم نے ’’کہہ جاناں میں کون‘‘ میں اس طرح حقیقت کا رنگ بھرا کہ ایک مرتبہ تو میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میری

شرکت کے بغیر گلزار یہ کام کر کیسے سکتا ہے۔ بہر حال کہانی میں جو میسیج تم نے دیا ہے اگر قاری اُس تک پہنچ جائے تو یہ تمہارا کارنامہ گردانا جائے گا۔ آخر میں بابا بلھے شاہ کے کلام نے نہ صرف کہانی کو اٹھا دیا بلکہ قاری کے اوپر وجد کی کیفیت طاری کر دی۔ شاہد جمیل کی کہانی ''مہاجر'' اچھی کوشش ہے لیکن لگتا کچھ یوں ہے کہ جیسے شاہد جمیل صاحب نے اسے عجلت میں تحریر کیا ہے۔

اس بار ڈاکٹر فیروز عالم کی کمی شدت سے محسوس ہوئی جس کا ازالہ تم نے پسِ ورق پر اُن کی تازہ کتاب کا عکس لگا کر کر دیا۔ پروین شیر کا سفرنامہ قاری کو گرفت میں لیے ہوئے ہے اور پسِ ورق پر اُن کی تازہ کتاب کی خوشخبری نے تو اور بھی نہال کر دیا۔ تابش خانزادہ صاحب کے پس منظر سے میں واقف نہیں مگر اُن کے تحریر اور مواد پر اُن کی گرفت اس امر کا پتہ دے رہی ہے کہ یہ ناول بڑی عرق ریزی سے لکھا گیا ہے۔ سلمیٰ اعوان کے ''ثمر یز بک'' نے دل ہلا کر رکھ دیا۔ خدا معلوم دولت کے پجاریوں کی ہوس بنی نوع انسان کو اور کتنے آلام سے دوچار کرے گی۔

شاعری میں آصف ثاقب، نسیم سحر، اشرف جاوید، تصور اقبال، شگفتہ نازلی، حسن منظر اور ڈاکٹر ریاض احمد کے کلام نے کافی متاثر کیا۔ رس رابطے میں تو میں صرف ایک ہی خط کا ذکر کرنا چاہوں گا اور وہ آپا جمیلہ شبنم۔ رب نے اُن کے قلم میں کس قدر تاثیر رکھی ہے کہ پڑھنے والا خاص طرح کی کشش محسوس کرتا ہے۔ میری طرف سے آپا جمیلہ شبنم کو بہت ساری دعائیں۔

یوگیندر بہل تشنہ (امریکہ)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کے شمارہ مئی جون ۲۰۱۷ء میں آپ نے ہندو پاک کے ایک بلند پایہ اردو ادیب کو بجا طور پر خراجِ تحسین پیش کیا ہے جنہوں نے گذشتہ نصف صدی کے دوران اردو ادب کی بے مثال خدمت کی ہے جس پر انہیں مختلف ایوارڈز و اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ درس و تدریس کے ساتھ تدریسی کتب کے علاوہ تحقیق و تنقید کے میدان میں ان کی کتب جدیدیت کی فلسفیانہ اساس تاریخ تہذیب اور تخلیقی تجربہ انہیں اپنے دور کا ایک بلند قامت ناقد اور مبصر قرار دیتی ہیں۔ شمیم حنفی صاحب کی پچاس کے لگ بھگ مطبوعات میں افسانے، ڈرامے، تنقیدی مضامین، شاعری، اردو خاکے اور بچوں کے لیے دلچسپ کہانیاں شامل ہیں۔ براہِ راست میں آپ کے ساتھ کا ان کا مکالمہ بھی کافی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

اسی عرصہ میں رینو بہل صاحبہ کا ناول ''گرد میں اٹے چہرے'' پڑھا۔ کیا زبردست ناول لکھا ہے جو چند اوراق پڑھنے کے بعد ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ رینو بہل کی تحریریں با مقصد ہوتی ہیں اور وہ اشاروں میں سمجھنے والوں کے لیے بہت سے پیغامات اور رہنمائی کی حامل ہوتی ہیں۔ اس ناول میں بھی قاری جلد ہی خود کو ایک حقیقی منظر نامہ میں موجود پاتا ہے اور بعد میں بھی ایک عرصہ تک ایک سچے واقعہ کے طور پر محسوس کرتا رہتا ہے۔ ناول با مقصد، اصلاحی، باعث عبرت بھی ہے ایسا شاندار ناول لکھنے پر میں انہیں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

شمارہ میں مشہور افسانہ نگار شموئل احمد صاحب کا افسانہ ''لنگی'' شامل کیا گیا ہے۔ انہوں نے جس موضوع پر کہانی لکھی ہے وہ بلاشبہ طلبہ طالبات اور والدین کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ ساتھ ہی اعلیٰ تعلیم کے خواہش مند طلبہ و طالبات کے لیے بروقت انتباہ بھی ہے جو والدین کی صحیح تربیت، نگرانی اور رہنمائی کا متقاضی ہے۔ گلزار جاوید صاحب آپ خود بھی ایک بہترین افسانہ نگار ہیں اور آپ کی لکھی ہوئی کہانیاں بالکل سچی معلوم ہوتی ہیں۔ زیب داستاں کے لیے آپ مبالغہ آرائی کے بجائے کہانی کو زیادہ سے زیادہ تکنیکی اور شستہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس شمارے میں آپ کا افسانہ ''کیہہ جاناں میں کون'' بالکل حقیقت کے قریب اور انسانی جذبات و محسوسات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے اور پھر۔۔۔ اختتام پر کوئی واقعہ ایک دبے ہوئے انتہائی حساس پہلو کو یوں آشکار کر دیتا ہے کہ خلافِ توقع ایک خوشگوار منظر کا انجام ایک لاعلاج دکھی منظر نامہ میں تبدیل ہو جاتا ہے جو دیر تک قاری کے ذہن کو متاثر کرتا رہتا ہے کاش ایسا نہ ہوتا۔

منیرہ شمیم صاحبہ کا افسانہ ''یادوں کی پرچھائیں'' ایک ایسے دکھی اور حساس دل کی تحریر لگتی ہے جو ''ماضی'' میں رہ رہا ہو لیکن مجبوراً حال اور ماضی کو جڑے رکھنے پر مجبور ہو۔ ان کے الفاظ میں ''سوچتی ہوں وہ سب چیزیں جو خوبصورت ہوتی ہیں۔ دل کو اچھی لگتی ہیں وہ پاس کیوں نہیں رہتیں۔ دل سے چھین کیوں لی جاتی ہیں۔''

ڈاکٹر فیروز عالم نے غیر ملکی زبانوں اور تہذیبوں سے دلچسپ کہانیوں کے انتخاب اور اردو ترجمہ کے ساتھ بے حد دلچسپ کتاب ''افق کے اُس پار'' لکھی ہے یہ کام خود افسانہ لکھنے سے بھی زیادہ محنت طلب کام ہے لیکن انہوں نے قارئین کی دلچسپی کے لیے اس ضمن میں جو محنت کی ہے اس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

شاہد جمیل کا افسانہ ''مہاجر'' دلچسپ اور پُر پیچ ہے۔ عملی زندگی میں ایسا ہونا ممکن نہیں کہ ایک نارمل شخص کسی انجانے گمان یا شک کی وجہ سے اپنا بستا گھر چھوڑ کر اکیلا جنگل میں چلا جائے اور درختوں پر چڑھ کر سونا شروع کر دے۔ جس کہانی پر حقیقت کا گمان ہو اور پھر کچھ مثبت پہلو یا مقصد بھی ہو تو اس کی بات کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ سیمیں کرن کی ''پتھر شہر کی سوئی ہوئی کہانی'' دلچسپ اور اشاروں کنایوں میں اردگرد کے حالات و واقعات کی ایک کافی مبالغہ آمیز تصویر دکھائی دیتی ہے۔

شاعری میں بھی اچھا کلام شامل کیا گیا ہے مثلاً نسیم سحر، آصف ثاقب، ابراہیم عدیل، یوگیندر بہل تشنہ، ایم کے بھان تمنا اور خورشید انور رضوی کا کلام شامل ہے۔ شمارہ کی تیاری اور اسے ایک خوبصورت جریدہ کی شکل دے کر قارئین کو پیش کرنے میں آپ نے جو محنت کی ہے وہ صاف عیاں ہے جس پر آپ دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

پیارے بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

تازہ شمارہ ڈاکٹر شمیم حنفی کا ''قرطاس اعزاز'' لیے ہوئے بھی اپنی جگہ ''چہارسُو'' کی روانیوں کا امین نکلا۔ ڈاکٹر شمیم اپنی بصیرتوں اور بصارتوں کے سبب ہندوستان اور پاکستان میں یکساں مشہور و مقبول ہیں اس لیے ''چہارسُو'' کی تاریخ کا مختصر ترین ''براہِ راست'' بھی اُن کے شایانِ شان رہا۔ مبارک ہو۔ غالب پر ان کی تحریر ''شکست کی آواز'' یقیناً ڈاکٹر صاحب کا خوبصورت خراجِ عقیدت ہے۔ افسانوں میں میری ترجیح ''کیہہ جاناں میں کون۔۔۔'' رہی سو میں نے دلچسپی سے پڑھا جس میں مزاح کی چاشنی لئے آپ کا اپنا اسلوب بول رہا تھا اور خوب بول رہا تھا افسانہ پسند آیا۔ بقایا تین افسانے ''یادوں کی پرچھائیں'' ''حوصلے کی موت'' اور ''نشان'' بھی (مختصر مختصر افسانے) اپنی جگہ خوب تھے۔

اس شمارے میں دیپک کنول نے سنیل دت کو چھیڑا ہے۔ سنیل دت کو پہلی مرتبہ محبوب نے ایک ایسے کردار میں (مدر انڈیا) میں پیش کیا تھا جس کی مثال فلمی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ محبوب فلمی دنیا کے ایک ایسے ہدایت کار تھے جنہوں نے ذروں کو آفتاب بنا دیا۔ بھلا کسے معلوم تھا کہ ایک خوبرو نوجوان میں چھپی ہوئی Angry Young Man کی یہ خوبی اُسے مدر انڈیا کے سبب کہاں سے کہاں پہنچا دے گی ویسے سنیل دت ایک نیک نفیس انسان تھے اور ہندو مسلم یکتائی پر ایمان رکھتے تھے۔

غالب عرفان (کراچی)

چہارسو رقم محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

آپ کی عزت افزائی سے دل احسان مندی کے احساس سے تابندہ رخشندہ ہوا جاتا ہے۔ ''چہارسُو'' کا ہر شمارہ گرانقدر اور قدر انداز ہوتا ہے۔ ہر ''آیا گیا'' مقدور بھر خط اندوز ہوتا ہے۔ ''چہارسُو'' کا پروفیسر شمیم حنفی شمارہ رسالہ کے مقتدر روایات کے عین مطابق ہے۔ پروفیسر صاحب کے ادبی تاثر نے خطے کے چاروں کھونٹ داب رکھے ہیں۔ ان کی شہرت یہاں بوئی کے سے گمنام گوشے تک پہنچی ہوئی ہے میں ان کو پڑھتا رہتا ہوں۔ وہ گاندھی جی کے چیلے بھی ہیں اور نہرو جی کا جام بھی پیے ہوئے ہیں۔ وہ جیسے قائداعظم نے مسلمانوں سے کہا تھا اپنے ملک کے خیر خواہ اور اپنے لیڈروں کے نام لیوا ہیں۔ یہی جذبہ یہی رستہ پاک و ہند کے درمیان اخلاق مندی امکانات پیدا کرے گا۔ ہم قائداعظم کی طرح گاندھی جی (مہاتما) کی بھی عزت کرتے ہیں۔ مہاتما گاندھی بھی عظیم لیڈر تھے۔ پاکستان ایک حقیقت ہے۔ وہ حقیقت جو ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے روپ دھار چکی تھی۔ ماشاءاللہ پروفیسر شمیم حنفی کے ادبی مزاج میں توازن اور اعتدال ہے۔ پروفیسر صاحب تند و تیز محاکموں سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ کیفیات ''عشق بیکراں'' پر نظر ڈالنے سے موصوف کی ادبی کامیابیوں کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے شبانہ روز محنت اور لگن سے یہ معرکے سر کر رکھے ہیں۔

آپ پاکستان اور انڈیا کے اہل قلم کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے درمیان بیگانگی کی لکیر نہیں کھینچتے۔ دیپک کنول نے سنیل دت کے خصوص میں ایک جذباتی مضمون لکھا ہے۔ ''ایک صدی کا قصہ'' کنول کا قلمی اختصاص ہے۔ اس سے پہلے پرچے میں انہوں نے ''نوتن'' سے متعلق جذبات میں ڈوب کر ''اظہاریہ'' لکھا تھا جو متاثر کرنے والا تھا۔ ''رس رابطے'' کا رسیلا پن من بھاؤنا ہے۔ آپا جمیلہ شبنم صاحبہ نے اپنے خط میں میرے ایک شعر کا حوالہ بڑے حوصلہ افزا لہجہ میں دیا ہے۔ آپا صاحبہ کا احترام چہارسو کے قاری دل سے کرتے ہیں۔ ان سے متعلق جب بھی گفتگو ہوئی بڑے احترام سے ہوئی۔ انہوں نے توجہ کی میں ان کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے میری غزل کو عزت دی مہربانی آپ کی۔ غزل کے چوتھے شعر کا مصرع ہے:

پہاڑ ٹوٹ بھی جائیں، حباب مشکل ہے

یہ حباب ہے جناب نہیں۔ میں بطور خاص ذکر خیر کے لیے یوگیندر بہل تشنہ، نوید سروش، ابراہیم عدیل کے خلوص سے متاثر ہوا ہوں۔ چہارسو کا حصہ ''رس رابطے'' محبت آمیز اور دل پرور ہوتا ہے۔ کوئی لڑائی نہیں کوئی جھگڑا نہیں کوئی تضحیک نہیں کوئی اصلاح نہیں۔ وہ نکتے ہیں وہ محاکے ہیں جن سے آدمی خوش ہو جائے چہارسو کے اس شعر سے رخصت۔

یوں تو دیوار ہوتی ہے حائل مگر
جانے کیوں اس نے رستے میں در رکھ دئے
(تصور اقبال)

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

مدیر محترم، سلام مسنون۔

رمضان المبارک کی مقدس، متبرک اور پُر نور ساعتوں کے دوران مئی جون کا شمارہ محترم پروفیسر شمیم حنفی صاحب کے قرطاس اعزاز سے آراستہ و پیراستہ موصول ہوا جو متعلقہ اہم تفصیلات، وقیع براہِ راست، تنقیدی و تخلیقی مضامین دانشوراں اور اُن کی اپنی نگارشات اور تخلیقات پر مشتمل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرطاس اعزاز نے بہت سے تخلیق کاروں کو نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ بیرون ملک بین الاقوامی سطح پر صرف متعارف ہی نہیں کروایا بلکہ یہ اُن کی تشہیر اور ناموری کا بھی بڑا بھرپور باعث بنا ہے جس کا وہ خود بھی بجا طور پر آپ سے اعتراف کرتے رہتے ہیں۔ مگر خوش آئند پہلو یہ بھی ہے کہ تہذیبی و تخلیقی سطح پہ بھی بحیثیت مدیر مسول چہارسو آپ کا حقوق العباد کا گراف بلند سے بلند ہو رہا ہے۔

موجودہ زندگی کے معاشرتی و سماجی رویوں اور بدلتی ہوئی تہذیبی و اخلاقی اقدار کے تناظر میں ''کیہہ جاناں میں کون۔۔۔'' کے واقعات و کردار کی تشکیل و تعمیر کی گئی جبکہ اختتام پر تحریر و تجسس کے کشادہ مارجن نے قاری کے لیے آپشنز کے کئی در وا کر دیے جسے تخلیقی کامیابی گردانا جاسکتا ہے۔

میری غزل کے پانچویں شعر کا پہلا مصرع صحیح ترتیب سے یوں درج ذیل ہے۔

''ذہنی سرور، لطف طبع، آگہی کے رنگ''

''لطفِ طبع''، کو''لطف صبح'' کمپوز کیا گیا ہے۔ نئے تراجم وکتب ادبی کائنات کی پیشرفت ومثبت سوچ سے متعارف کرواتے اور ذہن کے ترفع کا موجب ٹھہرتے ہیں۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

آداب!

جیسے ہی چہارسو کو پڑھنا شروع کیا ساحلِ سمندر پر بیٹھ کر خود کو لفظ لفظ موجوں سے کھیلتے محسوس کیا۔ اک مدت بعد اردو پڑھنا اور اس قدر معیاری تخلیقات سے لطف اندوز ہونا اس روح کے لیے اک نئی زندگی، اِک نئے سفر کا آغاز ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک کرامات ہے۔ جو بھی تحریر پڑھی دھیرے دھیرے اپنے ذہن ودل میں اس طرح تابندگی محسوس کی جیسے محرابوں سے مدھم مدھم روشنی چھن رہی ہو۔ شکست کی آواز، شمیم حنفی صاحب کی یہ تحریر اپنی زبان اور بیاں میں اک طلسم طاری کر گئی۔

''کیہہ جاناں میں کون'' جذباتی اور نفسیاتی سطحوں پر سمندر کی طرح بے کراں اور بے پناہ بھی ہے اور پُر اسرار بھی۔ پروین شیر صاحبہ کے سفرنامے کی آخری قسط نثر میں اک دل نشیں نظم ہے۔ قدرتی خوبصورتی اور زندگی کی سچائیوں سے دھڑکتی، ہانپ ہانپ جاتی۔ ''براہِ راست'' سے لے کر ''رس رابطے'' تک کے اس بلا کے خوبصورت سفر میں اس ذرا سی روشنی کو آپ نے پناہ دی۔ نظم ''کاش'' کی صورت میں۔ اس مبارک لمحے تک پہنچنے کے لیے حوصلہ افزائی کی۔ اس کے لیے بے پناہ دعاؤں کے پھول قبول ہوں۔

روپا صبا (چندی گڑھ)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' میں اب کے جناب ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ جیسے نابغۂ روزگار کا گوشہ خوب ہے۔ ان کی تحریریں خالص علمی ہوتی ہیں۔ ''جدیدیت اور خاموشی کی جمالیات'' بہت فلسفیانہ ہے۔

آپ نے اپنے افسانے MSS کو موضوع بنا کر موجودہ دور کی کڑوی سچائی کو ننگا کیا ہے۔ آج کل موبائل پر بار بار کچھ خواتین کے نمبر پیش کیے جاتے ہیں جو تنہائی دور کرنے کے لیے دعوت دیتے ہیں۔ اب موبائل والے بھی PIMP کا رول ادا کرنے لگے ہیں۔ آپ نے خوب موضوع اٹھایا ہے۔

رؤف خیر (حیدرآباد، دکن)

برادرم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

چہارسو کا تحفہ ملا، بہت خوشی ہوئی۔ دوستوں سے ان کی تخلیقات کے ذریعے ملاقات ہوئی۔ بلراج ساہنی میرا پسندیدہ اداکار اور ایک بہت بڑا دانشور تھا۔ سنیل دت بھی مجھے بہت ہی پسند تھا۔ میرا تعلق دراصل اس نسل سے ہے جو بٹوارے کے بعد پیدا ہوئی اس نسل نے رومانس میں پناہ لی ورنہ ڈیپریشن میں ماری جاتی یا خودکشی کر لیتی۔ محبت بھری فلمیں دیکھ دیکھ کر گیت سن سن کر زندگی میں قدم رکھا۔ میری نسل کو علم ہے کہ یہ ہیروز دلوں پہ راج کیا کرتے ہیروئنیں تو Goddesses تھیں ان کے کیلنڈر بنتے دلوں پہ راج کرتیں۔ ریسٹورنٹ نائیوں کے سیلون اور بیڈروم ان کی تصویروں سے سجے رہتے۔ ہم میں سے ہر کوئی کسی ہیروئن کی محبت میں گرفتار ہوا کرتا۔ اور کسی ہیرو کی شخصیت اپنے اوپر طاری کرنے میں لگا رہتا۔ میں نے جان وین بننے کی کوشش کی۔ اور اسی کی وفات حسرت آیات پر اس کی فاتحہ بھی لی۔ کشور کمار کی فاتحہ بھی لی کیونکہ دوستوں کو علم تھا کہ میں اس کا سخت فین ہوں۔ نرگس سے بھی محبت رہی۔ مدھوبالا کو لپٹن چائے والوں نے سبی میں دکھایا تھا۔ میں ان دنوں سنّی اسکول میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا۔ کوئٹہ کے علاوہ کہیں بھی سینما گھر نہ تھے نہ ہی اب ہیں۔ ایک کھلے میدان میں پردہ لگا کر مدھوبالا کے گیت دکھائے گئے اور لپٹن چائے پینے کی تلقین کی گئی۔

ان کرداروں سے ہمیں جو محبت رہی اس کا اندازہ بھی ہم ہی کر سکتے ہیں۔ دیپک کنول کا شکر یہ کہ وہ ہمارے بے حد پیارے فلمی ستاروں سے ملواتے ہیں۔ ان کی تحریر میں اس قدر شگفتگی اور روانی ہوا کرتی ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دوست مزے سے گفتگو کیے جا رہا ہے۔ داستان گوئی کا دلربا انداز ہے ان کی تحریر میں۔ میری کتاب گوانکو تیسری بار شائع ہوئی ہے۔ دراصل تیزی سے پھیلتا کمرشلزم روایات، پشتون ولی اور قدروں کو تباہ کیے جا رہا ہے۔ یورپ نے یہ فاصلہ اڑھائی سو برس میں طے کیا جبکہ ہم نے تیس برے میں یہ چھلانگ لگائی ہے۔ مگر ہمارے ہاں فیوڈل ازم اور کام کیے بغیر عیش کرنے والوں کی فوج ظفر موج بھی ہے۔ گوانکو دراصل بلوچستان کے دیومالائی کرداروں کو بذریعہ فکشن زندہ رکھنے کی ایک کوشش ہے۔

آغا گل (کوئٹہ)

بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ (مئی جون ۲۰۱۷ء) حسبِ روایت وقت پر ادبی وقار کے ساتھ ملا۔ رمضان المبارک، شدید گرمی، شدید لوڈشیڈنگ اور روزے کی حالت میں رسالے کے مطالعے سے سکون ملا۔ موجودہ پرچے میں پروفیسر شمیم حنفی کو ''قرطاسِ اعزاز'' پیش کیا ہے۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے اہم سوالات کے جوابات دینے میں پروفیسر صاحب نے اجنبیت اور لاتعلقی سا اظہار کیا ہے انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ کسی علمی وادبی سوال کا تفصیلی جواب نہیں دیا۔ اُن کے طرزِ عمل سے مایوسی ہوئی۔

شمیم حنفی صاحب کا مضمون ''شکست کی آواز'' اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے دلچسپ اور منفرد ہے انہوں نے انگریزوں کا ہندوستان پر قبضہ جنگ آزادی کے بعد کے سیاسی وسماجی حالات اور تہذیبی اقدار سے غالب کی شخصیت، ذات اور کلام کا زبردست تجزیہ کیا ہے کیا زندہ جملہ لکھا ہے:

''غالب کے اشعار میں ذات کی شکست کا احساس ضرور ملتا ہے لیکن شخصیت کے زوال کا شائبہ تک نہیں۔'' (ص۔۱۲)

سرورالہدیٰ نے پروفیسر صاحب کے تنقیدی نظریات اوراسلوب کی بات کی ہے۔ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے اپنی یادوں سے پروفیسر صاحب کی شخصیت کی خوبصورت جھلکیاں دکھائی ہیں۔فاروق ارگلی نے اُن کی کارگزاری اور کامیابیوں کا ذکر کیا ہے۔خالد جاوید نے اپنی تحریر''اردو تنقید کا آؤٹ سائیڈر''میں شمیم حنفی کو اردو کا سب سے مختلف اورانہیں وجودِطرزِ احساسات اور کیفیات رکھنے والا نقاد قرار دیا ہے۔مضمون میں مصنف نے جوسوال اٹھائے ہیں اس کے خود ہی جواب بھی دیئے ہیں۔مثالیں اچھی دی ہیں۔افسانہ''عالیہ باجی''اور ڈراما''چوراہا''بار بار پڑھنے کے لائق ہیں۔

''کیہہ جاناں میں کون۔۔۔'' کی طرح گلزار جاوید صاحب کے دوچار''چہارسُو''میں شائع ہونے والے افسانوں میں مشرقی اقدار اور رشتوں کے مثبت رویے سامنے آئے ہیں یہ افسانہ بھی اُسی خوبصورت رنگ میں ہے مگراس کی ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ بڑوں کے ساتھ ساتھ''چھوٹوں'' کے رشتے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔شاہد جمیل کا افسانہ''مہاجر''نیم علامتی ہے بہت کچھ سمیٹا ہے مگر خود کلامی کو زیادہ وقت دیا ہے۔محترمہ عذرا اصغر اور شیما ربانی کے افسانے پیش کش کے لحاظ سے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

''ایک صدی کا قصہ''میں دیپک کنول نے سنیل دت کی کہانی سنائی ہے۔غالب عرفان صاحب نے اُن کی زبان پر جواعتراضات کیے ہیں وہ بجا ہیں مگر اُن کی تحریر کی دل کشی کی داد دینی پڑتی ہے۔بقول شخصے''چہارسُو'' کی ہیروئن پروین شیر کا سفرنامہ اپنی تمام تر ادبی وقار،شاعری اور مصوری سے مزّین ہے بقول عطاالرحمان قاضی:

''واحد متکلم کے حصار سے نکل جانے کا تجربہ بھی اچھا لگا''

محترمہ سلمیٰ اعوان نے حوصلہ منداور انقلابی سوچ رکھنے والی''ثمر یز بک'' کی منفرد،دردناک اور جدوجہد سے پُر داستان اپنے خاص انداز سے سنائی ہے۔موضوع اور تحریر کی روانی اور بے تکلفی کمال کی ہے۔

آصف ثاقب،نسیم سحر،اشرف جاوید،ڈاکٹر انیس الرحمان،عارف شفیق اور انجم جاوید کی غزلیں فنی پختگی کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور مسائل کی ترجمان ہیں۔عطاالرحمان قاضی،حسنین اقبال،ڈاکٹر نبیل احمد نبیل اور تصور اقبال کا کلام تازگی کا احساس لیے ہوئے ہے۔رؤف خیر صاحب نے ندا فاضلی کی پہلی برسی پر خوبصورت نظم زبردست عقیدت کا اظہار کیا ہے۔حسن منظر اور ڈاکٹر جواز جعفری کی نظمیں سنجیدگی سے دعوتِ فکر دے رہی ہیں۔

''چہارسُو'' کے پس سرورق پر پروین شیر کی کتاب''بے کرانیاں'' (جس سے ہم محروم رہیں گے) اور ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کے ترجمہ کردہ افسانوں کی کتاب''اُفق کے اُس پار'' کا عکس ہے۔کتاب میں شامل نومغربی کہانیاں ''چہارسُو'' کی زینت بن چکی ہیں۔کراچی میں مئی کو کتاب کی تقریبِ رونمائی اخلاق احمد صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی۔رضوان صدیقی،ڈاکٹر جاوید منظر، ڈاکٹر نسرین پرویز اور ڈاکٹر شیر شاہ سید نے گفتگو کی۔ڈاکٹر فیروز عالم نے اپنے خطاب میں گلزار جاوید کا اور''چہارسُو'' کا ذکر بڑی محبت اور فخر سے کیا کہ پہلے میری خودنوشت قسط وار شائع کی اور اب میری ترجمہ کردہ کہانی کو جگہ دیتے ہیں۔

نوید سروش (میرپورخاص)

برادرم گل وگلزار،سلام مسنون۔

اس مرتبہ قرطاسِ اعزاز ایک اور بڑی اہم ادبی شخصیت جناب شمیم حنفی کے نام تھا،ان کے بارے میں دوسروں کے مضامین میں اچھی معلومات تھیں،البتہ حیرت انگیز طور پر ان سے''براہِ راست''انٹرویو میں آپ کے بہت سے اچھے اور گہرے سوالات کے جواب میں بھی انہوں نے اپنی ذات کا دروازہ پوری طرح نہیں کھولا اور انٹرویو پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوتا رہا۔ان کا یہ جواب ایک سے زیادہ جگہ دیکھا کہ''اس کے لیے آپ کو سوانحی اعشاریہ سے رجوع کرنا ہوگا''۔کیا ہی اچھا ہوتا کہ ان سوالات کے تفصیلی جواب خود ان کے انٹرویو میں موجود ہوتے۔پھر شاید کمپوزنگ کی غلطی سے جہاں بھی لفظ''اشاریہ''لکھنا چاہیے تھا،''اعشاریہ''لکھا گیا ہے۔ان کا افسانہ''عالیہ باجی''اچھا تھا لیکن ڈرامہ میرے ناچیز خیال میں کچھ نامکمل سا لگا یا پھر کچھ طوالت کی وجہ سے مجھ پر ہی اس کا ابلاغ نہیں ہوسکا ہوگا کہ ڈرامہ پڑھنے سے زیادہ سٹیج پر دیکھنے کی چیز ہے۔یہاں مجھے دو مرتبہ پڑھنے کے بعد بھی ڈرامے کے انجام سے آگاہی نہیں ہوسکی۔

منیرہ شمیم صاحبہ کی''یادوں کی پرچھائیں''کے عنوان سے چھپی ہوئی تحریر دلچسپ تھی۔آپ کے افسانے پر کیا بات کروں کہ کسی رسالے کے مدیر کی تحریر کی تعریف کے معنی کچھ اور سمجھے جاتے ہیں۔ویسے آپ جانتے ہی ہیں کہ مَیں آپ کا اور آپ کی تحریروں کا بھی فَین ہوں۔اب اِس''فین''یعنی پنکھے کی ہَوا آپ تک نہ پہنچے تو اِس میں میری قوتِ ابلاغ کی کمزوری یا کسی نامعلوم لوڈشیڈنگ کو ہی موردِالزام ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

نسیم سحر (راولپنڈی)

برادرم گلزار جاوید،آداب و نیاز۔

امریکہ سے واپس آنے پر سفر کی تکان اور جیٹ لاک کے اثرات ابھی باقی ہیں۔اب کی بار پرانے احباب میں سے کسی سے ملاقات نہیں ہوسکی لیکن ایک نئی شناسائی نے بھرپور تلافی کردی۔معروف شاعرہ،مصورہ اور گلوکارہ پروین شیر صاحبہ سے غائبانہ تعارف تو تھا مگر ذاتی طور پر ملنے کے دومواقع اب حاصل ہوئے تو یہ معلوم ہوا کہ اس قدر Telented ہونے کے باوجود وہ نہایت حلیم اور منکسرالمز اج بھی ہیں۔ایک بار جرسی سٹی میں اُن کے ہاں جانا ہوا تو دوسری بار وہ ازراہِ کرم ہمارے ہاں تشریف لائیں۔اب کی بار کے میرے قیامِ امریکہ کا سب سے بڑا حاصل یہی ہے۔ڈاکٹر رینو بہل کی وساطت سے تازہ چہارسُو موصول ہوگیا ہے۔آرام سے دیکھوں گا اور اپنی رائے سے مطلع کروں گا۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ،بھارت)

...... بیدی میرا ہمدم میرا دوست

اشکؔ کے خاکے''منٹو میرا دشمن'' سے ہندی میں جس قسم کے خاکے کی بنیاد پڑی تھی اس کی آخری کڑی ''بیدی میرا دوست'' کی شکل میں ہندی ہی میں ۱۹۸۶ء میں منظرِعام پر آئی۔یہ بھی''منٹو میرا دشمن'' کی طرح ایک طویل خاکہ ہے۔

''بیدی میرا ہمدم میرا دوست'' کی ہندی میں اشاعت ۱۹۸۶ء میں ہوئی تھی لیکن اردو کے ادبی حلقوں میں اس کتاب کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ اشکؔ کی یہ تحریر زیادہ سے زیادہ اردو دوستوں تک پہنچے اس کے لیے اس کتاب کو پہلی بار نہ صرف اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے بلکہ اس کی پہلی اشاعت مارچ ۲۰۱۳ء میں نثری دائرہ کراچی(پاکستان) کی جانب سے ہوئی اور اب مغربی بنگال اردو اکادمی کی اردو نوازی سے ہندوستان میں اس کی اشاعت ہو رہی ہے۔مجھے امید ہے کہ اوپندر ناتھ اشکؔ کی اس کتاب سے نہ صرف اشکؔ اور بیدی کے تعلقات کو بلکہ دونوں کی نفسیات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

......(ڈاکٹر)مشتاق اعظمی

قیمت:122 روپے، دستیابی:مغربی بنگال اردو اکادمی،کول کتہ۔

...... رشحاتِ نسیمِ سحر

نسیمِ سحر نے اپنے مضامین میں کسی قسم کے فلسفے یا مشکل پسندی کو نزدیک نہیں آنے دیا بلکہ انہوں نے سادہ انداز میں اپنا مدعا بیان کر دیا ہے جو اس دور کا تقاضہ بھی ہے۔مضامین میں ادب پارے کو تنقید و تحقیق دونوں حوالوں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔آنے والے وقت میں ان مضامین کی اہمیت و افادیت محقق اور نقاد صحیح طریقے سے کر سکیں گے۔جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے تو موصوف نے اس صنف کے ساتھ انصاف برتا ہے جو کہ ان کی ہر تحریر میں موجود ہے۔جس کی وجہ میرے خیال میں اُن کی شاعرانہ صلاحیتیں ہیں۔نسیمِ سحر کا شعری سفر نصف صدی سے تجاوز کر چکا ہے۔ملکی و بین الاقوامی سطح پر اپنی شعری صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔اس لیے کسی شعر پر رائے دینا اُن سے بہتر کون جا سکتا ہے۔چند مضامین جو خصوصیت کے حامل ہیں وہ مضطرؔ اکبر آبادی،سعودؔ عثمانی،یونس اعجاز،گلزارؔ بخاری،غازی علم الدین اور افضل آرشؔ کی ادبی خدمات کے حوالے سے ہیں۔

......قمرؔ الطاف

اشاعت:۲۰۱۷ء، قیمت:۳۵۰ روپے، دستیابی: دنیائے اردو پبلی کیشنز،اسلام آباد۔

...... دامنِ صد چاک

اکرم کنجاہی حالیہ دور کے شاعر ہیں،اس لیے وہ ہمہ اقسام کے خطرات میں گھرے ہوئے انسان نظر آتے ہیں۔لیکن اُن کا عقبی دیار چونکہ کنجاہ ہے،اس لیے اُن کی شاعری میں ایک مخصوص نوع کی رجائیت بھی نظر آتی ہے۔یہ رجائیت ترقی پسند نوع کی اشتہاری رجائیت سے بالکل مختلف ہے۔یہ اُن کے تیقن اور اعتقادات کا نتیجہ ہے۔چنانچہ انہیں پوری بستی زلزلے میں منہدم نظر آتی ہے تو وہ صرف ایک مکان کو سلامت دیکھ کر زمان و مکان کے تسلسل کا یقین دلاتے ہیں اور جب کشتی بھنور میں بھی ہو تو ہم سفروں کو اپنی ذات کا بادبان پیش کرتے ہیں۔تاہم انہیں ملال اُس وقت ہوتا ہے جب وہ کنجاہ جیسے ''فرشتہ سیرت'' دیہاتوں کو''شیطان خصلت'' شہروں کی طرف منتقل ہوتا دیکھتے ہیں۔اُس وقت اُن کی پلکوں پر اس قسم کے مصرعے آنسوؤں کی طرح لرزاں نظر آتے ہیں:

''مردم خیز جو خطّے تھے وہ سارے بنجر دیکھے''

......انور سدید

اشاعت:۲۰۱۷ء، قیمت:۴۰۰، دستیابی: رنگِ ادب،کراچی۔